قدیم وجدید ادبیات
(تحقیقی وتنقیدی مضامین)
غلام نبی کمار
میرظہیر عباس روستمانی

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081

-----۞۞۞۞۞۞۞۞۞-----

# قدیم و جدید ادبیات

(تحقیقی و تنقیدی مضامین)

# قدیم وجدید ادبیات

(تحقیقی وتنقیدی مضامین)

غلام نبی کمار



ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

**QADEEM-O-JADEED ADABIYAAT**
**(Teheeqi-wa-Tanqeedi Mazameen)**
**by : GH NABI KUMAR**
**Mobile:07053562468**
**Email : kumarnabi.gnk@gmail.com**

**ISBN 978-93-88736-56-5** **Year of 1st Edition 2019**

**₹ 450/-**

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | قدیم وجدید ادبیات (تحقیقی وتنقیدی مضامین) |
| مصنف | : | غلام نبی کمار |
| سن اشاعت | : | ۲۰۱۹ء |
| قیمت | : | ۲۲۲ روپے |
| مطبع | : | روشان پرنٹرس، دہلی۔٦ |

## ملنے کے پتے

☆ امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔M.08401010786
☆ حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔Ph.040-66806285
☆ ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد۔Ph.040-24411637
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی۔Ph.022-23774857
☆ بک امپوریم، پٹنہ۔M.09304888739
☆ دانش محل، لکھنؤ۔Ph.0522-2626724
☆ مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد۔M.09325203227
☆ کشمیر بک ڈپو، سری نگر۔M.09419761773
☆ گلوبل بکس، سری نگر۔M.09070340905
☆ قاسمی کتب خانہ، جموں۔M.09797352280
☆ تاج بک ڈپو، رانچی۔Mob. 9304514659
☆ ہمالیہ بک ورلڈ، حیدرآباد۔Ph.040-66822350
☆ انجمن ترقی اُردو، حیدرآباد۔M.09247841254
☆ دکن ٹریڈرس، حیدرآباد۔Ph.040-24521777
☆ کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئی۔Ph.09869321477
☆ عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ۔M.09433050634
☆ راعی بک ڈپو، الہ آباد۔M.09889742811
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔
☆ مکتبہ علم وادب، سری نگر۔M.094419407522
☆ وطن پبلیکیشنز، سری نگر۔M.09419003490
☆ نعیم بک سیلرز، مئوناتھ بھنجن۔M.09450755820

**پاکستان میں ملنے کا پتہ :** ملک بک ڈپو، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان) Ph. 0092-42-37247480 37231388

*Published by*
**EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE**
**3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)**
**Ph : 23216162, 23214465, 45678286, Fax : 0091-11-23211540**
**E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com**
**website: www.ephbooks.com**
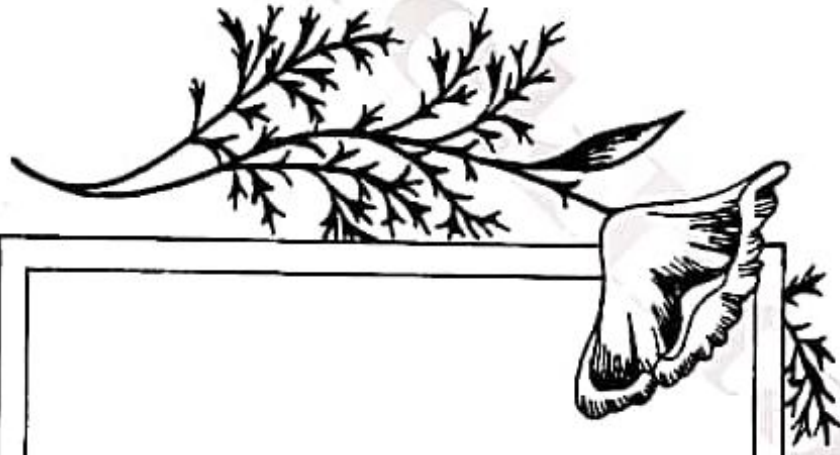
نورشاہ کے نام

جن سے جموں وکشمیر میں اردو فکشن کا ستارہ روشن ہے

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے نام

جو اردو زبان کی دو سو کتابوں کے خالق

اور اس کے سچے خادم ہیں

حافظ کرناٹکی کے نام

جو عہدِ حاضر میں اردو رباعی کے تاجدار ہیں

# مشمولات

# پیش لفظ

میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں کبھی اردو زبان وادب پر کچھ لکھنے کی جسارت کرسکوں گا۔ اگرچہ آٹھویں جماعت تک ہمارے یہاں انگریزی کے علاوہ تمام مضامین کی تعلیم اردو میں ہی دی جاتی تھی۔ پھر جب نویں جماعت میں داخلہ لیا تو یکا یک حکومت کا فیصلہ آیا کہ اب تمام مضامین انگریزی زبان میں پڑھائیں جائیں گے۔ اب اردو کو لازمی مضمون کے طور پر دسویں تک پڑھنا تھا پھر اس کے بعد اختیاری مضمون کی حیثیت سے۔ اردو کے ساتھ میری رغبت بچپن ہی سے رہی ہے جس کا میں آج بھی بہت فخر کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں۔ پہلے ابتدائی تعلیم پھر انٹرمیڈیٹ اور اس کے بعد بی۔اے میں بھی اردو زبان کے مضمون کو لینا میری زندگی کا مقصد ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اردو زبان سے لگاؤ اس قدر بڑھ گیا کہ اسی میں ایم۔اے اور پھر ایم۔فل کی ڈگریاں پائیں اور آج پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے حصول میں کوشاں ہوں۔ لیکن اس کے باوجود بھی دل و دماغ میں لکھنے کی تمنا نہیں جاگی تھی۔ آہستہ آہستہ تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کتابوں سے میرا تعلق کچھ اس طرح اُستوار ہو گیا کہ شاید اب زندگی میں کتابوں سے الگ ہونے کا کبھی خیال بھی ذہن میں نہیں آئے گا۔ اس پر طرہ یہ کہ کچھ اساتذہ صاحبان کی رہنمائی ہی کا نتیجہ ہے جو بعض اہم کتب کے مطالعے کا ہی شرف حاصل ہوا۔ دورانِ مطالعہ بعض ادیبوں، محققوں، ناقدوں اور صحافیوں کی ادبی صلاحیت کا اندازہ بھی ہوا۔ غرض کہ مطالعہ ہی میرے لکھنے کا محرک رہا ہے اور کہنے کا مقصد بھی صرف یہی ہے کہ اردو زبان سے اپنے تعلق کو مضبوط کرتے ہوئے اور اس زبان کے اعتراف میں وجود میں آئے کتب کے

شوق ہی نے میرے قلب و ذہن کو جنبش عطا کی۔ میری ادبی زندگی کا آغاز 2014 میں ہوا جب میرا پہلا مضمون رسالہ سہ ماہی ''تحقیق'' جمشید پور کے اکتوبر تا دسمبر شمارے میں بعنوان ''اردو کے بعض اہم اشاریے'' شائع ہوا۔ اس کے بعد سے میرے کئی تنقیدی و تحقیقی مضامین اور تبصرے تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن میں کچھ مضامین کا انتخاب کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت اور شادمانی محسوس ہو رہی ہے۔

''قدیم و جدید ادبیات'' میرے تحقیقی و تنقیدی مضامین کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں مختلف موضوعات کے تحت 20 مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ جو نہ کسی کی ستائش میں لکھے گئے ہیں اور نہ ہی کسی کی فرمائش پر، بلکہ ان موضوعات کے ساتھ میری ذاتی انسیت رہی ہے۔ یہ مضامین میری ادنیٰ کوشش ہے اس لیے ان میں کیساں بھی رہی ہوں گی۔ میں انہی سیمیناروں میں شریک ہوتا ہوں جن میں میری دلچسپی کے موضوعات رہتے ہیں یا جن پر میں بہتر لکھ سکتا ہوں۔ اس کتاب میں بھی چند مضامین ایسے ہیں جو مختلف سیمیناروں میں پڑھنے کی غرض و غایت سے لکھے گئے ہیں۔ جن میں ''امیر خسرو کی غزلیہ شاعری''، ''رباعیاتِ حالی میں قومی اصلاح''، ''داغ کی مثنوی نگاری: فریادِ داغ کی روشنی میں'' اور ''1960 کے بعد اردو نظم میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب'' قابل ذکر ہیں۔ باقی موضوعات یا شخصیات پر مضامین میری دلچسپی کے تھے جنھوں نے مجھے خامہ فرسائی کے لیے مجبور کر دیا۔

اردو ادب میں بہت سارے ادیب ایسے گزرے ہیں جن کی تحریریں بعض اسباب کی بنیاد پر صرف رسائل و جرائد ہی تک محدود رہیں جن کی اشاعت کبھی کتابی صورت میں بھی ممکن نہ ہو سکی۔ یہاں پر میری مراد صرف انہی افراد سے ہے جن میں علمی و ادبی صلاحیت تھی، جن میں سماجی و معاشرتی شعور تھا، جن میں ادبی تحریروں کی پرکھ اور اس کی پہچان تھی، جن میں علم و ادب کا مادہ تھا، جو حقیقت شناس اور ادب پرست تھے نیز جن کی تحریروں میں علمی، ادبی اور فکری بصیرت تھی لیکن افسوس کہ ان کی تحریریں رسائل و جرائد کے اوراق میں ہی دب کر رہ گئیں اور جنھیں کبھی منظرِ عام پر لانے کی جستجو تک نہیں کی گئی۔ اس صورتِ حال سے بہت سارے ادیب آج بھی جوجھ رہے ہیں۔ اگر اردو زبان و ادب میں کوئی تحریر اضافے کا باعث بنتی ہو

اور اس سے مستقبل میں نوجوان نسل کی رہنمائی ہوتی ہو تو اس کے منصۂ شہود پر آنے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مگر اس کے بعد بھی تحریر کے معیار و وقار کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تحریر کمتر ہے یا بالاتر اس کا فیصلہ ادب کے باذوق قارئین ہی کرتے ہیں۔

اردو زبان کے بہت سے ادیب اور شاعر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو ادب کی آبیاری میں صرف کردی۔ اردو کی بقا اور ترقی کے لیے ان سے جو کچھ بن سکتا تھا انھوں نے کیا۔ ادب بھی مسلسل تخلیق کرتے رہے لیکن اردو دنیا میں ان کی خدمات کا کبھی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اگر ہمیں اردو زبان کے ساتھ ایمانداری برتنی ہے تو ہر قدم پر غیر جانبداری سے کام لینا ہوگا۔ ہم ذاتی رنجش اور بغض وعناد کو بنیاد بنا کر اردو زبان کی بحالی اور ترقی میں کانٹے نہیں بو سکتے۔ جن ادیبوں پر ابھی تک تحقیق نہیں کی گئی ہے ان پر تحقیق کرانے کی ضرورت ہے، جہاں مضامین لکھنے کی ضرورت محسوس ہو تو بے مبالغہ لکھیں جائیں یا جو تخلیق کار اپنی تخلیقی کاوشات کو مالی پریشانیوں کے سبب شائع نہیں کر پاتے ہیں ان کی بروقت مالی معاونت کرنا ہمارا اخلاقی فرض بنتا ہے۔ اردو زبان وادب میں بے شمار مواد ایسا ہے جو وقت کے بے رحم حالات کی نذر ہو گیا ہے اس کی بازیافت کا سبب تلاش کیا جانا چاہیے۔ یہی سب صورتیں اردو کی فروغ کا ضامن بن سکتی ہیں۔ ادبی صحافت کو اردو زبان کے فروغ کا اہم ذریعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ نام نہاد صحافی اردو زبان کے فروغ میں روڑے اٹکائے ہوئے ہیں۔ نیز انھیں معیاری ادب کی پہچان ہی نہیں۔ اس کے علاوہ کچھ بے غیرت اور نام و نمود کے متلاشی صحافی تعلقات کی بنیاد پر بھی تحریروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خود انھیں ادب کے صحیح اور غلط کی پہچان ہی نہیں ہوتی مگر دوسروں کو معیاری ادب کا پاٹھ پڑھاتے رہتے ہیں۔ ادیب ہو یا صحافی یا ایک قاری ہو، ادب کے میدان میں ہو رہی سرگرمیوں کے تئیں اس کو وسیع النظر ہونا چاہیے۔ ان سب باتوں کا میرے مضامین سے تعلق ہے اور کچھ میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے جو گذشتہ برسوں میں مجھے حاصل ہوا۔

''قدیم و جدید ادبیات'' میں قارئین کو متفرق مضامین پڑھنے کو ملیں گے۔ اس میں

غزل، نظم، افسانہ، مثنوی، تحقیق، رباعی، ادبی صحافت اور شخصیات پر مضامین قلم کیے گئے ہیں۔ جن شخصیات کے فن پر بات ہوئی ہے وہ سب اردو زبان وادب کی سربر آوردہ شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ میں نے ایسے موضوعات کو ترجیح نہیں دی ہے جن پر بہت خامہ فرسائی ہوئی ہو۔ بالکل منفرد موضوعات ہیں اور جن سے قاری مختلف قسم کے نظریات سے آشنا ہوں گے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون ''امیر خسرو کی غزلیہ شاعری'' پر تحریر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون بہت جستجو کے بعد لکھا گیا ہے جس کے لیے کچھ خصوصی شماروں کا مطالعہ اور کچھ فارسی غزلیات کے اردو ترجموں سے استفادہ کیا گیا ہے جن سے امیر خسرو کی غزلیہ شاعری کی مختلف جہتوں کو روشن کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ راقم نے پونے کے ایک سیمینار میں ''رباعیاتِ حالی میں قومی اصلاح'' کے عنوان سے مضمون پڑھا تھا۔ حالی کی رباعیات میں قومی اصلاح کے عنوان سے ابھی تک میری نظر سے کوئی مضمون نہیں گزرا ہے۔ اس وجہ سے یہ مضمون بہت اہم ہے۔ اردو اکادمی، نئی دہلی نے نئے پرانے چراغ کے تحت ایک سیمینار ''غالب، ذوق اور داغ'' پر منعقد کیا تھا جس کے لیے راقم نے داغ کی اکلوتی مثنوی ''فریادِ داغ'' پر مقالہ پڑھا۔ اس سیمینار میں داغ کی مثنوی پر دیگر مقالہ نگاروں نے بھی مضامین پڑھے تھے۔ میرا مضمون اب تک داغ کی مثنوی پر لکھے گئے مضامین سے کس قدر مختلف ہے یہ بھی قارئین ہی پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اردو شاعری میں مومن ایک معتبر نام ہے۔ مومن غالب کے ہم عصر تھے۔ ان کی شاعری پر ابتدا سے اب تک جن ناقدین اور محققین نے تحقیقی کام سرانجام دیا ہے۔ ان سب کی کتب کا راقم نے کما حقہ اپنے مضمون میں جائزہ لیا ہے۔

بلونت سنگھ بیسویں صدی کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ اردو کے تمام بڑے فکشن نگار پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت اور قرۃ العین حیدر وغیرہ ان کے معاصرین رہے ہیں۔ بلونت سنگھ کی فکشن نگاری کا ان کے معاصرین کے بہ نسبت بہت کم اعتراف کیا گیا اور ابھی تک ان پر بہت کم تحقیقی کام ہوا ہے۔ گوپی چند نارنگ، ممتاز آرا، ڈاکٹر نبیل احمد نبیل اور جمیل اختر اس میدان میں نبرد آزما تو ہوئے لیکن پھر بھی اس حوالے سے آج بھی بہت سی چیزیں تشنۂ لب ہی ہیں۔ البتہ ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ بلونت سنگھ کی فکشن نگاری پر

دہلی یونی ورسٹی میں فی الوقت دواسکالر پی۔ایچ۔ڈی کر رہے ہیں۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور میں بلونت سنگھ کی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف کیا جانے لگا ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی دہلی یونی ورسٹی میں خواجہ احمد فاروقی کے زمانے میں استاد رہے ہیں۔ جو دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں کئی بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ان کا تحقیقی و تنقیدی کام بھی قابل ستائش ہے۔اپنی زندگی میں انھوں نے 36 سے زائد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ظہیر احمد صدیقی کی شخصیت اور فن پر آج تک ان کے کسی جانشین نے قلم نہیں اٹھایا۔یہی چیز اس موضوع کے ساتھ میری دلچسپی کا محرک بنی ہے۔مقالات ڈار پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کی تحقیقی نوعیت کی ایک بہترین کتاب ہے۔جس میں بہت سی تحقیقی کتابوں اور مضامین پر بحث و مباحثہ کیا گیا ہے۔راقم کے مضمون سے مقالات ڈار میں شامل تمام مضامین کی جہتیں روشن ہوئی ہیں۔شوکت پردیسی بیسویں صدی کے ایک گمنام شاعر گزرے ہیں جو اپنی زندگی میں کوئی کتاب شائع کرنے سے قاصر رہے۔ان کی گمنامی کی وجہ کلام کا کتابی صورت میں شائع نہ ہونا تھا۔ورنہ ان کا کلام بہت اعلیٰ اور معیاری ہے۔شوکت پردیسی کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نے والد کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ شعری و نثری کلام کو شائع کیا۔ان سب خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے شوکت پردیسی کی شخصیت اور شاعری پر مضمون تحریر کیا گیا ہے۔''زبیر رضوی کی ادبی خدمات'' زبیر رضوی کے انتقال کے فوراً بعد لکھا گیا ہے جو سہ ماہی ''فکر و تحریر'' کلکتہ میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں زبیر رضوی کی ادبی خدمات کا جائزہ لے کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔حال ہی میں کشمیر کے نامور فکشن رائٹر نور شاہ پر محمد اقبال لون کی کتاب ''نور شاہ: فکر اور فکشن'' شائع ہوئی جس پر راقم نے ایک تجزیاتی مضمون تحریر کیا ہے جس کو قارئین یقیناً پسند فرمائیں گے۔جون 2016 میں کشمیر میں منعقدہ ایک سیمینار بعنوان ''اردو ادب اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب'' میں راقم نے ''1960 کے بعد اردو نظم میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا جس کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' کا 2017 میں ایک خصوصی شمارہ ''اکیسویں صدی میں اردو غزل نمبر'' شائع کیا گیا۔اس شمارے میں راقم کا مضمون ''دبستانِ دہلی کے اہم غزل گو شعرا'' شائع ہوا۔جس میں دبستان دہلی کے

صرف اہم غزل گو شعرا کو ہی جگہ دی گئی ہے۔

اس کتاب میں ''جموں و کشمیر کی معاصر اردو شاعری اور چند اہم غزل گو شعرا'' اور ''کتاب نما اور بعض اہم خصوصی شمارے'' جیسے مضامین بھی شامل ہیں۔اس کے علاوہ ''ذہن جدید اور زبیر رضوی'' کے عنوان سے بھی ایک مضمون ہے۔''ذہن جدید'' ایک بین الاقوامی رسالہ تھا جو زبیر رضوی کی ادارت میں 26 برسوں تک مسلسل نکلتا رہا۔زبیر رضوی کے انتقال کے بعد یہ رسالہ موقوف ہو گیا۔راقم نے اپنے مضمون میں ''ذہن جدید'' کی خدمات کا مکمل تذکرہ پیش کیا ہے۔حقانی القاسمی اردو تنقید اور ادبی صحافت کا ایک اہم نام ہے۔ان دونوں میں ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔2016 میں انھوں نے ایک یک موضوعی مجلہ سہ ماہی ''اندازِ بیان'' جاری کیا۔جس کا پہلا شمارہ ''خواتین کے خودنوشتوں کے تجزیے پر محیط'' تھا۔راقم نے اپنے مضمون میں اس خصوصی شمارے کا ایمانداری کے ساتھ تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔

یہ سب میری طالب علمی کے زمانے کی کاوشیں ہیں۔جس میں حتی الامکان محنت، ایمانداری اور بے باکی کو بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی ہے۔میں اپنے استاد پروفیسر ارتضی کریم صاحب اور ڈاکٹر مشتاق احمد قادری صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں تو بڑی حق ناشناسی ہو گی۔جنھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی۔میں عاصم اسعدی صاحب اور بشیر چراغ صاحب کا بھی مقروض ہوں جنھوں نے اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں میری معاونت کی۔میں اپنی والدہ محترمہ کے علاوہ اپنے برادران محمد اقبال کمار اور منظور احمد کمار کا بھی انتہائی شکرگزار ہوں جنھوں نے مجھے ہر قسم کی آسائش مہیا کی۔

میں پُر امید ہوں کہ قارئین حضرات مجھ ناچیز کی اس ادنیٰ سی کوشش کی سراہنا کریں گے اور اپنی زریں آرا سے نوازیں گے۔

غلام نبی کمار　　5/فروری 2019

چرارشریف (جموں وکشمیر)

☆☆☆

# مضامین

# امیر خسرو کی غزلیہ شاعری

امیر خسرو ایک امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد امیر سیف الدین محمود ترکستان میں لاچین قبیلے کی ایک ''ہزراہ'' شاخ کے پناہ گزیں سردار تھے اور ترکستان میں شہر کش کے رہنے والے تھے۔ جب منگول فوج نے چنگیز خاں کی قیادت میں ترمذ اور بخارا میں قتل و غارت گری کا سماں پیدا کر دیا تو امیر سیف الدین نے دل برداشتہ ہو کر شمس الدین التمش کے دورِ حکومت میں ہندوستان ہجرت کرنے کا عزم کیا۔ سیف الدین محمود ایک جری سپہ گر تھے۔ چند سال معمولی عہدوں پر فائز رہنے کے بعد انھیں فوجی سردار بنا دیا گیا اور متھرا سے ایٹہ جانے والی شاہراہ پر گنگا کے کنارے پٹیالی قصبے (عرف مومن پور) میں انھیں چھوٹی سی جاگیر دے دی گئی جس سے ان کی معاشی حالت بہتر ہو گئی۔ سیف الدین لاچین کی شادی ایک سیاہ فام ہندوستانی امیر عماد الملک راوت کی بیٹی دولت ناز سے ہوئی۔ وہ خالص ہندوستانی نسل کی تھیں جو شوہر کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی اکثر پٹیالی میں رہی۔ ان کے چار بچے ہوئے، تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ یمین الدین خسرو اُن میں منجھلے تھے جو 1253 میں موضع پٹیالی ضلع ایٹہ میں ہی پیدا ہوئے۔ نام خسرو، لقب یمین الدین اور کنیت ابوالحسن۔ یہی ابوالحسن یمین الدین بعد میں اپنے نام، تخلص اور موروثی خطاب ''امیر'' کی وجہ سے امیر خسرو کہلائے۔ امیر خسرو آٹھ برس کے تھے کہ ان کے والد کا کسی محاربۂ جنگ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی والدہ بچوں کو پٹیالی سے نانا عماد الملک کی نگرانی میں دلی لے آئیں۔ جن کے یہاں عیش و آرام تھا اور جن کی زندگی بڑے ہی شان و شوکت کے ساتھ گزرتی تھی۔ سینکڑوں خادم

ان کی خدمت پر مامور تھے۔ان کو ہر قسم کی سہولت دستیاب تھی۔امیر خسرو کی زندگی بہت ہی عیش وآرام میں گزری ہے۔

دنیائے شعروادب میں شہرت عام وبقائے دوام حاصل کرنے والے جامع کمالات، عدیم المثال، عظیم المرتبت امیر خسرو دہلوی کا نام محتاج تعارف نہیں۔امیر خسرو ایک جید عالم تھے۔ساتھ ہی بے مثل ادیب اور بے بدل شاعر بھی۔انھیں عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں پر پوری قدرت اور فن موسیقی میں خاص مہارت حاصل تھی۔طبیعت بلا کی موجد اور مخترع پائی تھی۔راگ راگنیوں میں اَن گنت اختراعیں کیں۔اردو الفاظ کے استعمال اور انھیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کی سب سے پہلے امیر خسرو ہی نے کوشش کی۔ان کے ہاں ایسے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جن کا ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا مصرعہ اردو میں ہے۔حضرت امیر خسرو کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ان کے فارسی اشعار کا اندازہ لاکھوں میں کیا گیا ہے۔ان کا ہندی کلام بھی فارسی کلام سے کم نہ تھا، لیکن افسوس ہم تک نہ پہنچ سکا۔انھوں نے فارسی کی تمام اصنافِ سخن غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔امیر خسرو نے اردو میں پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دغل، جیتیاں، انمل، دوہے اور قسم قسم کے گیتوں میں اپنے کمالِ فن کے جوہر نمایاں کیے ہیں۔جو لطافت ذوق اور مطائبات شاعرانہ سے لبریز ہیں۔کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ امیر خسرو کی اس خصوصیت میں ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔کہ ان کو معانی و بیان اور نظم ونثر کے تمام اصناف پر فارسی، عربی، ترکی اور بھاشا زبانوں میں یکساں قدرت ومہارت حاصل ہے۔چنانچہ خالق باری اور بھاشا کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ امیر خسرو کو سنسکرت میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔اگرچہ امیر خسرو کے عہد میں سنسکرت کو انحطاط اور بھاشا کو عروج حاصل ہو چکا تھا۔شاعری بالخصوص غزل کے لیے یہ زبان قدرتاً موزوں بھی ہے اور اُس وقت اس کا کافی رواج بھی ہو چکا تھا۔امیر خسرو جنھوں نے گیارہ بادشاہوں کی بادشاہی دیکھی، فارسی کے ایسے باکمال شاعر تھے کہ خود اہلِ زبان اُن کا لوہا مانتے تھے۔

امیر خسرو نے پانچ دیوان لکھے۔جن کے نام "تحفۃ الصغر" (1267)، "وسط الحیوۃ" (1283)، "غرۃ الکمال" (1294)، "بقیہ نقیہ" (1316) اور "نہایت الکمال" (1335)

ہیں جن کی بنیادی نوعیت ادبی ہے۔خسرو کی غزلوں کے مطالعہ سے ان کی قادر الکلامی، جدت اور فنی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔انھوں نے غزلوں میں اپنے لیے ایک نیا راستہ نکالا اور فکر وفن کو نئی وسعتوں سے روشناس کرایا۔ ہندی میں شعر کہنے کا جذبہ خسرو کے پاس اس شدت سے ملتا ہے کہ اکثر فارسی غزلوں میں ہندی کے محاورے، الفاظ،فقرے اور بعض جگہوں پر پورا مصرعہ ہندی میں کہہ جاتے ہیں۔وہ ہر رنگ میں غزل کہتے تھےاور ہر شعر پراُن کی شخصیت کی چھاپ ہوتی تھی۔اُن کی ریختی میں بھی ایک طرح کے رکھ رکھاؤ کا بیان، اسلوب کی جدت، عجز و بیان جیسی خصوصیات ہیں۔ان کا طرز بیان، لب ولہجہ کی نرمی، شیرینی اور اس میں سلاست وترنم نے خیالات کی اثر آفرینی کو دوبالا کردیا ہے۔ان کی تشبیہوں اور استعاروں میں ہندوستانی روایتیں اور ہندوستانی عقیدے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ملتے ہیں۔اُن کی غزلیں ہندوستانی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔

امیر خسرو ہندوستان میں ایک پختہ کار اور ذہین فارسی شاعر تسلیم کیے جاتے تھے۔ فارسی میں ان کا مرتبہ حافظؔ اور سعدیؔ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔خود اہلِ ایران نے ان کی زبان دانی، شعر گوئی اور ان کی شعری افکار کی بلندی اور وسعت کی تعریف کی ہے۔اگر فارسی شاعری میں کوئی ''طوطئ ہند'' پیدا ہوا تو وہ امیر خسرو ہیں۔اگر خاکِ ہند سے کوئی ''شکر سخن'' اُبھرا تو وہ امیر خسرو ہیں۔اگر عرفی جیسے خوددار شاعر نے کسی کی روح کو شکر پیش کی تو وہ امیر خسرو ہیں۔اگر حافظ محمود خاں شیرانی نے کسی کو ادبی دنیا میں ''آفتابِ عالم تاب'' کے نام سے تعبیر کیا تو وہ امیر خسرو ہیں۔حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اگر کسی کو ''ترک اللہ'' کا خطاب دیا تو وہ امیر خسرو ہی تھے۔

امیر خسرو جب شعر وادب کے میدان میں وارد ہوئے تو اُس وقت غزل کی اپنی ایک حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ان کے سامنے سعدیؔ جیسے باکمال غزل گو کا پورا دفتر کھلا ہوا تھا جن کی استادی فارسی غزل میں تسلیم کی جاتی تھی۔اس کے علاوہ جو سلاست اور روانی، رنگینی اور شیرینی سعدی کی غزلوں میں پائی جاتی ہے، وہ نہ صرف ان سے پہلے کے شاعروں کے کلام میں مفقود ہے بلکہ ان کے بعد کے شعرا کی غزلوں میں بھی کم پائی جاتی ہے۔لیکن سعدیؔ کی

غزل میں ایک بات کی کمی ضرور تھی کہ اس میں وہ سوز و گداز اور وہ جوش و خروش نہ تھا جو انسان کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر سکے، جو اس کے مُردہ احساسات میں جان ڈال دے اور جو اسے بے خود اور وارفتہ بنا سکے۔ سعدؔی کی اس کمزوری سے ان کے جانشین ہم وطن شاعر حافظؔ نے فائدہ اٹھایا اور غزل گوئی میں وہ نام پیدا کیا کہ سعدؔی کی شہرت اس کے آگے ماند پڑ گئی۔
ڈاکٹر وحید مرزا کے درج ذیل اقتباس سے اس موضوع کو سمجھنے میں مزید تقویت ملتی ہے:

> ''حافظ سے پہلے ہندوستان میں خسرو کو بھی غزل کی اس کمی کا پورا احساس تھا اور اگر چہ ان کے ہم عصر خواجہ حسن نے سعدی کے اسلوب کو اس قدر اپنایا کہ سعدیٔ ہند کا لقب پایا، لیکن خسرو کی جدت پسند طبیعت نے سعدی کی استادی سے تو انکار نہیں کیا مگر ان کی شاگردی پر بھی اِکتفا نہیں کیا، بلکہ غزل میں اپنے لیے ایک نیا مسلک، ایک انوکھی روش اور ایک جدید اسلوب اختیار کیا۔ جس کی کچھ جھلک حافظ میں بھی موجود ہے لیکن جس کا پَرتو زیادہ تر اور بعد کے شاعر مثلاً جامی، نظیری اور غالب میں زیادہ نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ سعدی کی غزل میں ایک سادگیٔ خیالات ہے جو بعض لحاظ سے یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ لیکن جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں کوئی گہرائی، کوئی باریکی اور کوئی نزاکت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ صفات خسرو کی غزلوں میں بہت نمایاں ہیں اور اِنھی صفات کو بعد کے شعرا نے جن کا میں نے ذکر کیا ہے، خاص طور پر اپنے غزلیہ کلام میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔''
>
> (امیر خسرو: سوانح عمری از ڈاکٹر وحید مرزا، ص212)

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو کے سامنے سعدؔی کی فارسی شاعری کا پورا پسِ منظر موجود تھا اور اس کی شعری انفرادیت اور خصوصیت سے بھی خسرو کو پوری آگہی حاصل تھی۔ اب انھیں غزل کہنے میں دشواری یا مشکل کا سامنا نہ تھا۔ وہ غزل کہہ سکتے تھے اور پوری شان سے کہہ سکتے تھے۔ یہ بات باور کرانا ضروری ہے کہ اگر خسرو مثنوی، قصیدہ، رباعی، دوہے، گیت وغیرہ جیسے اصناف میں طبع آزمائی نہ بھی کرتے تب بھی

بحیثیت ایک غزل گو ان کی پہچان ایک مسلم الثبوت استاد اور ایک باکمال شاعر ہی کے طور پر ہوتی۔ کیونکہ انھوں نے صنفِ غزل کو انتہائے کمال تک پہنچایا۔ گویا جو کام سعدی سے پورا نہ ہو سکا تھا، انھوں نے پورا کر دیا۔ شبلی نعمانی کی زبان میں ''امیر خسرو کی غزل گوئی دراصل خمخانہ سعدی ہی کی شراب ہے جو دوبارہ کھینچ کر تیز تر ہو گئی۔'' یہی وجہ ہے کہ خسرو کی غزل گوئی میں وہ تمام معنوی و صوری خوبیاں موجود ہیں جو غزل کی تاثیر کو دوبالا کرتی ہیں اور غزل کو دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں زیادہ محبوب صنف بناتی ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین امیر خسرو کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے اپنے تاثرات کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''اسے تاریخ کی ستم ظریفی یا ایک اتفاق محض کہ خسرو نے اپنی زندگی میں اپنی غزلوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی یا یہ کہ اپنی شہرت کے لیے اپنی غزلوں پر زیادہ تکیہ نہیں کیا۔ انھیں زیادہ تر اعتبار اپنی مثنویات اور اپنے عارفانہ قصائد پر تھا۔ لیکن آج ان کی عالمگیر شہرت کا زیادہ تر دارومدار ان کی غزلوں ہی پر ہے۔ ایسا غالباً اس وجہ سے ہے کہ ان کی شخصیت کا حقیقی روپ ان کی غزلوں ہی میں ابھرتا ہے اور غزلوں میں ان کے حقیقی جذبات کا اظہار بھی ہوا ہے۔''
>
> (امیر خسرو دہلوی از پروفیسر ممتاز حسین، ص488)

اردو شاعری میں امیر خسرو نے ایک طریقہ تو یہ اختیار کیا کہ شعر کا ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا مصرعہ اردو میں لکھا۔ دوسرا طریقہ یہ کہ آدھا مصرعہ فارسی اور آدھا مصرعہ اُردو میں لکھا۔ تیسرا طریقہ یہ کہ دونوں مصرعے اردو کے لائے۔ امیر خسرو کی فارسی شاعری کا جو احترام اور وقار ہے۔ ان کی ہندی شاعری کی عزت اس سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کا ہندی کلام ہمارے قومی شعر و ادب کا نقش اول ہے۔ اس زبان میں ان کی حیرت ناک مقدار کو سمجھنے کے لیے ان کی زود گوئی، بدیہہ گوئی اور پُر گوئی کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ خسرو اپنے چوتھے دیوان بقیہ نقیہ کے دیباچے میں اپنی زود گوئی کے لیے کہتے ہیں کہ ''میں شعر اتنی دیر میں کہتا ہوں جتنی دیر میں لفظ بیت زبان سے ادا کیا جائے۔'' تذکرہ نویسوں نے خود خسرو کے قول کے مطابق

ان کے فارسی کلام کی تعداد تین لاکھ ابیات سے زیادہ اور چار لاکھ ابیات سے کم بتائی ہے۔ خسرو کے فارسی اشعار آج بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔لیکن افسوس کہ ان کی مادری زبان ہندی کے تین چار لاکھ اشعار میں سے بشمول خالق باری میں ان کے چار پانچ سو شعر ہی ہمارے پاس باقی رہ گئے ہیں۔ پھر ان باقیات کی اگر محققانہ جانچ کی جائے (جو بہت مشکل ہے) تو یہ تعداد دو سو تک بھی مشکل سے جا سکے گی۔ خسرو جیسے عظیم شاعر کا اتنا بڑا ذخیرۂ کلام ضائع ہو جانا ایک جانکاہ ادبی سانحہ ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے اپنی کتاب ''امیر خسروؒ'' میں خسرو کا ہندی کلام ضائع ہونے کا سبب بحوالہ دیباچہ ''غرۃ الکمال'' یہ بیان کیا ہے کہ خسرو کی نظر میں اپنے ہندی کلام کی کوئی وقعت نہ تھی، لہٰذا انھوں نے اسے جمع کرنے کے بجائے دوستوں کو بانٹ دیا۔لیکن ڈاکٹر صفدر آہ اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ امیر خسرو نے کہیں بھی اپنے ہندی کلام کو بے وقعت قرار دیا اور جس کی بنیاد پر انھوں نے اسے اپنے دوستوں میں بانٹ دیا ہو۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ''مجھے ڈاکٹر صاحب کے اس بیان پر افسوس اور تعجب ہوتا ہے۔ دیباچہ غرۃ الکمال میں کسی جگہ کوئی عبارت ایسی نہیں جس پر خسرو نے اشارتاً بھی اپنے ہندی کلام کو بے وقعت کہا ہو۔صرف ایک جگہ احباب کو ہندی کلام نذر کرنے کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں'' جزو چند نظم ہندوی نذر دوستاں کردہ شدہ است''۔ ان کے مطابق کتاب میں یہ فقرہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ اس سے قبل یا اس کے بعد ایک لفظ بھی اس ضمن میں نہیں لکھا گیا ہے۔خسرو کا اپنی چند ہندی نظمیں احباب کی نذر کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان کا ہندی کلام بے حد مقبول تھا اور ان کے احباب ان ہندی نظموں کو حاصل کرنے کی فرمائش کرتے رہتے تھے۔ڈاکٹر وحید مرزا کا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ خسرو کا ہندی کلام ضائع ہونے کا سبب اس کی طرف ان کی بے اعتنائی ہے۔ درحقیقت اس معاملہ میں قصور اس عہد کے پست ذہنیت ماحول کا ہے جس میں کبھی زبانوں کی تو عزت تھی اور مادری زبانیں ہیچ اور

بے وقعت سمجھی جاتی تھیں۔"

(خسرو بحیثیت ہندی شاعر از صفدر آہ، ص17)

متذکرہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خسرو نے اپنے ہندی کلام کو کبھی بے وقعت یا بے اعتبار نہیں سمجھا بلکہ یہ اُس زمانے کے لوگوں کی ہندی زبان کے تئیں بے اعتنائی اور بے التفاتی تھی کہ جس کی بنیاد پر خسرو کو اپنے ہندی کلام کو دوست واحباب کی نذر کرنا پڑا۔ حالانکہ ڈاکٹر وحید مرزا امیر خسرو کے ایک اہم محقق اور نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن صفدر آہ نے حوالہ دے کر خسرو کی ہندی شاعری کو بے وقعت قرار دینے کی موصوف کے بیان کو بے جا دلیل ثابت کیا ہے۔ یہ بات ایک بار پھر دہرائی جاتی ہے کہ امیر خسرو نے ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے اور دونوں زبانوں میں غزلیں کہی ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ اب ان کا ہندی کلام ناپید ہو چکا ہے اور جو کچھ بچا ہے وہ بھی امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول "اُن کا جو اردو کلام آج ملتا ہے اس میں امتدادِ زمانہ سے اتنی تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ اب اسے مستند نہیں مانا جا سکتا، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ امیر خسرو نے اس زبان میں شاعری کی ہے۔"

امیر خسرو کے دوہوں میں بھی رنگِ تغزل کا معنی خیز عکس نظر آتا ہے۔ ان کے دو دوہے حسب ذیل ہیں:

گوری سوئی سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چھوں دیس
خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرا من پیو کا دو بھئے یک رنگ

ان دونوں دوہوں میں خسرو کا سوز تغزل کی صورت میں نظر آتا ہے۔ سنسکرت کا شرنگار اس رنگ سے الگ ہوتا ہے۔ دوہے ہندی میں غزل کا نعم البدل ہیں۔ اس صنف میں بھی غزل ہی کی طرح ایک خیال صرف دو مصرعوں میں ادا کیا جاتا ہے۔ دوہا کئی صدیوں تک

ہندی شاعری کی مقبول ترین صنف رہی ہے۔ دوہے کا وجود سنسکرت میں نہیں۔ یہ حسین صنف اپ بھرنش ملکی دین ہے۔ ایک اور بڑا خوبصورت دوہا بھی خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے:

سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے
بدھیا ایسی رین کر بھور کدی نا ہوئے

ان دوہوں کے علاوہ خسرو کی مشہور غزل "زحال مسکیں" بھی خالص ادبی رنگ کے تحت آتی ہے۔ اس غزل میں خسرو کا سوز سب سے زیادہ نمایاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی کی طرح بھاکھا پر قادر تھے۔ یہ غزل سب سے پہلے 1852 میں ڈاکٹر اشپرنگر نے اپنے مضمون میں شائع کی۔ جس کے متن میں چند تبدیلیاں بعد میں کی گئیں۔ جمیل جالبی تاریخ ادب اردو میں اسے ریختہ سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ غزل کا پہلا شعر یہ ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں درازِ چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چوں شمع سوزاں چوں ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں

بحقِ روزِ وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کہ دورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیاں کی کھتیاں

مذکورہ ہندی غزل کو قوال حضرات اکثر و بیشتر اپنی محفلوں میں گنگناتے رہتے ہیں اس لیے اس غزل کو خسرو کے کلام میں خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اسے خاص و عام نے بہت پسند کیا ہے۔ اس طرح یہ غزل خسرو کی شخصیت کی پہچان بن گئی ہے۔ امیر خسرو کی غزلوں میں بے شمار قسم کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے عشق و محبت، تصوف و اخلاق، موسیقی اور رومان، مشترکہ کلچر، فلسفہ اور انسان دوستی وغیرہ موضوعات کو اپنی شاعری کا محور اور مرکز بنایا۔

امیر خسرو کو چونکہ بچپن ہی سے آسائش اور خوش حال زندگی میسر ہوئی۔ زندگی راحت سے جینے کا ہر سامان انھیں دستیاب تھا۔ ان کے لیے ہر وہ سہولت موجود تھی جو دلوں کو گدگدا کر پیار و محبت کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب نہیں انھوں نے پیار و محبت کا صحیح مزا نہیں چکھا ہوگا۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''بعض سماجی پابندیوں کی وجہ سے اس عہد میں غیر عورت سے باتیں کرنا اور اس سے اعلانیہ محبت جتانا ممکن نہیں تھا، اس لئے ہمیں ان کی زندگی میں حسین عورتوں سے دل لگانے کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ البتہ ایک خوبرو نوجوان حسن دہلوی سے انھیں جو بے پناہ محبت تھی وہ افسانہ بن چکی ہے۔''
>
> (امیر خسرو نمبر، رسالہ فروغ اردو لکھنؤ، اپریل و مئی 1976، ص 37)

متذکرہ بالا اقتباس سے ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے حسن دہلوی سے خسرو کے رومان کی جو بات چھیڑی ہے وہ حقیقی معنوں میں ایک فسانے کی نوعیت اختیار کر گئی۔ کہتے ہیں کہ حسن بے حد حسین و جمیل تھے۔ ان کی نان کی دکان تھی۔ جوانی کے دنوں میں ایک بار جب خسرو کا حسن کی دکان پر سے گزر ہوا تو وہ ان کو دیکھ کر مسحور سے ہو گئے۔ نان خریدنے کے بہانے تھوڑی دیر اِن سے بات چیت کی اور گھائل ہو کر اپنے گھر چلے آئے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ حسن کے دل میں خسرو کا نقش بن گیا۔ پھر تو آہستہ آہستہ یہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہو گئے کہ ان کے نقش و محبت کی کہانی نے لوگوں کے دلوں سے محمود ایاز کی یاد کو مٹا دیا۔

جن دنوں یہ دونوں ملتان کے حاکم خان شہید کے ملازم تھے۔ خان شہید نے کوشش کی کہ انھیں بدنامی سے بچایا جائے، ملنے سے منع کیا، تنبیہہ کی، کوڑے لگوائے، لیکن بے سود۔ وہ دو دل الگ ہونے کے نہیں ملے تھے۔ اس موقع پر خسرو نے ایک غزل بھی کہی تھی جس کے چند اشعار یوں ہیں:

ہر شبم جان بر لب آید نالۂ زار آورد

(ہر رات جان ہونٹوں پہ آتی ہے اور دل سے آہیں نکلنے لگتی ہیں)

تا کدا مین باد بوئے زان جفا کار آورد

(یہ ہوائیں کب تلک اس ظلم کی خوشبو مجھ تلک پہنچاتی رہیں گی)

رفت آن شوخ و دل خون گشتہ رابا خود ببرد

(وہ چنچل چلا گیا اور اپنے ساتھ میرا لہولہان دل بھی لے گیا)

عاقبت روزی ہماں خوش گفتار آورد

(ایک دن آئے گا جب یہی لہو اس کو میرے پاس پکڑ کر لائے گا)

ജ്ഞ

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو سچی محبت سے مالا مال تھے۔ ان کے پہلو میں ایک درد بھرا دل تھا۔ وہ رنج و غم، سوز و گداز، بے چینی اور تڑپ، غرض ہر اس جذبہ اور احساس سے عملاً واقف تھے جو ایک محبت کرنے والے انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ ان کی محبت روایتی نہیں بلکہ سچی ہے، ان کی غزلوں میں جو پکار اور تڑپ ہے، وہ ایک سچے عاشق کے دل کی پکار ہے۔

سعید نفیسی کے مرتب کردہ ''دیوان کامل امیر خسرو دہلوی'' کی غزلوں کی مجموعی تعداد 1726 ہے اور ہر غزل میں ان کے محبت بھرے دل کی بیسیوں دھڑکنیں چھپی ہوئی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن ہے کہ ان کے ایک ایک شعر کو لے کر اس پر بحث کریں اور اس کی خوبیاں گنائیں۔ خسرو کے کچھ عشقیہ اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

صبا آمد ولی دل باز نامد
(صبا آئی لیکن دل واپس نہیں آیا)

غریب مابہ منزل نامد
(دیارِ محبوب کا مسافر اپنی منزل پر نہ پہنچا)

بہ دریا غرق شد رکت صبوری
(صبر کا سارا ساز وسامان دریا کی نذر ہو گیا)

کسی کشتی سوی ساحل باز نامد
(لیکن کوئی کشتی ساحل کی طرف واپس نہ آئی)

امیر خسرو نے غزلوں میں اپنے محبوب سے لگاؤ اور اس لگاؤ میں پیدا ہونے والے جذبات کا اظہار بخوبی کیا ہے۔ان میں درد بھی ہے اور غم بھی۔ بے چینی بھی ہے اور بے قراری بھی۔ ان میں ہر وہ کیفیت موجود ہے جو ایک عاشق کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی ہے۔ہجر و فراق کے مسلسل چرکے اور مایوسی و محرومی کے لامتناہی کچو کے متواتر سہنے کے باوجود بھی خسرو امید وصل کے دامن کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتے اور نہ ہی صبر و قرار اور انتظار و آرزو کے دلفگار سلسلے سے باز آتے ہیں۔ بلکہ تسکین دلِ زار اور اطمینان قلب محزوں کے لیے مختلف بہانے کام میں لاتے ہیں اور راہ میں درپیش آلام و مصائب کی پرواہ نہیں کرتے۔ درج ذیل اشعار سے اس بات کی صراحت ہوتی ہے:

شب ہجراں دراز است ارچہ خسرو
(اے خسرو اگرچہ ہجر کی رات دراز ہوتی ہے)

مشو غمگین کہ امید سحر است
(ناامید نہ ہو، سحر کی امید رکھ)

منال از جور و محبت بہا خموش و دم مزن خسرو
(خسرو محبت کے جور و ستم کا ذکر مت کر)

کہ بے صبر در عالم، مصیبت بیش می آید
(کہ اس عالم میں بے صبروں ہی پہ زیادہ مصیبتیں آتی ہیں)

❀

خسرو کے دل میں درد بھرے دل کی آواز ہم ان کی سبھی غزلوں میں سن سکتے ہیں۔امیر خسرو کی عشقیہ شاعری فارسی ادب عالیہ میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

اردو کے جن شاعروں کے یہاں متصوفانہ کلام کی مثالیں ملتی ہیں۔ان میں ولیؔ، سراجؔ، غالبؔ، دردؔ، اصغرؔ، اقبالؔ، فانیؔ وغیرہ شامل ہیں۔لیکن تصوف کے سلسلے میں ان شعرا میں امیر خسرو کا نام خاص طور پر لیا جاسکتا ہے۔جن کی غزلوں میں تصوف کی عمومیت کا رنگ خوب جھلکتا ہے۔صوفیوں کے عقیدے میں خدا ہی کی ذات سب سے اہم ترین ہے۔جس کے تصور میں انسان مستغرق ہو جائے۔ان کا کہنا ہے کہ یہ انسانی عقل کے بس سے باہر ہے کہ وہ خدا کو سمجھ سکے اور اس کی تعریف و تحدید کر سکے۔امیر خسرو کہتے ہیں:

آنکہ خود را شناخت نتواند
(جو شخص خود کو نہ پہچان سکتا ہے)

آفرینندہ را کجا داند
(وہ اپنے خالق کو کیسے پہچان سکتا ہے)

❀

یعنی جو انسان اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکتا وہ اپنے پیدا کرنے والے کو کہاں جان سکتا ہے۔امیر خسرو صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک بزرگ صوفی بھی تھے۔ان کا پورا خاندان مذہبی احکام کا پابند تھا بلکہ وہ صوفیوں سے بھی خاص اُنسیت رکھتے تھے۔اس خاندان کے سبھی افراد شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے۔خسرو کو بھی بچپن ہی میں شیخ کے حلقۂ ارادت میں

شامل کر دیا گیا۔ انھوں نے تصوف کی منزلیں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے چراغِ معرفت کی روشنی میں طے کیں۔ وہ خواجہ صاحب سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور خواجہ صاحب بھی ان پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ ان کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت پر ان کے پیر کا پورا اثر پڑا۔ ان کی غزل میں صوفیت نمایاں ہونے کی وجہ پیر خواجہ نظام الدینؒ کے زیرِ نگرانی ان کا پرورش پانا ہے۔ حامد اللہ ندوی لکھتے ہیں:

> ''جو شخص کہ شیخ کا نہ صرف مرید بلکہ ان کا محبوب اور خلیفہ ہو۔ جس کی پوری زندگی درباروں میں رہنے کے باوجود عبادت و ریاضت میں گذری ہو۔ جس کا زیادہ تر وقت درباروں کے بجائے خانقاہوں میں گذرتا ہو، اس کے متعلق یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ تصوف اور دنیائے معرفت کی باریکیوں سے ناواقف ہوگا۔ ایسی غزلوں میں انھوں نے پیار و محبت اور رندی و سرمستی کی باتیں کی ہیں بلکہ معرفت کے راز بھی کھولے ہیں۔''
>
> (امیر خسرو نمبر، رسالہ فروغِ اردو، لکھنؤ، اپریل و مئی 1976، ص 41)

ان کے کلام میں عشق حقیقی کی آنچ لپکتی ہوئی نظر آتی ہے جو اہلِ باطن کے دل کو پگھلا دیتی ہے۔ دراصل امیر خسرو عشق الٰہی میں سرشار ہیں اور ان کے دردِ دل کا کوئی درماں نہیں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

سرے دارم کہ ساماں نیست اورا
(میرے پاس عشق کا ایسا راز ہے جس کا کوئی جواب نہیں)

بہ دل دردے کہ درمان نیست اورا
(اور میرے دل میں ایسا درد ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں)

ഇ ഗ

امیر خسرو مشاہدۂ حق کے لیے بے تاب ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان پر قبض کی کیفیت طاری ہوتی تھی اور وہ بسیط کے خواہش مند رہتے تھے۔ جیسا کہ وہ مندرجہ

ذیل شعر میں فرماتے ہیں:

برائے انتظامِ ہست چشم
(چشم انتظام و انصرام کے واسطے ہے)
کہ خواب وہم پریشاں نیست اورا
(خواب وخیال اس کے لیے پریشان کن نہیں ہے)

خسرو کے یہاں مرکزی نقطہ ”عشق“ ہے، ”عشق ہزار شیوہ“ جو سرزد اور سرکش ہو۔ تصوف اسی عشق کی بے نہایت، بے کنار اور بے در و دیوار توسیع ہے۔ تصوف نہ ان کا مشغلہ ہے، نہ پیشہ، نہ نقاب ہے، نہ تکیہ، بلکہ ایک روحانی کیفیت ہے جو زلف و رخسار سے ہوتے ہوتے تمام عالمِ وجود کے حسن اور دلکشی کی ہمزاد اور دمساز بن چکی ہے۔ جب یہ کیفیت ان کی غزلوں میں بس چکی تب انھوں نے غزلوں کو دیوان کی شیرازہ بندی میں راہ دی اور پھر غالباً خود ہی پہلے کے تین دیوانوں میں بھی پچھلی غزلیں شامل کر لیں۔ کبھی انھیں عشق میں صبر نہیں ہے، کبھی رات میں اپنے محبوب کا جلوہ دیکھتے ہیں، عشق ہی کو درد کا سبب مانتے ہیں اور عشق ہی سے اس کی دوا پاتے ہیں، عشق میں ان کا دل آوارہ ہوتا ہے اور عشق کی بیماری میں ان کی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے لیکن انھیں عشق میں فرقت منظور نہیں۔ بھلے ہی ان کا دل و جان ناکارہ ہو جائے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

بسیار شدم عاشق دیوانہ ازیں پیش
(اس سے پہلے بھی میں عشق سے دوچار ہوا)

آن صبر کہ باز بہ این ندارم
(لیکن اس سے زیادہ صبر کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا)

پری پیکر نگارے، سرو قدے، لالہ رخسارے
(میرا محبوب پری پیکر ہے سرو قد ہے گلابی چہرہ ہے)

سراپا آفت دل بود، شب جائے کہ من بودم
(جو دل کے لیے قیامت خیز تھی)

دلم در عاشقی آوارہ شد، آوارہ تر بادا
(میرا دل عشق میں پاگل ہے اور زیادہ پاگل ہو جائے)

تنم از بے دلی بیچارہ شد، بیچارا تر بادا
(میرا جسم بے دلی سے بے چارہ ہو گیا ہے اور زیادہ لاچار ہو جائے)

امیر خسرو کی شاعری بہت پاکیزہ اور اعلیٰ وارفع ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ درجۂ اول کے صوفی شاعر ہیں۔

غزل گوئی میں خسرو کا رنگِ تغزل رومان سے بھرا ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر انوار الحسن (مرتب دیوانِ خسرو، نول کشور ایڈیشن):

''وہ خود آنسو بہاتے ہیں تو دوسروں کو بھی آنسو بہانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہنستے ہیں تو دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ رومانی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں تو دوسروں کو بھی وہیں کھینچ بلاتے ہیں۔ ان کا رومان اور تغزل ماورائی نہیں بلکہ اسی آب و گل کا رومان ہے اور تغزل بھی صحیح معنوں میں تغزل ہے۔''

امیر خسرو نے اسی رنگِ شاعری میں بھی اپنا امتیاز برقرار رکھا ہے۔ خسرو جب اس رنگ تغزل میں اپنا راگ الاپتے ہیں تو خود بھی بے قرار ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان کیفیتوں سے دوچار ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ محبوب سے جدائی کا منظر کتنے ہی شعرا نے بیان کیا ہے۔ خسرو اس منظر کی ایسی دلکش تصویر پیش کرتے ہیں کہ اس رومان پرور اور رقت انگیز منظر سے کون دل ہے جو متاثر نہ ہو اور کون آنکھ ہے جو اشکبار نہ ہو جائے، مثلاً:

ابر باران و من یار ستادہ بہ وداع
(بارش کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور میں یار کو وداع کرنے کے لیے کھڑا ہوں)

من جدا گریہ کناں ابر جدا یار جدا

(دونوں طرف افسردگی ہے اور بادل بھی پریشان ہیں)

ﷻ

یعنی بارش کا موسم ہے، محبوب رخصت ہو کر جا رہا ہے، عاشق دل گرفتہ دامن صبر کو تھامے ہوئے کھڑا ہے، دونوں کی آنکھیں اشکبار ہیں اور بادل بھی اس وقت انگیز جدائی کے منظر سے متاثر ہو کر بے ساختہ اشکبار ہو گئے۔ محبوب اپنے عاشق خسرو کو روتے ہوئے دیکھ لیا تو کہتا ہے کہ گھر جلد چلنا چاہیے کیونکہ بارش آ گئی ہے:

گریہ خسرو چونکہ کرد گفت

(خسرو نے آہ و زاری کرتے ہوئے کہا)

خانہ روم زود کہ باران رسید

(بارش کے آثار ہے میں گھر جانے کو ہوں)

ﷻ

خسرو کی غزلوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ معاملہ بندی کا انداز بھی جگہ جگہ نمایاں نظر آتا ہے جس میں حسین تشبیہات واستعارات اور شیریں زبانی سے شدتِ تاثیر کے جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ خسرو کی غزلوں میں رومانیت سے پُر کئی رومان پسند اشعار ہیں۔

موسیقی میں امیر خسرو کی مہارت سے کون منکر ہو سکتا ہے۔ موسیقی کے ایسے اُستادِ بے بدل کہ اُن کی ایجادات واختراعات آج تک علمِ موسیقی کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ امیر خسرو کے نزدیک شاعری کا رتبہ موسیقی سے اور نظم کا درجہ نثر سے بلند تر ہے۔ جس کی ایک دلیل یہ کہ موسیقی بغیر لفظِ موزوں صرف ''ہاں ہاں ہوں ہوں'' رہ جاتی ہے اور نثر میں تو نظم (برائے آرائش) آجاتی ہے لیکن نظم میں نثر نہیں لاتے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو'نا یک' کے لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ یہ موسیقی کی دنیا میں سب سے بڑا لقب تھا۔ خسرو ایرانی اور ہندوستانی دونوں طرح کی موسیقی پر قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں ان کی موسیقی سے رغبت یا محبت کا پورا پتہ چل جاتا ہے۔ وہ شعر کی تاثیر کے ساتھ ساتھ نغمہ کی کشش

اور اثر سے بھی واقف تھے۔ ان کی غزلیات شعر و موسیقی کا امتزاج ہے اور ظاہر ہے کہ جس کلام میں ان دونوں فنون لطیفہ کی کیفیتیں موجود ہوں اس میں تاثیر کیوں نہ پیدا ہوگی۔ شہاب سرمدی اپنے ایک مضمون ''غزل سَرا خسرو (سرود و غزل)'' میں خسرو کے غزلوں میں غنائیت کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''خسرو نے غزلیں اکثر و بیشتر صرف اس لئے کہیں کہ انھیں گایا جائے اور چوں کہ انھیں گایا گیا اور رچ رچ کے گایا گیا اس لئے تہذیبی میل جول نے آنکھیں کھولیں تو ایک ہوتے ہوتے گرد و پیش میں فارسی کا سابقہ ہندی لوک گیت سے پڑا۔ گیت ہماری موسیقی کا اَمرِت سوت رہا ہے، عام انسانی زندگی سے نزدیک تر ہونے کی وجہ سے۔ ابتداً غزل کا بھی کم و بیش یہی کردار تھا۔ وہ پسندِ خاطر عوام پہلے ہوئی، منظور خواص بعد کو۔''
>
> (خسرو شناسی از مرتبین، ظ انصاری، ابُو الفیض سحر، ص270)

خسرو کی طبیعت میں موسیقی کا رچاؤ فطری تھا۔ جس کا اندازہ ان کی غزلوں سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ خسرو نے اپنی غزلیات کے لیے مترنم بحریں اختیار کیں۔ انھوں نے ردیف و قافیہ کے انتخاب موسیقی کو پیش نظر رکھا اور الفاظ کی ترتیب و نشست میں بھی انھیں نغمگی کا خیال رہا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار میں تیرہ نشتر کے خواص پیدا ہو گئے۔ خسرو کے چند شگفتہ غزلوں کے مطلعے درج ذیل ہیں:

جانِ من از آرام شد آرام جانِ من کجا
(میری جان تو آرام سے ہے لیکن جان کا آرام کہاں)

ہجرم نشان فتنہ شد فتنہ نشان من کجا
(میری جدائی فتنے کی نشانی بن گئی مگر فتنہ نشان کہاں)

بشگفت گلہا در چمن ای گلستانِ من بیا
(باغوں میں پھول کھل گئے اے میرے چمن تو آجا)

سرو ایستادہ منتظر سر دِرون من بیا

(میرا سراپا منتظر کھڑا ہے اے میرے دل میرے نہاں خانے کا راز تو آجا)

ای ترک کمان ابرو من گشتۂ ابرویت

(اے تیر کمان والے میری آبرو بھی تیری آبرو بن گئی ہے)

ملک ہمہ ہند و چین بدہم بہ یکی مویت

(تمہارے ایک زلف کے لیے ہند و چین قربان ہو)

چھوٹی بحروں میں روانی اور شگفتگی کے ساتھ کہے گئے اشعار سے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں ہے کہ خسرو کو کم از کم الفاظ میں اپنے لطیف خیالات کو ادا کرنے کی کتنی صلاحیت موجود تھی۔ جس میں وہی شگفتگی، وہی حسن، وہی دلکشی، وہی ترنم موجود ہے جو ان کی مترنم بڑی بحروں میں کہی ہوئی غزلوں میں پایا جاتا ہے۔

خسرو کی غزلوں میں پیار و محبت کی باتوں کے بعد جس چیز کا ذکر بار بار آتا ہے۔ وہ یہی مٹی ہے، جام ہے، سبو ہے، رند و سر مستی ہے اور بے خودی و بے تابی ہے۔ ان کے زمانے میں شراب نوشی کو سرکاری طور پر ممنوع قرار دیا گیا تھا، اس لیے کھلے عام مے نوشی باعثِ جرم تھا۔ لیکن چونکہ خسرو سماج کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑی بڑی محفلوں میں صبح و شام ان کا اُٹھنا بیٹھنا تھا، اس لیے چوری چھپے ہی سہی وہاں جام تو ضرور کھنکتے ہوں گے۔ قطع نظر اس کے خسرو کے شراب نوشی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ایک دو اشعار اس سلسلے میں پیش کیے جاتے ہیں:

خیز تا بادہ در پیالہ کنیم

(اٹھو پیالے میں شراب ڈال دیتے ہیں)

گل درونِ قدح چوں لالہ کنیم

(اور جام میں جو گلاب ہے اس کو گلِ لالہ بنا دے)

با می جانِ فزا و نغمہ چنگ
(روح پرور شراب سے اور ساز و سنگیت سے)

تا بہ گی خون خوریم و نالہ کنیم
(جان فزا شراب پینے سے توے کی طرح لال ہو کر اپنا خون پئیں گے، نالہ و فریاد کریں گے)

وز بخار شراب آتشِ فام
(آگ کی مانند شراب کے بخار سے)

ورق چہرہ پر ز ژالہ کنیم
(اپنے یخ بستہ اور ٹھنڈے چہروں کو آگ کی مانند شراب کے بخار سے گرما دے)

خسرو سچے وطن پرست اور ہندوستان کے عاشق تھے اپنے اشعار میں جہاں جہاں وہ ہندوستان کی تعریف کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کی روح بول اُٹھتی ہو۔ ہندوستان کی زمین، ہندوستان کے موسم، ہندوستان کے پرندے، ہندوستان کے پھول، ہندوستان کے ریت رواج، ہندوستان کے دانشور وغیرہ پر جس تاثر سے خسرو نے شعر کہے ہیں اس کی مثال غالباً سنسکرت سے لے کر ہندی اور اردو تک کسی ہندوستانی زبان میں نہ مل سکے گی۔ حالانکہ خسرو کے عہد میں وطن اور وطنیت کا شعور بالکل نابالغ اور ناپختہ تھا۔

اے دہلی اے بُتانِ سادہ
(اے دہلی اے دہلی کی معصوم حسیناؤ)

پگ بستہ و ریشہ کج نہادہ
(تمہارے رگ و ریشے کی بنیاد ہی ٹیڑھی ہے، تمہارے پاؤں ہی بندھے ہوئے ہیں)

خسرو کی بے عدیل ذاتی صلاحیت اور ہندوستان سے اُن کے بے پناہ خلوص کو

دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اپنے لاکھوں ہندوی اشعار میں انھوں نے کیا کچھ کہا ہوگا۔ خسرو کا جو کچھ بھی کلام اس وقت موجود ہے اس کا بہت کم حصہ اہلِ ذوق کی بیاضوں سے اور بیشتر عوام کے سینوں سے ہم تک پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کا تھوڑا حصہ خالص ادبی رنگ کا ہے اور زیادہ حصہ عام پسند انداز کا ہے۔

اردو زبان وادب کے وہ شاعرِ اول جن کی مٹھاس آج بھی زبان میں شہد گھول رہی ہے، امیر خسرو دو تہذیبوں کے امتزاج کے وہ گلِ نورس ہیں جو اُبھرتی پھیلتی تہذیبوں کے ایسے ہی موڑ پر ظہور میں آتے ہیں اور خود تہذیب کی علامت بن جاتے ہیں۔ امیر خسرو ''ہند و مسلم ثقافت'' کی وہ زندہ علامت ہیں کہ رہتی دنیا تک وہ اس تہذیب کے اولین نمائندے کی حیثیت سے یادگار رہیں گے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے زمانے کے بلکہ آئندہ دور کے تہذیبی دھاروں کو بھی متاثر کیا۔ اُن کا اردو کلام ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔

شعر کی ظاہری و معنوی لطافت میں حسین تراکیب، بدیع استعارات، لطیف تشبیہات اور برمحل صنائع و بدائع کا استعمال خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ خسؔرو کی غزلیات میں یہ تمام لطائف شعری نہ صرف موجود ہیں بلکہ نہایت سلیقے سے برتے گئے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف مستعمل تشبیہات کو استعمال کیا ہے بلکہ نئی تشبیہات و استعارات اختراع کر کے فارسی غزل کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔

# کتابیات

1۔ امیر خسرو: عہد، فن اور شخصیت، عرش ملسیانی، مرکز تصنیف و تالیف نکودر۔1974
2۔ خسرو شناسی، مرتبین ظ انصاری، ابوالفیض سحر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، نئی دہلی۔ اکتوبر1975
3۔ خسرو کا ذہنی سفر، ظ۔ انصاری، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی۔1977
4۔ امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری، پروفیسر ممتاز حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔1982
5۔ امیر خسرو (سوانح عمری)، ڈاکٹر وحید مرزا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔2013
6۔ خسرو اقلیم سخن (امیر خسرو)، ڈاکٹر عبدالطیف حیدری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔201
7۔ امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر، صفدر آہ، علوی بک ڈپو محمد علی روڈ، ممبئی

----

# رسائل جرائد

1۔ رسالہ ماہ نامہ "فروغِ اردو" لکھنؤ، جلد نمبر24، شمارہ نمبر12-1، اپریل و مئی1976

☆☆☆

# مولانا مملوک العلی کی مکتوب نگاری

دلّی کالج ہندوستان کا ایسا واحد تعلیمی ادارہ ہے جو کئی بار بند ہونے کے باوجود آج تک مسلسل اپنی تاریخی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے تابندگی و پائندگی کا ثبوت دے رہا ہے۔ ایسا زندہ و پائندہ ثبوت تاریخ میں خال خال ہی ملتا ہے۔ جس کے تاریخی شواہد بھی ملتے ہیں۔ دلّی کالج کو تاریخی بنانے میں جہاں گردشِ زمانہ کا ہاتھ رہا ہے وہیں اس کی شہرت و مقبولیت کی وجہ اس سے وابستہ اساتذہ اور طالب علموں کے علمی و ادبی اور تصنیفی کارنامے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ دلّی کالج نے نہ صرف اردو علم و ادب کی لازوال خدمت کی بلکہ یہیں کے اساتذہ اور طلبہ میں سے وہ اصحاب نکلے جن کے نام آج اردو جاننے والے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ دلّی کالج کے چند ابتدائی معروف اور نامی گرامی اساتذہ میں مولانا مملوک العلی، مولوی امام بخش صہبائی، مولوی سبحان بخش، ماسٹر وزیر علی، ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال، بھیرو پرشاد، مولوی ذکاء اللہ، مولوی احمد علی، پنڈت رام کرشن، ماسٹر حسینی، میر ناصر علی، مولوی کریم الدین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح دلّی کالج کے بعض شہرت یافتہ فارغ التحصیل طلبا میں شمس العلما مولوی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی، شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد، شمس العلما مولوی ذکاء اللہ وغیرہ کے نام نامی شامل ہیں۔ اردو ادب کا شاید ہی کوئی قاری ایسا ہو جو مذکورہ ناموں سے شناسا نہ ہو۔ یہ وہ بزرگ شخصیات ہیں جن کی تحریریں ہماری زبان کا قابل فخر اور رہتی دنیا تک باقی رہنے والا سرمایہ ہیں اور جن کے احسانات سے اردو علم و ادب اور اس کے پڑھنے والے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔

مولانا مملوک العلی دلّی کالج میں مشرقی شعبے کے عربی مضمون کے صدر مدرس تھے۔ وہ عربی زبان کے جید عالم شمار ہوتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ فارسی اور اردو زبانوں میں بھی کمال کی مہارت رکھتے تھے۔ان تینوں زبانوں کے ہر قسم کے علم وفن سے وہ بخوبی واقف تھے۔فن ترجمہ نگاری پر بھی انھیں بھرپور دستگاہ حاصل تھی۔ پرنسپل دلّی کالج کے اصرار پر انھوں نے ''تحریر اقلیدس'' کا اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔یہ کتاب سوسائٹی اردو سے دو مرتبہ شائع ہوئی پہلی اور دوسری سن اشاعت 1844 پر مذکور ہے۔ یہ تحریر اقلیدس کے چہار مقالوں کا اردو ترجمہ ہے۔یہ ترجمے اب نایاب ہیں،اس لیے ان کے اردو اسلوبِ نگارش کے بارے میں رائی زنی کرنا بے سود ہے۔تذکرہ شعرائے عرب کے مصنف مولوی کریم الدین سے ان کی زمانۂ طالب علمی کی جودت طبع ،کیفیت استعداد کا حال معلوم ہوتا ہے جس کی بنا پر ان کے ترجموں کے بارے میں اونچی رائے قائم کرنا زیادتی نہ ہوگی۔دراصل مولانا مملوک العلی کی تصنیفی و تالیفی کام پر توجہ نہ دینے کی ایک بنیادی اور اہم وجہ دن رات کی درس و تدریسی مصروفیات تھیں۔البتہ نورالحسن راشد کاندھلوی کی تحقیق کے مطابق مولانا نے چند کتابوں کی تحقیق تصحیح ،ترجمہ اور تدوین وانتخاب کی خدمت بھی انجام دی ہے۔اس وقت تک مولانا کی چھے تالیفات وتراجم کا علم ہوا ہے جو تین مختلف موضوعات پر مشتمل ہے۔

(1) تصحیح سنن ترمذی (2) اردو ترجمہ سنن ترمذی
(3) تصحیح وحواشی تاریخ یمینی (4) کتاب المختار فی الاخبار والآثار
(5) ترجمہ اردو تحریر اقلیدس (6) نتیجہ تحریر

مولانا مملوک العلی کی علمی اور تخلیقی صلاحیتوں،ان کے مرتبے اور دلّی کالج میں ان کی مسلم حیثیت کے بارے سرسید ''آثار الصنادید'' کے باب چہارم میں کچھ یوں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اگرچہ چودہ پندرہ برس سے مدرسہ شاہجہاں آباد میں عہدہ مدرسی رکھتے تھے لیکن اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں کہ مدرسی اوّل ان سے عبارت ہے،انشاء نظم ونثر کی طرف کم توجہ ہے،اگر ایسا فاضل اس طرف بھی

متوجہ ہوتا تو یقین ہے کہ اس فن میں اپنے اقران و امثال سے ممتاز ہوتا۔"[1]

(نور الحسن راشد کاندھلوی، استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی، ص556)

سر سید احمد خان کے مذکورہ بالا اقتباس سے بھی یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اگر مولانا مملوک العلی تصنیف و تالیف کے کام کی طرف توجہ دیتے تو یقیناً اس فن میں بھی ان کا طوطی ضرور بولتا۔ جس کا اعتراف مولانا مملوک العلی کے عہد کے دانشوروں اور معاصرین نے جا بجا کیا ہے۔ مگر جیسا کہ مذکور ہوا ہے کہ دلّی کالج کے معمولات و مصروفیات اور گھر پر شاگردوں اور طالب علموں کا حصولِ علم کی خاطر شب و روز پڑے رہنا ان کی تصانیف و مؤلفات کے وجود میں نہ آنے کا سبب بنا۔ ان کی طبیعت بھی کبھی یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ کسی طالب علم کو رنجیدہ یا اس کی دل شکنی کریں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ مولانا نے جو کچھ بھی تحریر کیا ہے اس کا ماسوائے چند نمونوں کے کچھ بھی دستیاب نہیں ہے۔ ہمیں شکر بجا لانا چاہیے پاکستان کے نامور محقق محمد اکرام صاحب چغتائی کا جنھوں نے ان کے خطوط کی دریافت کی۔ یہ تمام خطوط اسپرنگر کے ذاتی کاغذات میں جرمنی کی شہرۂ آفاق لائبریری دیو تشے ستات ببلیوتھک (Deutshe Staatbbliothe) میں چھپے ہوئے پڑے تھے۔ محمد اکرام چغتائی نے اس لائبریری میں خاصا وقت گزارا، اسپرنگر کے سب کاغذات تفصیل سے دیکھے اور اس ذخیرہ میں حضرت مولانا مملوک العلی اور اس عہد کے ممتاز علماء اور مشاہیر کے جو خطوط موجود تھے ان کی نقول حاصل کیں اور پھر ان پر بہت محنت سے مفصل حاشیے لکھے۔ جس میں مکتوب نگاروں کے احوال، خطوط کے مندرجات کی تحقیق و تفصیل اور کثیر حوالے درج ہیں۔ اس کے بعد نور الحسن راشد کاندھلوی کی مزید تحقیق سے کچھ نئی باتوں کا علم ہوا۔ موصوف بھی ان خطوط کی حواشی لکھ چکے ہیں۔ جن میں چغتائی صاحب کی معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ البتہ چند اضافے اور تصحیح و ترمیم نور الحسن راشد کاندھلوی نے بھی کی ہے۔ مسرت کا مقام یہ ہے کہ مولانا مملوک العلی کے دس گرامی نامے دریافت ہوئے ہیں جن میں سے نو خطوط اردو میں ہیں جب کہ ایک خط عربی میں لکھا گیا ہے۔

مولانا مملوک العلی نے اردو کے یہ تمام خطوط دلّی کالج کے پرنسپل، اپنے اعلیٰ افسر، ایک

علم دوست شخصیت، اردو شناس اور معروف جرمن مستشرق اسپر نگر (ALOYS, SPREN GER) کو لکھے تھے۔ یہ خطوط کئی پہلوؤں سے اہم اور لائق مطالعہ ہیں۔ علاوہ ازیں یہ خطوط مولانا کی اردو کی بے تکلف ذاتی تحریر کا پہلا دستیاب نمونہ ہے۔ نور الحسن راشد کاندھلوی کے مطابق انہی خطوط کے ذریعہ سے مولانا کو کلکتہ سے ملازمت کی پیش کش کی گئی تھی۔ ان خطوط سے اس دور کی بعض نادر معلومات اور علمی سرگرمیوں کا علم بھی ہوتا ہے۔ ان خطوط پر راشد کاندھلوی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان خطوط سے جو ایک اور بڑی بات معلوم ہوتی ہے اور خاص رہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر اور بڑے علماء علمی بلکہ دینی معلومات میں بھی ذہنی تحفظات اور تعصب سے بہت دور تھے، وہ علمی کاموں میں ہر ایک کی بلا تأمل مدد اور رہنمائی فرماتے تھے اور جن کتابوں کے متعلق اندازہ ہوتا کہ ان کی اشاعت مفید اور ضروری ہے ان کے لیے ایسے غیر مسلم اور عیسائی اہل علم اصحاب کو بھی توجہ دلاتے رہتے تھے جو علمی دنیا میں سرگرم تھے اور ملک کے اعلیٰ طباعتی ادارے ان کی دسترس میں تھے اور یہ اعلیٰ مرتبت حضرات اپنے چھوٹوں کی ہر طرح سے مدد، ہمت افزائی اور تعاون کرتے رہتے تھے۔''2

(نور الحسن راشد کاندھلوی، استاذ الکل مولانا مملوک العلی، ص 261)

مولانا مملوک العلی دلّی کالج میں عربی کے معروف و ممتاز استادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے اعلیٰ مرتبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب دلّی کالج کے پرنسپل کو فارسی کے استاد کی تلاش ہوئی تو اس نے یہی کہا کہ فارسی میں ہمیں ایسا آدمی درکار ہے جیسے کہ عربی میں مملوک العلی ہے۔ مولانا دلّی کالج میں اس وقت کے قائم مقام پرنسپل ڈاکٹر اسپر نگر کے بہت قریبی تھے کیونکہ مولانا کی قابلیت و لیاقت سے کالج کا ہر فرد واقف تھا۔ ان دونوں حضرات نے 1848 میں کالج میں امتحانات کی بھاگ ڈور سنبھالی تھی۔ اس طرح ان دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بھی چلا تھا۔ البتہ تحقیق سے صرف مولانا کے ہی خطوط

ملے ہیں جب کہ اسپرنگر کے مولانا کے نام ابھی تک کسی خط کی تحقیق نہیں ہوئی ہے۔

محمد اکرام چغتائی نے جو نو خطوط دریافت کیے۔ان میں نورالحسن راشد کاندھلوی کی مزید تحقیق کے مطابق پہلے پانچ خطوط کی ترتیب، تاریخ تحریر اور مضمون کے لحاظ سے درست ہے، مگر اس کے بعد کے خطوط کی ترتیب صحیح نہیں۔ان کا ماننا ہے کہ مولانا مملوک العلی کے پیش نظر مکتوبات میں سے مکتوب نمبر 4 مکتوبہ 16 ر جولائی 1850 (6 ر رمضان 1266 ھ) سے مکتوب نمبر 8 تک جس کو چغتائی صاحب نے مکتوب نمبر 7 ر ستمبر 1850 (شوال 1266 ھ) قرار دیا ہے، کل چار خط ایسے ہیں جن میں کلکتہ کی ملازمت اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے۔ مگر غالباً ان خطوں میں سے ایک دو خطوں کی تاریخ تحریر میں کچھ غلطی ہوگئی ہے۔وہ خط جس کو چغتائی صاحب نے خط نمبر 6 قرار دیا ہے۔مکتوبہ 19 ر اگست 1850 (10 ر شوال 1266 ھ) وہ دراصل آٹھویں خط کی جگہ آنا چاہیے۔کیونکہ جو خط چغتائی صاحب نے آٹھویں نمبر پر درج کیا ہے وہ 5 ر ستمبر 1850 (27 ر شوال 1266 ھ) کا لکھا ہوا ہے اور چغتائی صاحب کی ہی تحقیق کے مطابق وہ تھارن ٹن (Thorienton) کے نام درخواست ملازمت ہے۔مکتوب نمبر 6 کی تاریخ تحریر 19 ر اگست 1850 (10 ر شوال 1266 ھ) میں کچھ غلطی ہے۔کتابت کی غلطی ہو اور یہ بھی غیر متوقع نہیں کہ خود مولانا مملوک العلی سے تاریخ غلط لکھی گئی ہو۔راشد صاحب کے مطابق اصل تاریخ 19 ر ستمبر یا 19 ر اکتوبر ہوگی۔آٹھواں خط ساتویں خط کا گویا ضمیمہ ہے۔ان خطوط کی ترتیب وتہذیب میں راشد کاندھلوی نے بڑا احتیاط انداز اختیار کیا ہے اور صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی حتی الامکان سعی کی ہے۔انھیں مکتوب نمبر 6 کی تاریخ کے غلط ہونے کا شبہ ہے اور جس کی انھوں نے کی وضاحت بھی کردی ہے۔

اب تک شاید ہی کوئی ادیب ایسا گزرا ہو جس نے یہ سوچ کر خط و کتابت کی ہو کہ بعد از مرگ اس کے لکھے گئے خطوط شائع ہوں گے۔اس لیے وہ خط لکھتے وقت اِن چیزوں کا خیال نہیں رکھتا ہے اور بے تکلفی سے مراسلہ تحریر کرتا ہے، ابھی تک عموماً ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اردو میں جن ادیبوں کے خطوط کو اہمیت ملی ہے ان میں خطوط غالب، غبار خاطر، انشائے بے خبر، انشائے سرور، خطوط اقبال، مکاتیب حالی، مکاتیب سرسید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان

مکتوب نگاروں نے بھی بے تکلفی سے خطوط لکھے تھے۔جب ان کے مکتوب شائع ہوئے تو ان کی نثر کو حد سے زیادہ پسند کیا گیا خصوصا خطوط غالب اور غبار خاطر کی نثر کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔مولانا مملوک العلی کے خطوط جن کو ابھی دریافت ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا ہے، بھی اسی بے تکلفانہ انداز میں تحریر کیے گئے خطوط کا ایک بے حد عمدہ نمونہ ہے۔مولانا کے ان خطوط کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہی خطوط کی بنیاد پر مولانا کو کلکتہ میں ملازمت کی پیش کش ہوئی تھی۔

مولانا مملوک العلی کے خطوط ان کی دیدہ وری کے ثبوت ہیں جن میں نہ کسی قسم کا کوئی تلخ یا طنزیہ کلام ملتا ہے، نہ بڑاپن کی کوئی علامت نظر آتی ہے اور نہ ہی ان میں لاچاری اور بے بسی اجاگر ہوتی ہے۔بلکہ مولانا کے ان خطوط سے ان کی نرم طبیعت، سادگی، مخلصی اور شگفتہ مزاج کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔مولانا کے ان خطوط کی اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان میں صرف مقصدی باتیں ہوئی ہیں اور غیر ضروری باتوں سے اجتناب برتا گیا ہے۔انھیں اس بات کا اچھا خاصا علم تھا کہ اس کے مکتوب الیہ کا کیا رتبہ یا مرتبہ ہے۔مولانا مملوک العلی نے اپنے مکتوبات میں نہ مکتوب الیہ کے مرتبے اور شان میں قصیدے لکھے ہیں اور نہ ہی ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔اگر موصوف چاہتے تو اپنی قابلیت کے بل بوتے پر انھیں ہر قسم کی آسائش نصیب ہوتی۔تاہم انھوں نے اپنا پورا قیمتی وقت طالب علموں اور شاگردانِ عزیز کے لیے وقف کر دیا۔مولانا نے یہ خطوط دلّی کالج میں اپنی ملازمت کے دوران لکھے ہیں۔ان کا پہلا دریافت شدہ خط 12/نومبر 1846 کا ہے تاہم آخری خط 19/اگست 1850 کا ملتا ہے جب ان کی مدتِ ملازمت ختم ہوگئی ہوتی ہے۔اس طرح مولانا کے مذکورہ خطوط پانچ سال کے دور کا احاطہ کرتے ہیں۔یہ وہ دور تھا جب دلّی میں مرزا اسداللہ خاں غالب کا طوطی بولتا تھا۔اس طرح غالب مولانا کے اہم معاصرین میں شمار ہوتے ہیں۔حالی کے مطابق غالب نے خطوط نگاری کا آغاز غالباً 1848 میں کیا ہے۔مولانا کے خطوط سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ انھوں نے غالب سے پہلے ہی خطوط لکھنے شروع کیے تھے۔تاہم غالب کے خطوط جدید اردو نثر کا آغاز کہے جاتے ہیں۔مولانا کا دلّی کالج میں لگ بھگ 1833 کے

قریب مدرس دوم کے طور پر تقرر عمل میں آیا تھا۔ بعدازاں مدرس اوّل ہوئے۔ جس کا ان کے تقریباً تمام خطوط میں ذکر آیا ہے۔ انھوں نے تقریباً چھبیس سال تک دلّی کالج میں ملازمت کی۔ مولانا مملوک العلی نے پہلا مکتوب1846 میں تحریر کیا۔ اس وقت ڈاکٹر اسپرنگر دلّی کالج کے پرنسپل تھے اور جب آخری خط لکھا تب اسپرنگر دوسری بار کالج کے پرنسپل بنے تھے۔ مطلب صاف ہے کہ مولانا نے اردو کے یہ سبھی خطوط اسپرنگر کے نام انہی کے زمانے میں تحریر کیے ہیں۔

ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ اگر اسپرنگر کے نام خطوط میں مولانا نے اسپرنگر کے علمی مقام اور منصب کی رعایت کرتے ہوئے مناسب کلمات استعمال کیے ہیں، مگر اس میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جس سے اسپرنگر کے غیر ضروری احترام، خوشامد، اسپرنگر کی برتری کا، اپنی کم مائیگی کا یا اس طرح کا کوئی اور احساس جھلکتا ہو۔ ان خطوط میں کئی اہم دینی وملّی، علمی وادبی، عالم فاضل مستشرقین شخصیات اور ناشرین کتب مثلاً مولوی محمد مظہر، شیخ لطف علی بن محمد حسن صدیقی، مولوی احمد علی، ہنری جوزف ٹیلر، مولوی اکبر علی، فریڈرک جان مواٹ، سید اشرف علی واسطی، سید محمود (نورالحسن راشد کاندھلوی کے مطابق غالباً سید احمد جو سرسید کے چھوٹے بھائی تھے)، تھارن ٹن، (راشد کاندھلوی کے مطابق غالباً Edward Thorlenton ہوگا جس نے ہندوستان کی تاریخ لکھی اور کئی گزیٹ بھی مرتب کیے)، حاجی رستم علی سوداگر، مولوی سیدالدین خاں وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ مذکورہ اہم شخصیات کے علاوہ مولانا نے بیشتر مکتوبات میں کئی مذہبی اور شہرۂ آفاق کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں ''کشاف اصطلاحات الفنون'' از قاضی محمد اعلیٰ تھانوی، ''بخاری شریف'' از مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، ''جامع ترمذی'' از مولانا احمد علی، ''تاریخ حلبی''، شیخ نورالدین علی بن ابراہیم بن احمد حلبی (راشد کاندھلوی کے مطابق صحیح ''سیرت حلبی'' ہے)، ''کتاب الآغانی'' از ابوالفرج اصبہانی وغیرہ بعض اہم اور قابل ذکر کتابیں ہیں۔ مملوک العلی کے مکتوبات میں جن مقامات کا سرسری ذکر آیا ہے اس میں خود مولانا کے وطن نانوتہ کا ذکر بھی ہے جس کی مناسبت سے وہ نانوتوی کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بنارس، دہلی (مولانا نے دلّی کالج میں چھبیس سال تک ملازمت کی)، مکہ مکرمہ

(مولانا کو 1844-1833 میں حج کی سعادت حاصل ہوئی) اور کلکتہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مولانا اپنے بعض مکتوبات میں مختلف مقامات کی آب و ہوا سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ مکتوب چہارم میں دلّی کی گرمی اور موسم کے بارے میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''ان دنوں دہلی میں گرمی بشدت ہے اور مہینہ رمضان کا شروع ہوا ہے، روزداروں کا چلنا پھرنا اور بات چیت کرنا دشوار ہے، اس جہت سے جواب اب تلک حاصل نہیں ہوا۔'' 3

(نورالحسن راشد کاندھلوی، استاذ الکل مولانا مملوک العلی، ص270)

چونکہ مملوک العلی کی دلّی کالج میں مدتِ ملازمت چھبیس برس کی رہی۔ جس کا انھوں نے خود بھی مکتوب پنجم میں ذکر کیا ہے۔ انھوں نے کلکتہ میں ملازمت کے لیے بھی درخواست دی تھی اور اس ضمن میں اعلیٰ افسران اسپرنگر اور فریڈرک جان مواٹ کی سفارش کے خواہاں بھی تھے، تاہم ان کی درخواست منظور نہ ہوئی۔ پانچویں خط میں وہ اسپرنگر کو کلکتہ جانے سے پہلے ہی موسم کی کیفیت اور اپنی طبیعت کے حال سے کچھ اس طرح واقف کراتے ہیں:

''احقر سب طرف سے بخیال معیت حضور کی خوش وخرم ہے، لیکن ایک امر موجب خلجان طبیعت کا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنے مزاج کا حال بیچ زبان آئندہ کے معلوم نہیں ہوتا، تو خوف اس امر کا ہے کہ مبادا بعد بھیجنے کلکتہ کے بسبب عدم موافقت آب وہوا کے یا کسی اور امر کے احقر کو وہاں کا روزگار چھوڑنا پڑے اور اس صورت میں روزگار مدرسہ دہلی کا کہ احقر کے واسطے بمنزلہ وطن ہو رہا ہے۔'' 4

(نورالحسن راشد کاندھلوی، استاذ الکل مولانا مملوک العلی، ص272)

اس کے علاوہ پانچویں مکتوب میں ہی ایک اور جگہ آب وہوا کی موافقت سے اس طرح آشکار کراتے ہیں:

''اور بدؤن مدت دو برس کے حال موافقت آب وہوا کا معلوم ہونا دشوار ہے۔ اس لئے کہ بدون رہنے ایک برس کے جو چار موسموں پر مشتمل ہے

اور ہر موسم کی ہوا کا مزاج جدا ہے، موافقت آب و ہوا کی مزاج سے معلوم نہیں ہوسکتی۔''5

(نورالحسن راشد کاندھلوی، استاذ الکل مولانا مملوک العلی، ص273)

متذکرہ بالا خط کے اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا مملوک العلی موسم کے تئیں کس قدر سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ دلّی میں قیام تھا تو وہاں کے موسم سے بھی احباب کو آشنا کراتے تھے اور کلکتہ جانے کی خواہش ہوئی تو وہاں کی آب و ہوا کا بھی اندازہ لگا لیتے و راس کی اپنی طبیعت سے موافقت و موزونیت دیکھتے تھے۔

مولانا مملوک العلی نے خطوط میں جن اہم شخصیات، کتب، مقامات اور اسفار کا ذکر کیا ہے۔ نورالحسن راشد کاندھلوی نے ان کے مکتوب کی تصحیح و ترتیب اور ترمیم کرتے وقت حواشی میں ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ مولانا کو کتابوں کی خوب پہچان تھی۔ ''کشاف اصطلاحات الفنون'' کو کسی قاموس کی اہمیت سے کم نہیں گردانتے۔ مولانا کے خطوں سے ان کے معاصرین، بعض رشتے داروں، پیشواؤں، ہم درسوں اور مقربین کا پتہ چلتا ہے۔ نیز انگریزی دانشوروں اور اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ ان کے تعلقات و مراسم کیسے اور کس نوعیت کے تھے اور یہ بھی کہ مستشرقین ان کی باتوں کا کس حد تک احترام کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ہمارے سامنے موجود ان کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔ انھیں حج کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔ جس کا مکتوب سوم میں پورا احوال بیان کیا ہے۔ مکہ میں مکاں مولدِ شریف کا نقشہ جس خوبصورتی سے کھینچا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ جس سے ان کی یادداشت کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ مختصر اقتباس دیکھئے:

''مکان مولدِ شریف کو جو احقر نے بچشم خود دیکھا ہے۔ بموجب اپنی یاد کے حقیقت اس کی عرض کرتا ہوں''6

(نورالحسن راشد کاندھلوی، استاذ الکل مولانا مملوک العلی، ص268)

مکتوب چہارم میں مولانا مملوک العلی مولوی اکبر علی کو کلکتہ کا سفر ایک ساتھ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس خط میں مولانا کلکتہ سفر کے اغراض بیان کرتے ہیں اور اس ضمن

میں وہ علی اکبر سے مفصل جواب کے متمنی نظر آتے ہیں۔ان مکتوبات سے مولانا کی بذلہ سنج طبیعت اور مخلصانہ شخصیت اور کتب وعلم کی شناسائی سے باور ہوجاتے ہیں۔مکتوب پنجم میں منشی اشرف علی کا ذکر آیا ہے جن کا دلّی میں پریس تھا جو بعد میں دلّی کالج میں منتقل ہوگیا اور اس کا نام مطبع العلوم ہوگیا تھا۔اس پریس میں مولانا مملوک العلی اور سبحان بخش شکار پوری کا بھی حصہ اور شراکت تھی۔مولانا کی ''تحریر اقلیدس'' (چار مقالے) اسی پریس سے شائع ہوئی تھی۔ مکتوب ششم میں تھارن ٹن کے نام ایک سال کی چھٹی کی درخواست بھیجی ہے اور ٹیلر صاحب اس کی سفارش کے متمنی ہیں۔اسی عرضی میں وہ ٹیلر صاحب کو یہ یقین دلا رہے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر چھٹی نہیں لے رہے اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ مدرسہ جیسا روزگار اور کہاں فراہم ہوسکتا ہے۔

مولانا مملوک العلی کے مذکورہ خطوط کا اسلوب داستانوی اسلوب سے قطعی الگ نہیں۔مولانا کے دور میں چونکہ کئی اہم داستان گو ان کے معاصر رہے ہیں جن میں میر امن اور رجب علی بیگ سرور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔مولانا کے مکتوب بھی داستانوی اسلوب سے ہی متاثر نظر آتے ہیں۔محمد اکرام چغتائی کی نظر ثانی اور ان پر حواشی تحریر کرنے کے بعد نورالحسن راشد کاندھلوی نے مزید ان خطوں میں تصحیح وترمیم نیز حواشی تیار کی ہے۔جس میں انھوں نے ہر چیز کی تفصیل بھی فراہم کردی ہے۔موصوف نے خطوں کو ترتیب دیتے وقت نفس مضمون کو جوں کا توں ہی رہنے دیا ہے چونکہ مولانا مملوک العلی کے خطوں کا استعمال شدہ املا اور طریقۂ تحریر اب بالکل اجنبی اور متروک ہے اس لیے راشد کاندھلوی نے پرانے املا کو ترک کر کے نئے املا کو روشناس کیا ہے۔

مولانا سوائے ایک خط (جس میں وہ مکتوب الیہ سے غریب پرور کہہ کر مخاطب ہوئے ہیں) کے باقی تمام مکتوبات میں مکتوب الیہ سے غریب پرور سلامت کہہ کر مخاطب ہوئے ہیں اور ہر خط کے اختتام میں یوں لکھتے ہیں، مملوک العلی، مدرس اول اور پھر سن اشاعت انگریزی اور ہجری دونوں میں تحریر کی ہے۔

اگر مولانا راشد کاندھلوی مولانا مملوک العلی کے خطوط میں متروک املا کی جگہ مروج املا کو نہ برتتے اور زبان وبیان کی سطح پر تصحیح نہ کرتے تو یقیناً ان مکتوبات میں برتی گئی زبان مسجع ومقفیٰ

اسلوب سے بوجھل ہو جاتی۔ جس کو مولانا راشد کاندھلوی نے خوش اسلوبی سے سادہ و پرکار زبان سے عبارت کر دیا ہے۔ لیکن انھوں نے خطوط کے نفسِ مضمون پر آنچ نہیں آنے دی ہے اور مولانا مملوک العلی کے خطوط میں استعمال مضمون کو بھی برقرار رکھا ہے ورنہ وہ خطوط نہ رہ جاتے۔ مولانا کے یہ خطوط پر تکلف انداز بیان کے عمدہ نمونے ہیں۔

مولانا مملوک العلی کے دس خطوط میں ایک خط عربی زبان میں ہے۔ جس میں بہت ساری باتیں منکشف ہوتی ہیں۔ انیسویں صدی میں مولانا کے تحریر کیے گئے یہ خطوط اردو مکتوب نگاری میں ایک اہم اور کارآمد اضافہ ہے۔

## حوالہ جات

(1) استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی، مصنف/ نورالحسن راشد کاندھلوی، ناشر/ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، یوپی، مارچ/2009

# اردو میں مومنؔ شناسی کی روایت

اٹھارویں اور انیسویں صدی کا دور مشترکہ طور پر اردو شعر و ادب کی تاریخ کا زرّیں اور روشن ترین دور کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ اس دور میں ہند کی سرزمین پر چند ایسے مشاہیرِ ادب نے جنم لیا جو ادبی دنیا کے اُفق پر چشمۂ آفتاب کی مانند چمکے۔ جن سے ادب کا چراغ ایسے روشن ہوا کہ آج بھی اردو کی نسلیں ان کے چھوڑے ہوئے سرمایے سے بہرہ مند ہو کر تابناکی اور روشن مستقبل کی ضامن بن رہی ہیں۔ ان مشاہیر میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، انیسؔ، اقبالؔ، آزادؔ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب ادب کی دنیا میں آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ میرؔ کو اردو شاعری کی آبرو، غالبؔ کو حیوانِ ظریف، مومنؔ کو شاعرِ مکر، انیسؔ کو شہنشاہِ مرثیہ، اقبالؔ کو شاعرِ مشرق اور آزادؔ کو امام الہند وغیرہ جیسے ناموں سے یاد کیا گیا۔ ان کے وسیع و وقیع علمی و ادبی سرمایے کی بنیاد پر آج بھی اہلِ علم و ادب انھیں اپنے قلم کی زینت بنا رہے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے شعور کی کارفرمائیوں کا ثبوت پیش کر کے مقامِ بالاتر سے فیض پاتے ہیں۔ ان شعرا کی ہمہ گیریت کا تذکرہ کیسے کیا جائے، اس کا ثبوت میرؔ شناسی، غالبؔ شناسی، مومنؔ شناسی، انیسؔ شناسی، اقبالؔ شناسی اور آزادؔ شناسی وغیرہ کے نتیجے میں آپ کے سامنے ہے۔ غرض یہ کہ "سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے"۔

ابھی تک میرؔ شناسی میں مولوی عبدالحق، علی سردار جعفری، نثار احمد فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی، کلب علی خاں فائق وغیرہ۔ غالبؔ شناسی میں حالی، مالک رام، عبدالرحمٰن بجنوری، امتیاز علی خاں عرشی، یوسف سلیم چشتی، پروفیسر نذیر احمد وغیرہ۔ انیسؔ شناسی میں شبلی، مسعود

حسین رضوی ادیب، ڈاکٹر علی جواد زیدی، صالحہ عابد حسین، مسیح الزماں، گوپی چند نارنگ، وغیرہ۔ اقبال شناسی میں غلام رسول مہر، آل احمد سرور، جگن ناتھ آزاد، خلیفہ عبدالحکیم، رفیع الدین ہاشمی، عبدالقوی دسنوی، عبدالحق، عبدالمغنی، بشیر احمد نحوی وغیرہ۔ آزاد شناسی میں عبدالقوی دسنوی، عبدالحق، ابوسلمان شاہ جہاں پوری، عبدالماجد دریابادی، خلیق انجم، سید عبداللہ، پیرزادہ منظور حسین وغیرہ شخصیات نے اپنی شناخت بنائی ہے۔

میر، غالب، انیس، اقبال، آزاد وغیرہ کو اردو دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ مومن شناسی کے حوالے سے متذکرہ بالا میں اس لیے بات نہیں کی گئی کیونکہ یہ زیرِ نظر مقالے کا بنیادی موضوع ہے اور اس پر بڑی تفصیل سے بات ہونی ہے۔ اس بات میں کوئی شک شبہ نہیں کہ مومن خاں مومن کی شہرت اور مقبولیت بھی بہت دور دور تک ہے۔ ان کا شمار بھی اردو ادب کے معماروں میں ہوتا ہے اور آئندہ بھی یہ مطالعے کا موضوع بنتے رہیں گے۔ مومن خاں مومن کی ولادت 1800 میں دہلی میں ہوئی اور 1852 میں انھوں نے اس جہاں فانی کو خیر باد کہا۔ اس طرح ان کی زندگی باوّن برس پر محیط رہی۔ جس میں انھوں نے چھتیس سال شعروشاعری پر صرف کر دیے۔ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا لیکن مومن کے حوالے سے بے اعتنائی اور ناانصافی برتی گئی اور مومن پر جتنا کام ہونا چاہیے تھا اُسے بھی لاأبالی پن کی بو آتی ہے۔ اس سے صرفِ نظر چند اہلِ قلم ایسے گزرے ہیں جنھوں نے مومن اور مطالعہ مومن میں خاصی دلچسپی دکھائی۔ مومن کی شاعری اور زندگی کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ مومن کی حق شناسی کسی حد تک ادا کرنے کی سعی کی گئی۔ مومن کی قدر شناسی کر کے ان حضرات نے مومن کو وہ مقام عطا کیا جس کے مومن صحیح معنوں میں مستحق تھے۔

مومن شناسی کے سلسلے کی بات کی جائے تو اس میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے بعد نیاز فتح پوری، عرش گیاوی، امیر حسن نورانی، حامد حسن قادری، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، کلب علی خاں فائق، ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ بھی اس فہرست میں قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کو مومن شناسی میں اوّلیت حاصل ہے۔ انھیں یہ اعزاز

1925 میں ''شرحِ قصائدِ مومن'' لکھ کر حاصل ہوا۔ ضیاء احمد بدایونی علی گڑھ یونی ورسٹی میں اردو اور فارسی شعبے کے صدر رہے ہیں۔ انھیں عربی، فارسی اور اردو پر کافی عبور حاصل تھا۔ ان کا شمار اپنے وقت کے مشہور عالم و فاضل اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ پروفیسر موصوف فارسی میں خاقانی اور اردو میں مومن کے قصائد سے خاص طور پر متاثر تھے۔ ان کا قول تھا کہ:

> ''مومن سے پہلے جس قدر شعرا گزرے ہیں قصیدے میں (بہ استثنائے سودا) کے مومن کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔''

مومن کے قصائد کی شرح لکھ کر انھوں نے پہلی بار اہلِ اردو کو مومن سے متعارف کرایا۔ مومن کے قصائد کو ترتیب دینا اور پھر اس کی شرح لکھنا کوئی عام بات نہیں تھی کیونکہ مومن کے قصائد میں غیر معیاری کاغذ کا استعمال اور کتابت کی غلطیاں وغیرہ موجود تھیں جو کہ پرانے دواوین کا خاصہ تھا، قصیدہ جیسی دشوار صنف کا تو ہمیں علم ہے ہی اور اس پر طرہ یہ کہ مومن کے مستزاد اندازِ بیان نے ان کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا تھا۔ مشکل قوافی اور نامانوس اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ رمل، جفر، طب، موسیقی کی اصطلاحیں بھی ان کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ ایسی صورت میں مومن کے قصائد پر صرف وہی شخص قلم اُٹھا سکتا تھا جو ان علوم پر دسترس رکھتا ہو اور ضیاء احمد بدایونی مرحوم کو ان سب علوم پر اچھی خاصی دسترس تھی۔ مومن سے عقیدت کے باوجود وہ اپنے تنقیدی منصب کو نہیں بھولے، بلکہ سب باتیں فراخدلی سے بیان کر دیں۔ اس شرح میں منتخب اشعار کی تفہیم و تعبیر پیش کی گئی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک نامکمل شرح ہے۔ لیکن جب لوگ مومن سے واقف ہی نہیں تھے اُس وقت اِس شرح کتنی اہمیت اور قدر و قیمت تھی اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے 1934 میں غزلیاتِ مومن کو مرتب کیا اور اس کی شرح لکھ کر دیوان کا نام ''شرحِ دیوانِ مومن'' رکھ لیا۔ یہ مومن پر ان کا دوسرا سب سے اہم کام ہے۔ جس میں انھوں نے بڑی محنت اور جاں سوزی کی ہے۔ ضیاء احمد بدایونی کے اس وقیع کام نے مومن کی اس شرح میں چار چاند لگا دیئے اور وہ لوگ جو مومن کے کلام سے ناآشنا تھے اس دیوان و شرح کی بدولت مومن کے کلام کی خوبیوں سے آشنا ہو گئے۔ جب ضیاء احمد کی کتاب مرتبہ و شرح ''دیوان مومن'' علامہ اقبال کو موصول ہوئی

تو اُنھوں نے 1934 میں ضیاء صاحب کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا:

"مجھے آپ نے مرتبہ دیوانِ مومن کا نسخہ ارسال فرمایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس کے مرتب کرنے میں نہایت جانفشانی سے کام لیا ہے۔ میں نے اس کی بدولت اپنی عمر میں پہلی بار کلام مومن کو پڑھا۔"

متذکرہ بالا میں اقبال ضیاء احمد بدایونی کو دادِ تحسین پیش کرتے ہیں لیکن سچائی یہ ہے کہ نہ صرف اقبال نے بلکہ نیاز فتح پوری، سید تمکین کاظمی، عرش گیاوی، خواجہ احمد فاروقی، عبدالحق وغیرہ مشاہیر نے ضیاء احمد بدایونی کے اس کام کی بہت سراہنا کی۔ "شرح قصائدِ مومن" اور "دیوانِ غزلیات مومن" کے علاوہ مومن پر ان کے کئی مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ جن میں "مومن پر ایک نظر"، "کلام مومن کا نفسیاتی مطالعہ"، "مثنویاتِ مومن"، "مومن کی طنزیہ شاعری" قابلِ ذکر ہیں۔ ضیاء احمد بدایونی کا مومن پر تحقیقی کام باقیوں کے لیے باعثِ تحریک ثابت ہوا جس سے مومن پر تحقیق کی راہ آسان ہوگئی۔

اس کے بعد مومن شناسی کی روایت کو نیاز فتح پوری آگے بڑھاتے ہیں۔ جنھوں نے 1928 میں اپنے مشہور زمانہ رسالہ "نگار" میں "مومن نمبر" شائع کر کے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ دراصل نیاز فتح پوری بھی ضیاء احمد بدایونی کی وجہ سے ہی مومن سے آشنا ہوئے تھے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ رسالے میں مومن کو ایک خاص جگہ دی۔ رسالہ "نگار" کا "مومن نمبر" پانچ مضامین اور 160 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل مضامین "کلام مومن پر طائرانہ نگاہ" (نیاز فتح پوری)، "مومن کی اردو شاعری" (سید امتیاز احمد)، "مومن کا تغزل" (مرزا جعفر علی خاں)، "موازنہ مومن و غالب" (عبدالباری آسی)، "انتخاب: کلام مومن" (نیاز فتح پوری) بہت اہم ہیں۔ اس خاص نمبر میں مومن کے عہد، سوانح، شاعری اور معاصرین وغیرہ غرض ہر پہلو پر مفصل روشنی پڑتی ہے۔ جب نیاز فتح پوری 1960 میں پاکستان چلے گئے تب پاکستان سے اس خاص نمبر کو چند اضافی مضامین کے ساتھ دوبارہ شائع کرایا۔ اس طرح

انھوں نے مومنؔ کو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پاکستان میں بھی زندہ رکھا۔ نیاز فتح پوری کا مومنؔ سے تعلق صرف ''مومنؔ نمبر'' پر ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ آگے چل کر انھوں نے مومنؔ پر کئی بیش قیمتی مضامین لکھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے مومنؔ کو ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید کردیا۔ نیاز فتح پوری کے مومنؔ پر لکھے گئے دیگر مضامین میں ''مومنؔ اور غالبؔ کی فارسی ترکیبیں''، ''مومنؔ کے قصائد''، مومنؔ کی شاعرانہ عظمت، غالبؔ و مومنؔ''، ''قصائدِ مومنؔ میں عنصر تغزل''، ''مومنؔ کی ہنرمندیاں'' وغیرہ شامل ہیں۔

مومنؔ نمبر کے پہلے مضمون ''مومنؔ کے کلام پر ایک طائرانہ نگاہ'' کا آغاز نیاز فتح پوری نے اس طرح کیا ہے:

> ''میرے سامنے اردو کے تمام شعراء، متقدین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میرؔ) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دے دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دونگا کہ'' مجھے کلیاتِ مومن دیدو اور باقی سب اُٹھالیجاؤ''۔

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیاز فتح پوری مومنؔ کے تئیں کن لفظوں میں اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ نیاز فتح پوری نے جن الفاظ سے مضمون کا آغاز کیا ہے، انھی الفاظ کا آخر پر استعمال کر کے مضمون کا اختتام بھی کیا ہے۔ اس سے لوگوں کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ آخر کیوں کر نیاز فتح پوری نے مومنؔ کو اس قدر اہمیت دی۔ جب قارئین اس مضمون کا مطالعہ کریں گے تو اُنھیں اس بات کا علم خود بہ خود ہو جائے گا۔

نیاز فتح پوری کے بعد سید ضمیر الدین عرشؔ گیاوی کی کتاب ''حیات مومنؔ'' تقریباً اسی دور میں منظر عام پر آئی۔ معید رشیدی نے اس کتاب کی تاریخ اشاعت 1347ھ مطابق 1928 لکھی ہے۔ جب کہ ''ضیاء احمد بدایونی: حیات اور کارنامے'' کی مصنفہ ڈاکٹر معین فاطمہ نے عرش گیاوی کا 11/ جولائی 1929 میں ضیاء صاحب کا ایک خط پیش کیا ہے جس کا ابتدائی جملہ یوں ہے ''میں ایک عرصہ سے حیات مومن لکھنے والا ہوں۔'' اس سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 1929 تک ''حیات مومنؔ'' نہیں لکھی گئی تھی۔ بہر حال یہ کتاب مومنؔ کی

حیات پر لکھی گئی ایک اچھی اور معتبر کتاب ثابت ہوئی ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرش گیاوی نے مذکوہ کتاب پر جو محنت صرف کی ہے۔اس نوعیت کا کام جنون کی سطح پر ہی انجام پاتا ہے۔عرش گیاوی کی تحقیق سے مومن سے متعلق بہت سارے پہلو روشن ہوجاتے ہیں۔انھوں نے حیاتِ مومن کے کئی اہم پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور انھیں زمانی اعتبار سے اس طرح ترتیب دیا ہے: خاندان ،وطن،صورتِ معاش، ولادت، نام اور تعلیم، نجوم اور شطرنج،علم نجوم اور رمل کا کمال،حلیہ اور وضع شادی،تعشق،استغنائی،تلمذ، بیعت اور عقائد،طرزِ غزل خوانی،تصانیف،اندازِ تحریر،طریقۂ اصلاح،تلامذہ اور ان کا کلام،موت، اولاد،تنقید کلام وغیرہ۔''حیاتِ مومن''تحقیق کے کئی در کھولتی ہے۔ضیاء احمد بدایونی نے عرش کو''فنافی المومن'' کہا ہے۔عرش گیاوی نے اپنی تحقیق میں دن رات ایک کی نیز کئی تکلیفیں برداشت کیں،لیکن اپنی تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔

عرش گیاوی کے بعد مومن شناسی کی فہرست میں امیر حسن نورانی کا نام اہم شمار کیا جاتا ہے۔انھوں نے 1957 میں'' مومن دہلوی حیات ،زندگی اور انتخاب کلام'' لکھ کر یہ کارنامہ انجام دیا۔یہ کتاب بھی مومن کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کا اہم اور موثر وسیلہ ثابت ہوئی ہے۔ظاہری بات ہے جو بھی نئ کتاب وجود میں آتی ہے،اپنے ساتھ کوئی نئ بات لے کر ہی آتی ہے۔اس کتاب میں بھی ایسی بہت ساری خوبیاں ہیں۔یہ کتاب کل 32 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کی فہرست عنوانات پر سرسری نظر ڈالی جائے تو اس میں مومن کی حالاتِ زندگی، ولادت اور تعلیم ،طب و نجوم کی تعلیم ،مومن دین دار، اخلاق و عادات، وضع لباس،عام حالات،وفات، شاعری کا شوق،تصنیفات،مومن کی شادی،انتخاب غزلیات اور متفرق اشعار شامل ہیں۔چھوٹی ہی سہی لیکن مومن پر عرش گیاوی کی یہ کوشش بہت بڑی ابتدائی کوشش تصور کی جاتی ہے۔

حامد حسن قادری نے 1957 میں''انتخاب دیوان مومن مع شرح وتنقید'' لکھ کر مومن شناسی کی روایت کومزید مضبوط کردیا۔ان سے پہلے ضیاء احمد بدایونی نے بھی مومن کے دیوان کی شرح لکھی تھی۔اس شرح میں اگرچہ حامد حسن قادری نے ضیاء صاحب کی شرح سے

بعض جگہوں پر اختلاف کیا ہے مگر ان کی شرح سے کافی حد تک استفادہ بھی کیا ہے۔ حامد حسن قادری کی شرح بھی ایک لحاظ سے مربوط شرح کے طور پر سامنے آئی۔

مومن خاں مومن پر سب سے زیادہ اور قابلِ تعریف کام ضیاء احمد بدایونی کے ہونہار سپوت پرفیسر ظہیر احمد صدیقی کا ہے۔ مومن اور مطالعہ مومن میں انھیں اختصاص حاصل تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ مومن کے ساتھ ان کی دلچسپی موروثی تھی۔ انھوں نے مومن پر آدھی درجن کتابیں تصنیف کر کے اپنے والدِ محترم سے بھی پیش قدمی کی۔ مومن شناسی میں ان کا نام سرفہرست رکھا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں۔ کیونکہ وہ زندگی بھر تن، من، دھن سے مطالعۂ مومن میں مصروف رہے۔ ظہیر احمد صدیقی نے مومن پر ''انتخابِ دیوانِ مومن: ترتیب و حواشی مع مقدمہ'' (1958)، ''قصائدِ مومن'' (1960)، ''مومن شخصیت اور فن'' (1972)، ''انشائے مومن'' (1977)، ''مومن خاں مومن'' (1985) اور'' دبستانِ مومن'' (1996) وغیرہ کتابیں لکھی ہیں۔ ''انتخاب دیوان مومن مع شرح'' چونکہ ان کے والدِ محترم نے بھی تصنیف کی تھی۔ لیکن ظہیر احمد صدیقی کے بقول اب نہ الناظر پریس رہا اور نہ ان کی مطبوعات۔ جب ضیاء احمد بدایونی کی شرح چھپی تو وہ ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور جب کتاب بالکل مفقود ہوگئی تب انھوں نے اس موضوع پر دوبارہ قلم اُٹھایا۔ اس شرح میں انھوں نے ضیاء احمد بدایونی کی شرح سے کافی حد تک استفادہ کیا ہے۔ اس کے مقدمے میں انھوں نے مومن کی شعری عظمت اور خصوصیات بیان کی ہیں۔ شرحِ قصائد مومن کے وجود میں آنے کا سبب بھی ضیاء صاحب کی شرح کا مفقود ہونا ہے۔ مومن کے قصائد کی تفہیم و تعبیر میں بھی فن کاری کا مظاہرہ پیش کیا گیا ہے۔ اس شرح کا ''دیباچہ'' ظہیر صاحب نے ''تعارف'' پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اور ''پیش لفظ'' ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے۔ کتاب کے تعارف میں پروفیسر رشید احمد صدیقی یوں رقمطراز ہیں:

> ''ظہیر احمد صدیقی یقیناً ہماری تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مومن کے قصائد کی مستند شرح لکھی۔ مستند اس لئے کہتا ہوں کہ ان کے پیش نظر وہ شرحیں بھی رہی ہیں جو ان کے والدِ محترم مولانا ضیاء احمد بدایونی صاحب

نے وقتاً فوقتاً تصنیف فرمائی ہیں۔فارسی اور اردو ادب پر بالعموم اور مومنؔ
کے جملہ اصناف پر بالخصوص مولانائے ممدوح کی جو نظر ہے اس پر جتنا کام
موصوف نے کیا ہے وہ میری ہی نہیں میرے جیسے دوسروں کی بھی تعریف و
تعارف سے مستغنی ہے۔''

(قصائدِ مومن اردو مع شرح از ظہیر احمد صدیقی،ص11)

ظہیر احمد صدیقی کو علی گڑھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تھا۔وہاں انھوں نے اپنی لیاقت اور صلاحیت کے بل بوتے پر پروفیسر موصوف کی قربت حاصل کی تھی۔''مومن شخصیت اور فن'' ظہیر احمد صدیقی کی تیسری کتاب ہے جو ان کے پی۔ایچ۔ڈی تحقیقی مقالے کا موضوع بھی تھا۔یہ کتاب چھے ابواب پر مشتمل ہے۔اس کا پہلا باب ''سیاسی،سماجی اور ادبی پس منظر'' دوسرا باب ''حیات وسیرت''،تیسرا باب ''مومن کی اردو شاعری''،چوتھا باب ''فارسی تصانیف'' پانچواں باب ''مومن تنقید کی نظر میں'' اور چھٹا باب ''اردو شاعری میں مومن کا مقام'' کے عنوان سے ہے۔یہ کتاب ہندوستان کی مختلف یونی ورسٹیوں کی نصابی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ظہیر احمد صدیقی کی چوتھی کتاب ''انشائے مومن'' مومنؔ کے فارسی خطوط،تقریضوں،دیباچوں اور خطبات پر مشتمل ہے۔ ''مومن خاں مومن'' کے نام سے انھوں نے ساہتیہ اکادمی کے لیے مونوگراف لکھا ہے۔اس کے علاوہ ان کی آخری کتاب ''دبستانِ مومن'' انجمن ترقی اردو (ہند)،دہلی سے شائع ہوئی ہے اس کتاب میں انھوں نے مومنؔ کے 44 تلامذہ اور ان کے منتخب اشعار کا حوالہ دیا ہے۔ ایک طرح سے اس کتاب کو تذکرے کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی ہے اور مومنؔ کے تلامذہ کا تحقیقی مطالعہ کی حیثیت بھی۔مومنؔ پر ظہیر احمد صدیقی کے لکھے گئے مضامین ملک و بیرون ملک کے کئی نامور رسائل و جرائد میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ان مضامین میں ''مومنؔ اور اقبال''، ''مومن کی حیات معاشقہ''،''مومن کے ناقدین''،''مومن خاں مومن''،''مومن کے تلامذہ'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔بحیثیتِ مومنؔ شناس ظہیر احمد صدیقی کا نام ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

کلب علی خاں فائق کا نام بھی ماہرین مومنیات میں تصور کیا جاتا ہے۔1959 میں ان کا مومن پر ایک مضمون لاہور کے اورینٹل کالج میگزین میں ''حیات مومن'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔94 صفحات پر مشتمل یہ مضمون تحقیقی نوعیت کا ہے جس میں ممکنہ حوالوں کی روشنی میں مومن کی حالاتِ زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس میں خاندان، شجرۂ نسب، ولادت، نام، ابتدائی تعلیم، تحصیل طب، علم نجوم، شطرنج، موسیقی، تعویذ نویسی، حیات معاشقہ، آغاز شاعری، عقائد اور بیعت، مشرب، مجلسی زندگی، سیاست، تصانیف، بیویاں اور اولاد وغیرہ ذیلی عنوانات کے تحت متعدد مآخذ کی نشاندہی کرتے ہوئے تفصیلی طور پر حیاتِ مومن کے مختلف پہلوؤں کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔انھوں نے متعدد سوالات قائم کر کے مقالے کا آغاز کیا ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلب علی خاں فائق نے مومن کی حالاتِ زندگی کا بڑی سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے۔کلب علی خاں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے مومن کے 38 تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ مومن کے خاندان کا شجرۂ نسب بھی تیار کیا ہے جس کو بعد میں ظہیر احمد صدیقی نے مرتب کیا۔

کلب علی خاں فائق کے بعد ماہر مومنیات کی فہرست میں اردو کے مشہور ادیب اور ناقد ڈاکٹر عبادت بریلوی کا نام آتا ہے۔جنھوں نے ''دیوان اردو مومن''، ''کلیات مومن (1960) اور ''مومن اور مطالعہ مومن'' (1961) جیسی اہم کتابیں لکھیں۔انھوں نے ''مومن اور مطالعہ مومن'' دل جمعی اور صراحت کے ساتھ تصنیف کی ہے۔عبادت بریلوی نے مومن پر اس سے پہلے شائع شدہ کتابوں سے استفادہ کرنے کا اعتراف بھی کیا ہے۔اس طرح مومن سے متعلق انھوں نے ایک عمدہ خاکہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔''مومن اور مطالعہ مومن'' سات ابواب پر مشتمل ہے جو مومن کی حیات اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے ابواب کی تفصیل اس طرح ہے: ''حالات''، ''شخصیت''، ''ماحول''، ''تصانیف''، ''غزل''، ''مثنویاں'' اور ''اہمیت'' (مومن پر مختلف مصنفین کی آرا)۔518 صفحات پر مشتمل عبادت بریلوی کی کتاب مومن اور مطالعہ مومن سے مومن کی شخصیت اور شاعری کے سبھی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔یہاں پر ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ ضیاء احمد بدایونی،

عرش گیاوی اور عبادت بریلوی نے مومن کے حالات مرتب کرنے میں براہِ راست ان کے خاندان کے کچھ افراد سے رابطہ کیا تھا جس سے انھیں کافی حد تک ٹھوس حقائق سامنے لانے میں کامیابی ملی تھی۔

''مومن دہلوی'' کے نام سے اردو اکادمی حیدرآباد سے 1960 میں سید تمکین کاظمی کی کتاب شائع ہوئی۔ یہ کتاب راقم کو کہیں سے بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ اس لیے اس پر کسی قسم کی رائے زنی نہیں کی جا سکی۔ جب یہ کتاب دستیاب ہوگی تب اس کے حوالے سے بات کی جائے گی۔ مومن کی کلیات ''کلیات مومن'' کے نام سے ڈاکٹر مسیح الزماں نے 1971 میں الہ آباد سے شائع کی جس کے ناشر رام نرائن لال بینی مادھو ہے۔ 471 صفحات کی اس ضخیم کلیات میں مومن کا پورا کلام موجود ہے۔ آغاز میں ڈاکٹر مسیح الزماں نے سولہ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے جس میں انھوں نے مومن کی حیاتِ زندگی پر سرسری اور خدمات پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ مقدمے میں انھوں نے مومن کے کلام میں طرزِ تاسخ کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ کلیاتِ مومن قصائد، غزلیات، مثنوی، واسوخت، مقطعات، فردیات، متفرقات وغیرہ کا مجموعہ ہے جس کو مسیح الزماں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے مرتب کیا ہے۔

1965 میں محمد منظور احمد نے اردو مجلس حیدرآباد سے ''یادگارِ مومن'' کے نام سے مومن پر ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب تک میری رسائی نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر انوار الحسن نے بھی ''دیوان مومن'' کو فروری 1971 میں ترتیب دیا۔ انھوں نے مقدمے میں مومن کی حالات، شخصیت اور کلام کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے، اس کے بعد مومن کے کلام کو قرینے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ''حکیم مومن خاں مومن: شخصیت اور شاعری'' (2003) اکرام بریلوی کی کتاب ہے۔ اس تک بھی میری رسائی نہ ہو سکی۔ لیکن موضوع سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہ اس میں مومن کی شخصیت اور شاعری کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ پروفیسر توقیر احمد خاں نے دہلی اردو اکادمی کے لیے ایک مونوگراف ''مومن خاں مومن'' (2007) لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے مومن کے عہد، اس کے آباو اجداد، ولادت، تعلیم و تربیت، مختلف علوم میں مہارت، وضع قطع، رہائش گاہ، عقائد، معاش، معاشقے، سیر وسفر، ازدواجی زندگی، وفات، تصانیف، شاعرانہ عظمت،

انتخاب کلام وغیرہ جیسے موضوعات پر بات کی ہے۔نو جوان اسکالر معید رشیدی نے ''مومن خاں مومن: حیات اور مطالعاتی ترجیحات'' کے عنوان سے ایک اچھی کتاب لکھی ہے۔جس میں انھوں نے مومنؔ پر اب تک لکھے گئے تذکروں اور کتابوں پر ایک سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اپنی تنقیدی کاوش کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔اس کتاب کے بنیادی طور پر تین ابواب ہیں، ابتدا میں پیش نامہ لکھا گیا ہے۔اس کا پہلا باب ''تذکرے،سوانح اور تاریخ''، دوسرا باب ''تحقیق: مسائل اور صورت حال'' تیسرا باب ''تنقید: رویے اور ترجیحات'' پر مشتمل ہے۔ آخر میں کتابیات اور اشاریہ مصنفین کا اندراج ہے۔مجموعی طور پر معید رشیدی کی کتاب مومنؔ شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

متذکرہ بالا ماہرینِ مومنیات کے علاوہ مومنؔ پر متعدد حضرات نے کتابیں اور مضامین لکھ کر اس فہرست میں اپنا نام شامل کرالیا ہے۔عزیز یار جنگ کی کتاب ''مومن و غالب'' مجز سہسوانی کی کتاب'' موازنۂ مومن و غالب'' وقار عظیم کی کتاب'' انتخاب مومن مع دیباچہ'' فضل الرحمٰن نعیم کی کتاب'' مومن خاں مومن'' قاضی عبدالودود کی کتاب'' انتخاب مومن'' عارف ہسوی کی کتاب''مومنؔ'' محمد رفیع صدیقی کی کتاب'' جواہرات مومن''،''مومن خاں مومن: ایک مطالعہ'' از شاہد ماہلی'' انتخاب کلام مومن'' از محمد حسن عسکری وغیرہ جیسی کتابیں مومنؔ شناسی کی فہرست میں شامل ہوتی ہیں۔اس طرح مومن خاں مومنؔ پر وقتاً فوقتاً کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں جن سے اردو زبان میں مومنؔ کی حیثیت مسلم اور شناخت مستحکم ہوگئی۔

# کتابیات


1۔ حیات مومن، عرش گیاوی، دریبہ کلاں، دہلی۔1347ھ

2۔ مجموعہ قصائدِ مومن مع شرح، ضیاء احمد بدایونی، الناظر پریس، لکھنؤ۔1925

3۔ انتخاب دیوانِ مومن مع شرح، ضیاء احمد بدایونی، شانتی پریس، الہ آباد۔1934

4۔ مومن دہلوی: حالاتِ زندگی، امیر حسن نورانی، راجہ نول کشور بک ڈپو، لکھنؤ۔1957

5۔ انتخاب دیوان مومن مع شرح، حامد حسن قادری، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔1957

6۔ انتخاب دیوانِ مومن مع شرح، ظہیر احمد صدیقی، سر سید بک ڈپو، علی گڑھ۔1958

7۔ قصائدِ مومن اردو مع شرح، ظہیر احمد صدیقی، ادارۂ فروغِ اردو، لکھنؤ۔1960

8۔ مومن اور مطالعۂ مومن، عبادت بریلوی، اردو دنیا، کراچی۔1961

9۔ کلیاتِ مومن، مسیح الزماں، رام نرائن لال بینی مدھو، الہ آباد۔1971

10۔ مومن شخصیت اور فن، ظہیر احمد صدیقی، دہلی یونی ورسٹی، نئی دہلی۔1972

11۔ احساس و ادراک، ظہیر احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔1981

12۔ دبستانِ مومن، ظہیر احمد صدیقی، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی۔1996

13۔ مومن خاں مومن، ڈاکٹر تو قیر احمد خاں، اردو اکادمی، دہلی۔2007

14۔ مومن خاں مومن: ایک مطالعہ، شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔2008

15۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر معین فاطمہ، ناشر مصنفہ۔2011

16۔ مومن خاں مومن: حیات اور متالعاتی ترجیحات، معید رشیدی، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، نئی دہلی۔2013


# رسائل و جرائد


1۔ مومن نمبر (ماہ نامہ نگار)، جلد نمبر 13، شمارہ نمبر 1، جنوری 1928

2۔ مومن نمبر (ماہ نامہ نگار)، تیسرا ایڈیشن مع اضافہ، پاکستان، 1928

3۔ اورینٹل کالج میگزین (سہ ماہی)، جلد نمبر 36، شمارہ نمبر۔۔1959


☆☆☆

# سرسید کے سماجی افکار کی عصری معنویت

روشن خیالی، وسیع النظری، اولوالعزمی اور علم وعمل میں سرسید احمد خاں کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ ایک بڑے مصلح اور سماجی مفکر تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی ہندوستانی قوم وملت کی سماجی فلاح و بہبودی کے لیے وقف کردی۔ سرسید کے تعلیمی افکار ہوں یا سیاسی افکار، مذہبی افکار ہوں یا سماجی افکار، سے نہ صرف ان کے عہد میں انقلاب رونما ہوا بلکہ موجودہ عہد بھی اُن کے بالغ نظر افکار کی معنویت سے متاثر نظر آتا ہے۔ سرسید جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں جن کے اہم افکار کی لوگ ہمیشہ پیروی کرتے آئے ہیں۔ سرسید احمد خاں مختلف النوع شخصیت کے مالک ہیں۔ جن کی ایک جہت سماجی افکار سے متعلق ہے۔ یہ وہ جہت ہے جو سرسید کے تمام پہلوؤں، نظریات، تحریکات اور سماجی سرگرمیوں سے روشن ہوجاتی ہے۔

سرسید نے اپنے تعلیمی، سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی، مذہبی اور سماجی افکار وخیالات سے پورے ہندوستان میں سنسنی پیدا کردی تھی، ان کی عملی کاوشوں سے سماج کا ہر فرد متاثر نظر آیا۔ انھوں نے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں پر اپنے تعلیمی اور سماجی تحریکات کے اثرات مرتب کیے۔ سرسید کے کچھ معاصرین ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ان کے افکار کی تائید کی اور بعض معاصرین ایسے ہوئے جنھوں نے سرسید کے تعلیمی، سیاسی، سماجی نیز دیگر معاملات اور افکار کی سخت مخالفت کی۔ سرسید کے مخالفین ہندوؤں میں بھی موجود تھے اور مسلمانوں میں بھی، لیکن ان کے حوصلے کبھی پست نہیں ہوئے۔ سوامی دیانند سرسوتی سے سرسید کے گہرے مراسم تھے جو آریہ سماج کے بانی کہلاتے ہیں۔ دیانند سرسوتی وہ شخصیت تھی جس نے ستیارتھ پرکاش

جیسی کتاب لکھی جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوئی۔مگر سر سید نے اُن کی موت پر بھی اچھے کلمات کہے اور اُنھیں نیک درویش صفت آدمی قرار دیا۔راجہ شیو پرساد جو سر سید کے بڑے معترضین میں شمار ہوتے ہیں۔اردو ہندی، سنسکرت اور فارسی کے جید عالم تھے،ان کے بھی سر سید کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔البتہ جب سر سید نے ورنا کیولر سوسائٹی کی بات کی تو راجہ شیو پرساد نے ان کی سخت مخالفت کی تھی،لیکن جب راجہ شیو پرساد کا انتقال ہوا تو سر سید نے سائنٹفک انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا اور لکھا کہ ایسے مشہور اور نامی لوگوں کا دنیا سے اٹھ جانا بلاشبہ افسوس اور رنج کا مقام ہے۔یہ سب باتیں اس لیے اہمیت رکھتی ہیں کہ اِن سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ سر سید نے کبھی کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھا بلکہ ان کے خیالات اپنے دوستوں اور دشمنوں دونوں کے تئیں یکساں تھے۔دراصل وہ ایک سماجی ریفامر کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔

سر سید احمد خاں کا ذہن پہلے سے بیدار تھا۔انھوں نے کم عمری میں ہی لکھنا شروع کیا تھا۔تاہم انگلستان جانے کے بعد ان کے خیالات میں جدت آ گئی۔ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مغربی ممالک کی خوشحالی کا راز دراصل تعلیمی بیداری، سائنس و ٹکنالوجی اور اقتصادی ترقی میں مضمر ہے۔انگلستان سے لوٹنے کے بعد انھوں نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔دراصل سر سید کے مذکورہ افکار و خیالات کے پسِ پشت سماجی اور مسلم قوم کی پسماندگی پنہاں تھی۔انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اونچے اور درمیانہ طبقوں کے تباہ حال مسلمان جب تک باپ دادا کے کارناموں پر شیخی بھگارتے رہیں گے نیز انگریزی اور مغربی علوم سے نفرت کرتے رہیں گے، اُس وقت تک وہ بدستور ذلیل و خوار ہوتے رہیں گے۔ان کو کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کو اس کم تر سوچ اور ذہنی پسماندگی سے باہر نکالنے کا واحد راستہ اُنھیں انگریزی و مغربی علوم و فنون سے آراستہ کرنا ہے۔یورپ سے آنے کے بعد سر سید زندگی بھر اسی جدوجہد میں مصروف نظر آئے۔مزید اسی مقصد کو مدنظر رکھ کر انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی سنگِ بنیاد بھی رکھی۔سر سید احمد خاں مسلمانوں کو تعلیمی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر دیگر مغربی اقوام کی طرح ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔پروفیسر صغیر افراہیم

کا یہ اقتباس ان خیالات کی تائید کرتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''انھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ وقت تشدد کا نہیں، امن اور بھائی چارے کا ہے اور قوم کو ہر اعتبار سے مضبوط بنانے کے لیے حصولِ علم لازمی ہے۔ وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ ترقی کی بیش تر راہیں سائنسی و استدلالی نظریات سے ہو کر گزرتی ہیں لہٰذا بے حد معتدل اور متوازن انداز میں انھوں نے اپنے لائحۂ عمل کو مرتب کیا۔ سرسید کی طرح ان کے احباب کو بھی مشرق کی علمی روایات بہت عزیز تھیں اس لیے سبھی نے اپنے مضامین، مقالات، خطبات اور مکتوبات میں مسلمانوں کے گزشتہ علوم وفنون کی عظمت کا احساس دلایا اور یہ بھی واضح کیا کہ اُن کی توقیر کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے جدید طرزِ تعلیم کے حامل تھے۔ بانیانِ علی گڑھ نے قوم کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ آج کا تقاضا ہے کہ ہم بھی اپنے عصر کے تناظر میں جدید طرزِ تعلیم سے مستفید ہونے کی کوشش کریں اور ایک بار پھر ترقی یافتہ قوموں میں شمار ہوں۔''

(سہ ماہی ادب سلسلہ، جلد 1، شمارہ 1، ص 13)

اس اقتباس سے بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ سرسید مسلمانوں کو زندگی کے شعبے میں آگے بڑھتے دیکھنا چاہتے تھے اور بعد میں اسی سوچ اور فکر کی نشوونما ان کے رفقاء میں بھی پیدا ہوئی۔ سرسید یقیناً ایک عوامی مفکر تھے۔ وہ اپنے خیالات اور علمی کاوشوں سے نہ صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے لیے سوچتے تھے بلکہ ہندوستانی عوام کو مکمل طور پر خوشحال دیکھنا چاہتے تھے۔ سرسید کے یہی افکار انھیں سماجی مفکرین میں شمار کرتے ہیں۔ سرسید نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس میں وہ سائنسی مضامین کو خاص طور پر ترجیح دیتے رہے۔ سائنسی مضامین کی اشاعت کی وجہ بھی دراصل مسلمانوں میں سائنسی فکر کو عام کرنا تھا۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے لیے سائنسی مضامین ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے قلم کار لکھتے تھے اور اس کے قارئین بھی ہر مذہب کے تھے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس رسالے کو

کسی خاص طبقۂ فکر تک محدود نہیں رکھا گیا تھا۔سرسید متعصب فکر کے حامل شخص نہیں تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ہندو مسلم مساوات اور بھائی چارگی کے لیے کام کیا۔ان کے مطابق:

"میری یہ سمجھ ہے کہ ہندوستان میں دو قومیں ہندو اور مسلمان ہیں اگر ایک قوم نے ترقی کی اور دوسری نے نہ کی تو ہندوستان کا حال کچھ اچھا نہیں ہونے کا۔ بلکہ اس کی مثال ایک کانڑے آدمی کی سی ہوگی۔لیکن اگر دونوں قومیں برابر ترقی کرتی جاویں تو ہندوستان کے نام کو بھی عزت ہوگی اور بجائے اس کے کہ وہ ایک کانڑی اور بڈھی بال بکھری، دانت ٹوٹی ہوئی بیوہ کہلاوے، ایک نہایت خوبصورت، پیاری دلہن بن جاوے گی۔"

(مشمولہ سہ ماہی "ادب سلسلہ" جلد1، شمارہ3، ص19)

مندرجہ بالا اقتباس اخبار "سائنٹفک سوسائٹی" کے 3 رجون 1873 کے اداریے سے لیا گیا ہے۔اس اداریے سے سرسید کی دوراندیشی، ذہانت، بے مثال افکار اور دانشورانہ خیالات کی مثال دی جا سکتی ہے۔تعلیم اور اصلاحِ معاشرہ کے علاوہ سرسید کا سب سے بڑا کام سماجی مساوات پیدا کرنا تھا۔سرسید نے بلا کسی تفریق و امتیاز کے ہندوستان کے بھی شہریوں کی ترقی کے لیے سوچا اور اس ضمن میں کوشاں ہوئے۔سرسید بالآخر اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اس کی جیتی جاگتی مثال ہے جہاں کسی مخصوص ریاست ہی کے لوگ تعلیم سے فیض یاب نہیں ہوتے بلکہ ہندوستان کی ہر ریاست یہاں تک کہ بیرون ممالک سے بھی لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے کی غرض و غایت سے آتے ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے ہر شہری کو سرسید کا احسان مند ہونا چاہیے جنھوں نے ملک میں سب سے پہلے تعلیمی تحریک شروع کی۔اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو بلاشبہ ہندوستان کی ایک بڑی آبادی تعلیمی اعتبار سے قابلِ رحم ہوتی۔سرسید ایک عظیم سماجی مفکر تھے۔ان کے مختلف موضوعات سے متعلق افکار آج بھی اہمیت رکھتے ہیں۔توہینِ رسالت، جہاد، جنسی مساوات، رواداری، آزادی اور لبرل اقدار جیسے موضوعات پر سرسید کے مضامین محققین کے لیے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

سرسید مسلمانوں کی تعلیم کے لیے بہت سنجیدہ تھے۔ اس پر انھیں کچھ نام نہاد سیاست دانوں اور سماجی کارکنوں نے طنز بھی کیا تھا کہ سرسید ہندوستان کے لیے نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کے لیے سوچتے ہیں۔ بلاشبہ سرسید مسلمان قوم کے لیے لکھتے تھے لیکن وہ حضرات یہ بھول گئے تھے کہ ان کی کتابیں بھی ہندی میں ہندو مذہب کی تبلیغ واشاعت کے ضمن میں چھپ رہی تھیں۔ مدرسوں اور تعلیمی درس گاہوں کی تعمیر بھی سرسید کے سماجی افکار میں شامل ہے۔ان کی خواہش تھی کہ ہماری قوم کا بچہ بچہ دینی اور عصری وجدید علوم وفنون سے روشناس ہو سکے۔ان کا معروف قول ہے''ایک ہاتھ میں سائنس ہو اور ایک ہاتھ میں قرآن اور سر پہ لا الہ الا اللہ کا تاج ہو''۔ان افکار و شواہد کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ سرسید اپنے مشن اور قوم کے لیے کتنے سنجیدہ اور مخلص تھے۔ ان افکار اور شواہد کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کی اہمیت اس عہد میں بھی مسلم ہے۔

# داغؔ کی مثنوی نگاری
# فریادِ داغ کی روشنی میں

نواب مرزا خاں داغ دہلوی دبستانِ دہلی کے آخری نمائندہ شاعر قرار پائے ہیں۔ انھیں فخرِ ہندوستان، زبان اردو کے روحِ رواں، شاعری کا گوہر شب چراغ جیسے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ خانی و بہادر، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک بہادر، بلبلِ ہندوستان اور جہانِ استاد کے خطابات سے بھی داغؔ کو سرفراز کیا گیا۔داغؔ بدھ کے دن 25 مئی 1831 کو دہلی کے محلے چاندنی چوک میں وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم کے بطن سے پیدا ہوئے۔بعض کہتے ہیں کہ داغؔ کا اصلی نام ابراہیم تھا اور شادی کے بعد وہ نواب مرزا کے نام سے مشہور ہوئے۔ان کے والد کا نام شمس الدین احمد خاں تھا۔جب داغؔ کے والد کا انتقال ہوا اُس وقت داغؔ کی عمر ساڑھے چار سال تھی۔

داغؔ دہلوی پیدائشی شاعر تھے اس لیے ابتدا ہی سے مشاعروں میں ان کو داد ملنے لگی تھی۔انھوں نے فنی اختصاص، شیوۂ گفتار اور زبان و بیان پر بے پناہ قدرت کے بل بوتے پر نہ صرف اپنے عصر کو اپنا ہم نوا بنایا بلکہ اُسے نئی سمت اور نئی رفتار عطا کی۔سچا پن اور فطری پن ان کی شاعری کا خاصہ تھا۔وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز، صاحب طرز غزل گو اور استاد شاعر تسلیم کیے جاتے تھے۔داغؔ نے اپنے انتقال کے بعد اپنے شاگردوں کی کثیر تعداد چھوڑی جو ایک شمار کے مطابق پانچ ہزار سے بھی زیادہ تھی۔

داغؔ کے شعری امتیازات پر غور کریں تو اردو زبان کے روزمرہ اور محاورے پر

بے پناہ قدرت، لب و لہجے کا فن کارانہ استعمال، نشاطیہ آہنگ، تیکھا پن، شوخی، عاشق کا اپنی اہمیت پر اصرار اور معشوق کا بے جھجک ہونا، شاید ان کی شاعری کی نمایاں ترین صفات قرار پائیں۔
یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوسری اصناف کے نمونوں کی موجودگی کے باوجود داغؔ کی شاعری کا بڑا سرمایہ وہی ہے جو ہمارے سامنے غزل گوئی کی صورت میں موجود ہے۔ کیونکہ داغؔ نے اپنی پوری توجہ صنفِ غزل پر مرکوز کی تھی اور اسی میں بیشتر انھوں نے زورِ کلام، لطفِ ادا، موزونی طبع، حُسنِ بیان اور شیرینی زبان کے جوہر دکھائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شہرت کا زیادہ تر دارومدار ان کی غزل گوئی پر ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف غزل کے شاعر تھے بلکہ اُن کے کلام میں دیگر اصناف سخن کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ جس میں ایک مثنوی، ایک مسدس، 42 رباعیات، 8 مخمسات، 10 قصائد، 109 تاریخی قطعات، 7 غیر تاریخی قطعات، 6 سہرے، 3 سلام اور بہت سے متفرق اشعار ہیں۔ داغؔ کا تخلیقی اور فنی رچاؤ حقیقی معنوں میں غزل کے بعد جس صنف میں سب سے زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے وہ مثنوی ہے۔

داغؔ کی ایک واحد مشہور مثنوی ''فریادِ داغ'' ہے جو کہ 838 اَشعار پر مشتمل ہے۔ جو کلکتہ سے واپسی کے بعد جولائی 1882 میں لکھی گئی ہے اور 1883 میں شائع ہوئی۔ اس مثنوی میں داغؔ نے مُنّی بائی حجاب سے اپنے عشق کی داستان رقم کی ہے۔

ٹھاکر ہرکشن بیدار کے نام اپنے خط مورخہ 4 ستمبر 1885 میں حجاب کا ذکر کرتے ہوئے داغؔ نے لکھا ہے:

''مُنّی بائی حجاب تخلص جو صاحب مثنوی فریادِ داغ ہے۔''1

اس اجمال کی تفصیل امتیاز علی خاں عرشی کے مطابق یہ ہے:

''صاحب مثنوی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس قصے کی ہیروئن حجاب ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ نواب خلد آشیاں (نواب علی خاں) نے مارچ 1866 (ذیقعدہ 1282ھ) میں باغِ بےنظیر کے میلے کا اجراء کیا۔ یہ میلہ آٹھ دن بڑی رونق سے رہتا تھا۔ ہندوستان بھر سے تاجر اسبابِ تجارت لے کر آتے اور دور دور سے امراء و رؤساء آ کر شرکت کرتے تھے۔ اس میلے میں

مختلف فنون اور ہنروں کے اہلِ کمال بھی اپنے ہنر کی نمائش کیا کرتے تھے۔
اطرافِ ملک سے طوائفیں بھی آتی تھیں اور رقص وسُرور کے کرتب دکھا کر
دین ودل کا سودا کرلیتی تھیں۔
غالباً 1879 کے میلے میں صاحبزادہ حیدر علی خاں بہادر، نواب خلد علی خاں
آشیاں کے چھوٹے بھائی کی طلب پر مُنی بائی حجاب نے بھی شرکت کی۔
داغ کو اس کی ادائیں ایسی بھائیں کہ بے اختیار دل دے بیٹھے۔''2

جناب تمکین کاظمی مرتبِ کتاب ''داغ'' میں بے نظیر کے میلے کی سیر یوں کراتے ہیں:

''یہ میلہ ایک باغ میں ہوتا تھا جس کا نام باغ بے نظیر تھا اس لئے اس کا نام
ہی بے نظیر ہوگیا۔۔۔باغ کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی، پنکھے کا جلوس میلے کے
آخری روز بڑی دھوم دھام سے نکلتا تھا بالکل فوجی ٹھاٹھ ہوتے۔۔۔میلے
کی آخری رات شب جشن ہوتی، باغ کی روش روش اور تختہ تختہ پر روشنی کی
میٹیاں لگائی جاتیں۔نہر کے دونوں کناروں پر قطار باندھے ہندوستان بھر
کے گویے، طوائفیں اور باکمال موسیقار ٹھہرتے، رقص وغنا شروع ہوتا،
آتش بازی جلائی جاتی، ٹٹیاں، چکر، قلعے، کوٹھیاں جو نہر کے دونوں طرف
لگائے جاتے، روشن کئے جاتے اور آب و آتش بہم دست وگریباں
ہوجاتے۔''3

یہی وہ میلہ ہے جہاں کلکتہ کی ایک عشوہ طراز مغنیہ رامپور کے ایک خوش فکر دہلوی شاعر پر اپنی ادائیں کچھ اس طرح صرف کردیتی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امید وبیم کی کشمکش میں مبتلا ہوجاتا ہے۔یہ کشمکش رنگ لاتی ہے اور مثنوی داغ کے دامن پر ''ایک طوائف سے محبت'' کا کبھی نہ مٹنے والا داغ لگا جاتی ہے۔

یہ مثنوی دو دن کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔احسن مارہروی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''زود گوئی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ فریادِ داغ جیسی بے مثل مثنوی صرف
دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے۔''4

"جلوۂ داغ" جو خود داغ کی لکھی ہوئی ہے میں درج ہے:

"۔۔۔۔فریادِ داغ۔۔۔۔۔۔۔۔دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے۔۔۔۔

(ص114)5

داغ اوائل اپریل1882 میں رام پور سے کلکتہ عازم ہوئے تھے اور دہلی، لکھنؤ وغیرہ ہوتے ہوئے اپریل کے آخر میں پٹنہ پہنچے تھے۔ وہاں ایک لمبی مدت گزار کر غالباً جون کے تیسرے ہفتے میں بذریعہ ٹرین کلکتہ وارد ہوئے۔ان کے آتے ہی شہر میں دھوم ہوگئی:

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا
داغ آیا تو باغ باغ آیا

اوائلِ جولائی میں داغ واپس عازمِ رام پور ہوئے۔ واپسی کا ذکر یوں مثنوی میں یوں کیا ہے:

ریل نے دو ہی دن میں پہنچایا
رمضان ایک دن کے بعد آیا

اس اشارے کی بنیاد پر کیلنڈر دیکھنے کے بعد تمکین کاظمی اس نتیجے پر پہنچے کہ "داغ 3/جولائی کو کلکتہ سے چلے، دو دن ریل میں رہے، 6/جولائی کو تین مہینے بعد بخیر و خوبی رام پور واپس ہوئے۔

تمکین (ص93) لکھتے ہیں:

"فریادِ داغ رمضان یا شوال 1299ھ میں کہی گئی ہے۔ یعنی جولائی/اگست 1882 میں۔ مگر اس کا نام داغ نے دو تین مہینے بعد ماہِ محرم 1300ھ میں رکھا ہے جو تاریخی نام ہے اور اسی سال اس کی طباعت بھی ہوئی ہے۔ مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم نے اس کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔اس کے بعد مختلف مطابع نے متعدد ایڈیشن چھاپے ہیں۔"6

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی کتاب "مطالعہ داغ" (ص222) میں تمکین کے بیان کو

دہرانے کے بعد یوں رقمطراز ہیں:

''فریادِ داغ پہلی مرتبہ محمد امجد علی مالک اخبار نیّر اعظم مراد آباد نے اپنے مطبع مطلع العلوم سے 1300ھ میں شائع کی۔ اس پر مندرجہ ذیل شعر سالِ طباعت کا درج ہے: ؎ گفت تسلیم سالِ طبع او آفتِ دین فتنۂ آرائی (1300ھ)''7

داغؔ اپنے ایک خط میں مُنّی بائی حجاب کو لکھتے ہیں:

''صاحبِ مطبع نے یہ پندرہ سو چھاپی تھیں، مہینہ بھر میں فروخت ہو گئیں، مکرر چھپیں گی۔''

دوسری مرتبہ یہ مثنوی 1302ھ میں شائع ہوئی۔ محمد فیروز شاہ خان فیروزؔ نے مندرجہ ذیل قطعے سے سالِ طباعت برآمد کیا ہے:

''وہ ہیں مضمونِ عالی مثنوی میں کہ حاصل جس سے معنی کو بلندی چھپی یہ مثنوی فیروز جس دم لکھی تاریخ نظم ''دردمندی''۔(1303)8

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی (حاشیہ 222) لکھتے ہیں:

''فریادِ داغ کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے یہ 134 اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت کا سنہ 1300ھ ہے لیکن کاتب کا نام تحریر نہیں ہے اس پر ایک مہر بھی لگی ہوئی ہے جو غالباً داغؔ کی ہے اس مخطوطے میں مثنوی کے آخر میں دو شعر جو تمام مطبوعہ ایڈیشنوں میں پائے جاتے ہیں نہیں ہے یہ شعر مندرجہ ذیل ہے:

یا الٰہی نجات غم سے ملے
وہ سراپا حجاب سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

تیسری مرتبہ یہ مثنوی امجد علی نے مراد آباد سے 1313ھ میں پھر شائع کی۔ اس

میں بھی فیروز کے حسب ذیل قطعے سے سالِ طباعت نکلتا ہے:

تیسری بار پھر ہوئی مطبوع
مثنوی وہ جو روح پرور ہے
میں نے تاریخ یہ کہی فیروز
مثنوی یہ ہے یا گلِ تر ہے
9 (1313)

اس کے بعد اس کا چوتھا ایڈیشن 1899 اور پانچواں ایڈیشن 1913 میں نکلا۔ 15/ اپریل 1956 میں تمکین کاظمی نے اس کتاب کو کمرشل بک ڈپو چار مینار حیدرآباد (دکن) سے 88 صفحات کے طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی اس کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مثنوی فریادِ داغؔ جس کے مرتب اور مقدمہ نگار سید تمکین کاظمی ہیں ایک سو چھتیس صفحات کی ایک خوبصورت کتاب ہے۔ تمکین کاظمی کے اس مقدمہ سے نہ صرف کتاب کے اٹھاسی صفحات روشن ہیں بلکہ داغؔ، حجاب ان آس پاس کے تعلقات اور ان تعلقات کی نوعیت پر بھی خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے اور اس طرح وہ دھندلکا بڑی حد تک دور ہو جاتا ہے جو داغؔ کے محبوب اور داغؔ کی شاعری سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا باعث اور غلط بیانیوں کا موجب رہا ہے۔''10

داغ اور ان کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آج بھی لکھا جا رہا ہے۔ جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کے لکھنے والے تین خانوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے داغؔ کو گھٹیا درجہ کا انسان بنا کر پیش کیا ہے اور اس کی شاعری کو عامیانہ اور سوقیانہ کہا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے پہلے گروہ کی ہر بات کی تردید کو اپنا فرض سمجھ کر داغؔ پر قلم اُٹھایا ہے اور اس طرح وہ بھی حقیقت سے بہت دور جا پڑا ہے۔ تیسرا گروہ ان اعتدال پسندوں کا ہے جنھوں نے داغؔ اور ان کی شاعری پر کھلے دماغ اور ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور پھر اپنے

نتائج اور فکر کو دیانتداری کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ چند مشاہیر کی داغ کی اس مثنوی سے متعلق خیالات کو مندرجہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

1۔ اردو کے مشہور ناقد سر عبدالقادر سروری مرحوم نے مثنوی ''فریادِ داغ'' کے متعلق کہا ہے کہ ''اگر چہ داغ نے چار ضخیم دیوان چھوڑے ہیں مگر صرف یہ مثنوی ہی ان کی بقائے دوام کے لئے کافی ہے۔''

2۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو اگر چہ یہ شکایت ہے کہ ''بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں'' لیکن انھیں یہ بھی تسلیم ہے کہ ''اس مثنوی کے بہت سے اشعار اعلیٰ درجے کے ہیں اور سادگی، روانی اور عمدگی ان کی قابل داد ہے۔''

3۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول ''یہ مثنوی سچی کہانی ہونے کی وجہ سے دلچسپ ضرور ہے لیکن اس میں وہ گہرائی نہیں ہے جو توجہ سے اس میں پیدا کی جاسکتی تھی۔ مثلاً بے نظیر کے میلے میں پہلی ملاقات کے بیان میں جذبات و کیفیاتِ عشق کو بیان کرنے کی گنجائش تھی۔ داغ یہاں حجاب کا ''سراپا'' بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس سراپا میں رال ٹپکنے کا پتا چلتا ہے۔''

4۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو میں ایک جگہ لکھتے ہیں ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سچا عشق داغ کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتا اور اسی لئے یہ سب پہلو مثنوی میں بیان نہ ہو سکے۔ داغ نے خارجی باتیں تو سب بیان کر دی ہیں اور اندر کی بات اس لئے بیان میں نہیں آئی کہ وہ ان کے دل کی گہرائیوں میں موجود ہی نہیں تھی۔''

5۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق ''فریادِ داغ'' دلی کی آخری مشہور مثنوی ہے۔ زبان و بیان اور جذبات کے لحاظ سے یہ حکیم شوق کی مثنویوں کے قریب آجاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں بے حیائی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔''

6۔ گوپال متل ماہنامہ تحریک (دہلی) میں چھپے اپنے مضمون ''مثنوی فریادِ داغ'' میں داغ کے عشق سے متعلق یوں رقمطراز ہیں: ''داغ افلاطونی عشق کے قائل نہیں

تھے جسم کے تقاضوں پر انھیں کوئی ندامت نہیں تھی اور وہ عشق کو تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے لیکن عشق کو تفریح کا ذریعہ اور جسم کا تقاضا سمجھنے کے باوجود ان کا تصورِ عشق اخلاص و صداقت سے محروم نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو عشق کے یہ مثبت پہلو اُن کے ذہن میں نہیں آسکتے تھے:

سب نے کی ہیں برائیاں اس کی میں نے لکھیں بھلائیاں اس کی

دل بنا ہے اسی مزے کے لئے میں نے یہ لطف جان دے کے لیے

میر تقی میر اور مومن کی طرح داغ نے بھی اپنی عاشقانہ زندگی سے متعلق ایک طویل مثنوی ''فریادِ داغ'' کی شکل میں یادگار چھوڑی ہے۔ فریادِ داغ صرف یہی نہیں کہ سوانح داغ کے بعض پہلوؤں کو واشگاف کرتی ہے بلکہ ان کی طبیعت اور شاعری کے میلان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ مثنوی داغ اور ایک طوائف مُنّی بائی حجاب کے عشق کی داستان پر مبنی ہے۔ یہ عشق کلکتہ میں بے نظیر کے میلے میں پروان چڑھتا ہے اور کلکتہ سے واپسی پر داغ اس مثنوی کو دورانِ ٹرین کے سفر میں دو دن میں قلم بند کر دیتے ہیں۔

یہ مثنوی بھی دیگر مثنویوں کی طرح حسب روایت حمد و نعت، منقبت، ذکرِ خلفاء اور مدح نواب کی تعریف سے شروع کی گئی ہے۔ اس مثنوی کے کل پندرہ عنوانات قائم کیے گئے ہیں جو بھی فارسی زبان میں ہے۔ بعدِ حمد، صفتِ عشق، ساقی نامہ، نالۂ جگر سوزِ در بیان ناوک فگنیِ عشقِ سینہ دوز، گرفتار شدن دل در رنج و محن و دام گستری پری پیکر از زلف پری شکن وغیرہ۔ حمد کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہو:

حمد ہے عشق آفریں کے لئے نعت ہے ختم المرسلیں کے لئے

السلام اے چہار یار کبارؓ

السلام اے ایمۂ اطہار

مَدحِ نواب نامدار کروں

جان قربان دل نثار کروں

لطف کی بات یہ ہے کہ خدا کی تعریف کا بھی داغ نے جو پہلو تلاش کیا ہے وہ اس

کی کوئی دوسری صفت نہیں بلکہ عشق آفرینی کی صفت ہے اور چونکہ مدحِ نواب کے فوراً بعد اُسے عشق کی تعریف کرنی اور پوری مثنوی میں اسی عشق کی کافرمائی کا ذکر کرنا ہے۔اس لیے بجاطور پراس کا جواز بھی بنتا ہے۔

اس کے بعد مثنوی کے اگلے عنوان ''صفتِ عشق'' میں داغؔ عشق کی تعریف میں 34اشعار کہتے ہیں۔ابتدائی شعر کواپنی طبیعت کے امتحان سے تعبیر کرتے ہیں:

خوبیاں عشق کی بیان کروں
کچھ اپنی طبیعت کا امتحان کروں
عشق تاب و تواں عاشق ہے
شانِ عاشق نشانِ عاشق ہے
عشق نعمت ہے آدمی کے لئے
عشق جنت ہے آدمی کے لئے
عشق کے لطف ہم نے پائے ہیں
کیا کہیں کیا مزے اُڑائے ہیں
عشق سے دل گداز ہوتا ہے
ناز میں بھی نیاز ہوتا ہے

جوعشق اس قسم کے جذبات پیدا کر سکے اس کی صداقت سے صرف اس بنا پرانکار نہیں کیا جاسکتا کہ موضوعِ عشق ایک طوائف ہے کیونکہ اہم بات بقول نیاز فتح پوری یہ نہیں کہ ''عشق کس سے کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ عشق کیسے کیا جائے۔''

مندرجہ بالا کے ایک مصرعے میں داغؔ کہتے ہیں کہ عشق کے لطف ہم نے پائے ہیں۔مطلب صاف ہے کہ داغ کی حجاب سے پہلے بھی معشوقائیں رہی ہیں جیسے کہ داغؔ کے مطابق ''مجھے تمام عمر میں پانچ عشق ہوئے ہیں جن میں دواَب تک میرے رگ و ریشہ میں سمائے ہوئے ہیں۔ایک مُنّی بائی حجاب کا دوسرا عشق خواجہ معین الدین وحشتی کا۔''

فریادِداغ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے اپنے یااپنے محبوب کے چہرے

پر کوئی مصنوعی نقاب نہیں ڈالا مثلاً اپنے متعلق اس نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ یہ اس کا پہلا اور نا گہانی عشق نہیں تھا اور وہ تجربہ کار عاشق تھا عشق کی ابتدا کے باب میں کہتے ہیں:

دل ستایا ہوا ہزاروں کا
داغ کھایا ہوا ہزاروں کا

''حمد'' کے تیرہ اشعار اور ''صفتِ عشق'' کے چونتیس اشعار کے بعد بائیس اشعار کا ''ساقی نامہ'' ہے جو داستانی مثنویوں کی طرح ایک تکنیکی ضرورت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اصل مثنوی شروع ہوتی ہے جیسا کہ مذکور ہوا ہے کہ مثنوی کے عنوانات فارسی میں قائم کیے گئے ہیں جن کا خلاصہ بڑی حد تک امتیاز علی خاں عرشی نے پیش کر دیا ہے۔ اسے درج ذیل عناوین کے تحت ترتیب دیا گیا ہے:

''عشق کی ابتداء''، ''پہلا آمنا سامنا''، ''معشوقہ کی تعریف''، ''معشوقہ کی روانگی''، ''جدائی''، ''عاشق کی تصویر سے معشوق کی مخاطبت''، ''معشوقہ کی آمد''، ''بلاوا''، ''معشوقہ کا خط''، ''جواب''، ''کلکتہ کو جانا''۔

حمد، صفتِ عشق اور ساقی نامہ کے عنوانات کو چھوڑ کر باقی میں اشعار کی تعداد بالترتیب 36، 36، 76، 41، 97، 29، 75، 46، 23، 47، 69 اور 198 ہے جو کل ملا کر 838 اشعار بن جاتے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین کرانا لازمی ہے کہ جب داغ کو یہ حادثہ پیش آیا تب اُن کی عمر باون سال کی تھی اور حجاب چالیس کی تھی۔ داغ کو اعصابی امراض نے بھی گھیر رکھا تھا۔ داغ کو بھی یہ احساس تھا کہ ان کی شکل میں کوئی کشش نہیں جو ان کے محبوب کو ان کی طرف راغب کر سکے۔ خود داغ کے سوانح نگاروں نے بھی لکھا ہے کہ داغ خوب رو اور خوش شکل نہیں تھے۔ لیکن اس مثنوی کے ان شعار سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے:

دیکھ کر داغ کو وہ یہ کہتے ہیں
ایسی صورت سے پیار کون کرے

ایسی تصویر کس کو بھاتی ہے
پر بلا سے ہنسی تو آتی ہے

کلکتہ سے نکلنے کے بعد داغ نے مُنّی بائی حجاب سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ کئی بار رام پور آنے کی دعوت بھی دی لیکن حجاب بہانے بناتی رہی اور جب آئیں تو نواب حیدر علی خاں کے ہاں ٹھہریں۔ کیونکہ نواب سے حجاب کے قریبی مراسم تھے۔ داغ اور حجاب کے مابین دور سے ہی سہی لیکن عیش ونشاط کی یہ محفل زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکی اور حجاب نے رام پور سے ہی بنا کسی سبب کے واپس کلکتہ جانے کا قصد کیا:

عیش یہ آسماں نہ دیکھ سکا
چار دن شادماں نہ دیکھ سکا
قِصّہ ٹھہرا وطن کے جانے کا
رنگ بدلا نیا زمانے کا

لیکن حجاب کا جانا داغ کے لیے قیامت کا آنا تھا:

صبح کو وہ اُدھر سوار ہوئے
ہم اجل کے امیدوار ہوئے

جب حجاب کلکتہ پہنچی تو لوگوں نے طرح طرح سے داغ کے خلاف بھڑکایا اور حجاب کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ داغ کو کلکتہ آنے کی دعوت دی۔ داغ چھٹی پا کر کلکتہ کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ کلکتہ پہنچ کر چار و نا چار نواب صاحب کی طلبی پر داغ کو یکا یک رام پور واپس ہونا پڑا:

میری رخصت سے اُن کو حیرت تھی
کہ یہ رخصت نہ تھی قیامت تھی

داغ رام پور لوٹ آئے اور مثنوی ''فریادِ داغ'' اس دعا پر ختم ہوتی ہے:

یا الٰہی نجات غم سے ملے
وہ سراپا حجاب سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

یہ دونوں دعائیں مستجاب ہوئیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ 18 یا 19 جنوری 1902 کو حجاب حیدر آباد پہنچی۔ جب کہ گوپال متل کے مطابق 22 / جنوری 1902 کو جب داغ کی عمر 72 برس تھی اور حیدر آباد میں ان کے عروج کا زمانہ تھا منی بائی حجاب ان کے پاس پہنچ گئی۔ دونوں میاں بیوی بننے پر رضامند بھی ہو گئے۔ لوگوں نے جب ازراہِ تمسخر مرزا سے پوچھا کہ اس عمر میں جب ان کے منہ میں بتیسی لگی ہوئی ہے اور داڑھی کے بال خضاب اور مہندی سے سیاہ و سرخ کیے جاتے ہیں وہ آخر کس بنیاد پر حجاب سے نکاح کرنے پر مائل ہیں۔ تو مرزا نے فرمایا کہ نکاح کر کے میں عام اصطلاح میں حجاب کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گا بلکہ اپنی رفیق بناؤں گا۔ اس عمر میں مجھے بیوی سے زیادہ ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔ خود مرتبِ داغ کے مصنف تمکین کاظمی صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔ لکھتے ہیں ''لوگ یہ نہ سمجھیں کہ داغ واقعی حجاب کے عشق میں مبتلا تھے اور اس کو بلانے کے لیے بے چین تھے یہ صرف دل لگی تھی ورنہ انھیں فقط خوش گذارنی مقصود تھی''۔ لیکن حجاب صرف رفیق بننے پر قناعت نہیں کرسکتی تھی وہ ان پر حکومت بھی کرنا چاہتی تھی اور مختلف حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ روپے پیسے کے معاملے میں بھی اس کے مطالبے کچھ ایسے تھے جنھیں پورا کرنے کے لیے داغ تیار نہیں تھے۔ داغ حجاب کو صرف سو روپیہ ماہوار دیتے تھے جس میں حجاب کا گزارا نہیں ہوتا تھا اور بسا اوقات وہ پڑوسیوں سے قرضہ بھی لے لیتی تھیں۔ جس کا بھار بالآخر داغ پر پڑتا تھا۔ اس طرح غیظ و غضب میں حجاب داغ کو چھوڑ کر واپس کلکتہ رخصت ہوئی۔ اس طرح یہ والہانہ عشق خالص مادی وجوہ پر ختم ہوگیا اس موقع پر داغ کا یہ مطلع بے ساختہ یاد آ جاتا ہے:

جو سر میں زلف کا سودا تھا سب نکال دیا

بلا ہوں میں بھی جو آئی بلا کو ٹال دیا

''مثنوی فریادِ داغ''میں داغ نے واقعات کے ثبوت میں کسی مافوق العادت قوت سے کام نہیں لیا ہے۔بیان کا تسلسل قابلِ تعریف ہے۔اس کی زبان میں سادگی، برجستگی، سلاست اور فصاحت ہے اس میں فارسی ترکیبیں اور ثقیل الفاظ مطلق استعمال نہیں کیے گئے ہیں۔اگر چہ یہ مثنوی اعلیٰ ادبی مثنویوں مثلاً سحر البیان، گلزارِ نسیم اور زہرِ عشق وغیرہ کے پایہ کی نہیں ہے۔مگر سادگی، صفائی، اصلیت و واقعیت، پلاٹ نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری، جزئیات نگاری، منظر نگاری اور تسلسلِ بیان میں کسی مثنوی سے کم بھی نہیں ہے اور یہ مثنوی اتنی دلچسپ ہے کہ اسے ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکتا ہے۔اس مثنوی پر پست مذاقی، فحش نگاری اور ابتذال کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

> ''لیکن ان پر بھی پست مذاقی، فحش نگاری یا ابتذال کا لیبل لگانا مشکل ہے کیونکہ ان میں مناظر اور جذبات صرف اشاروں اور کنایوں میں ادا ہوئے ہیں۔''

بحیثیتِ مجموعی یہ مثنوی داغ کی ایک کامیاب تخلیق ہے اور جب جب کہیں مثنویوں کے حوالے سے بات کرنی مقصود ہوگی، داغ کی مثنوی فریادِ داغ کا ذکر کرنا بھی لازمی بن جاتا ہے۔

# کتابیات


1۔ فریادِ داغ، داغ دہلوی، مینیجر نیر اعظم بک ایجنسی، مرادآباد (سن درج نہیں)

2۔ سلسلۂ شعرائے ہند نمبر 2، کے۔ ایل رلیارام، منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور۔ 1939

3۔ مراز داغ، تمکین کاظمی۔ م، ع، سلام، آئینہ ادب، چوک مینا بازار، لاہور۔ 1960

4۔ مطالعہ داغ، ڈاکٹر سید محمد علی زیدی، کتاب نگر، دین دیال۔ 1974

5۔ جہانِ استاد داغ دہلوی، کالی داس گپتا، سائرہ منزل، دمان درشن لاگاؤ روڈ، پونہ۔ 1997

6۔ تاریخِ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ادارہ کتاب الشفاء، نئی دہلی۔ 2000

7۔ تاریخِ ادب اردو (جلد چہارم) جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ 2011

8۔ تخلیقی روّیوں کی تفہیم، ڈاکٹر فرید پربتی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ 2013

# رسائل وجرائد


1۔ سہ ماہی اردو ادب، علی گڑھ، ستمبر 1956، ص22

2۔ مقدمہ مثنوی داغ، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، ماہنامہ تحریک، دہلی، جلد نمبر6، شمارہ نمبر10، فروری1959، ص32

3۔ ایضاً:ص33

4۔ مثنوی فریادِ داغ، گوپال متل، ماہنامہ تحریک، دہلی، جلد نمبر9، شمارہ نمبر5/اگست1961، ص32

5۔ ایضاً:34

6۔ ایضاً:ص35

7۔ داغ کی حیات معاشقہ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ماہنامہ نگار، پاکستان، جلد نمبر24، شمارہ نمبر5، مئی1965، ص8

8۔ ایضاً:ص14

9۔ مثنوی فریادِ داغ ایک مطالعہ، امتیاز احمد، سہ ماہی جامعہ، جلد نمبر102، شمارہ نمبر10 تا12 اکتوبر تا دسمبر2005، ص230

10۔ ایضاً:ص231

11۔ ایضاً:232

12۔ ایضاً:238

# رباعیاتِ حالی میں قومی اصلاح

اردو تنقید کی بوطیقا ''مقدمہ شعروشاعری'' کے معتبر نقاد، ''حیاتِ سعدی''، ''حیاتِ جاوید'' اور ''یادگارِ غالب'' جیسی اعلیٰ پایہ کتابوں کے سوانح نگار، ''مسدس مدوجزر اسلام'' کے تخلیق کار (مسدس کے بارے میں مصلح قوم سرسید احمد خاں کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ ''اگر خدا نے مجھ سے پوچھا کہ دنیا سے کیا لائے ہو تو میں یہ کہہ دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں'')، سرسید احمد خاں کے خاص رفقاء کار، حقوقِ نسواں کے علمبردار اور ''مناجاتِ بیوہ'' کے بے مثل شاعر، ''چپ کی داد''، ''نشاطِ امید''، ''برکھارت''، اور ''حُبِ وطن'' جیسی نظموں کے خالق اور جدید نظم نگاری کے مجدد، اردو میں نئی طرز کے مرثیوں اور ''مرثیہ غالب'' جیسے شخصی مرثیے کے ممتاز مرثیہ نگار، مثنوی کو اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بکارآمد قرار دینے والے اور ''جوانمردی کا کام''، ''مناظرہ رحم و انصاف''، ''پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ'' وغیرہ جیسی مثنویوں کے مثنوی نگار، اردو کے بلند پایہ نثر نگار، ایک جہاں دیدہ مبصر، شعرو شاعری کے بنیادی اصول وضع کرنے والا اردو کا پہلا نقاد، قومی، وطنی، مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی شاعر مولانا محمد الطاف حسین حالی کے نام اور کام سے متعارف ہوئے بغیر اردو زبان کا کوئی بھی ادیب اور شاعر نہیں رہ سکتا۔

حالی کو بیک وقت کئی اصناف میں طبع آزمائی کا شرف حاصل ہے۔ غزل ہو یا نظم، مثنوی ہو یا مرثیہ، قصیدہ ہو یا قطعۂ تاریخ، قطعہ ہو یا رباعی، ترکیب بند ہو یا مسدس، تنقید ہو یا تحقیق، سوانح نگاری ہو یا سیرت نگاری، مضمون نگاری ہو یا مقالہ نگاری، صحافت نگاری ہو یا تبصرہ نگاری

غرض کہ ہر صنف میں انھیں بلند مرتبہ حاصل ہے اور بیشتر اصناف ایسی ہیں جس میں انھوں نے عظیم نمونے تخلیق کیے ہیں۔ حالی کو فخرِ ملت، محبِ وطن، وسیع القلب علم، عہد آفرین شخصیت، شمس العلماء ہند اور سعدیٔ ہند جیسے القابوں سے بھی نوازا گیا ہے۔

مولانا حالی کے ادبی، اخلاقی اور اصلاحی کارناموں کا جائزہ لینا ہو تو رباعی کا ذکر کیے بغیر یہ جائزہ مکمل نہ ہوگا۔ حالی نے ہر قسم کی رباعیاں کہی ہیں جس میں تعلیمی، ادبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، مذہبی، اخلاقی اور فلسفہ وحکمت وغیرہ ہر رنگ کی رباعیاں شامل ہیں۔ اردو زبان میں مرثیہ نگاروں ہی نے سب سے پہلے بہترین رباعیاں کہی ہیں جس میں انیس اور دبیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہی کی بدولت اردو رباعی عوام میں روشناس ہوئی اور بعد میں حالی اور اکبر نے اس میں قومی، وطنی اور سیاسی رجحانات کو داخل کر کے اسے اردو کی اہم، کارآمد اور ہمہ گیر صنفِ سخن بنادیا۔ مولانا حالی، میر انیس سے بڑی حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بھی انیس کی طرح رباعی میں ہر قسم کے اخلاقی مضامین ادا کیے ہیں۔ اس کے علاوہ حالی نے رباعی کو سماجی اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بھی بنایا۔ میر انیس کی رباعیوں کے بعد اردو شاعری میں حالی کی رباعیاں سب سے بلند درجے کی تصور کی جاتی ہیں۔ اگر چہ مولانا حالی کی رباعیاں تعداد میں کم ہیں مگر قلیل سرمایے کے باوجود وہ مستند حیثیت کی حامل ہیں۔ حالی جس مضمون کو ادا کرنا چاہتے ہیں ان چار مصرعوں میں بڑی روانی اور خوبی سے بیان کر دیتے ہیں۔ بعض تو ایسی ہیں کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے ادبی تخلیقات میں جو تبدیلیاں لانے کی کوشش کی تھیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ادب برائے زندگی کے مفروضے کو عملی جامہ پہنانے کے باعث حالی نے موضوعاتی رو سے بہت سی اصناف کو گردن زدنی کے لائق قرار دیا تھا۔ جس میں غزل بھی شامل ہے۔ حالی جب خود اس پر عمل پیرا ہوئے تو انھوں نے رباعی کی صنف کو لیا۔ جس میں پند و نصائح کا موضوع آ گیا کیونکہ قوم اور ملّتِ اسلامی کا جذبہ ان کی شخصیت کا ایک بنیادی وصف تھا۔ یہ رنگ اُن کی ادبی تخلیقات میں خوب جھلکتا ہے۔ جس سے رباعی بھی بچ نہیں سکی۔ ڈاکٹر عابد حسین نے حالی کو جدّت پسند اور قدیم تہذیب کی خرابیوں کا سخت نکتہ چیں قرار دیا

ہے۔اسی وجہ سے ان کی رباعیاں قوم کا مرثیہ معلوم ہوتی ہیں۔حالؔی کی رباعیات کو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی کچھ وجوہات ہیں۔وہ موضوعاتی طور پر اصلاح کن ہیں۔ان میں زبان کی سلاست بھی ہے اور اظہار کی سادگی بھی۔ان میں جذباتی گرمی بھی ہے اور بیان کی نرمی بھی۔حالؔی نے جس دور میں سانس لی تھی اس میں ہر پہلو سے نیا پن، نیا شعور اور نیا ماحول دیکھنے کو مل رہا تھا۔اس لیے حالؔی نے اس کے ہر پہلو کو لبیک کہا۔

یوں تو نظریاتی اعتبار سے وہ اردو شاعری کی قدیم و فرسودہ روایات سے پہلے ہی منحرف اور دل برداشتہ ہو چکے تھے۔یہی وجہ ہے کہ''مقدمہ شعر و شاعری''میں انھوں نے نئی طرز کی شاعری کے سلسلے پر زور دیا تھا، ساتھ ہی کچھ اصول و ضوابط بھی وضع کیے تھے۔سر سید کی ملاقات اور ان کی تحریک میں شرکت نے حالؔی کے لیے سونے پر سہاگا کا کام کیا۔ان کا رنگِ سخن بدلا، عشقیہ شاعری کی جگہ قومی شاعری اور اصلاحی شاعری نے لے لی اور ان کی زیادہ تر توجہ اصلاحِ ملت کی طرف رہی۔انھوں نے زندگی بھر تک اپنے کلام سے یہی کام لیا جس میں رباعیات بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔پروفیسر قمر رئیس سر سید اور علی گڑھ تحریک کے ساتھ حالؔی کی وابستگی کے اثر کو مندرجہ ذیل میں رقم کرتے ہیں:

> ''ابتدا میں ان کے دل و دماغ پر روایتی علوم اور روایتی تہذیب کا رنگ چڑھا رہا۔لیکن جیسے ہی وہ مرزا غالبؔ اور سر سید احمد خاں سے متعارف ہوئے اور ان سے ربط و ضبط بڑھا ان کے ذہن کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔فکرِ جدید، روشن خیالی اور اصلاح معاشرہ کی جو ہوائیں تاج برطانیہ کی حکومت کے آغاز اور سر سید کی ہمہ گیر اصلاحی تحریک کی اشاعت سے چلنے لگیں تھیں وہ حالؔی کے ذہن میں نئے شگوفے کھلانے لگیں۔نشاۃ ثانیہ کی جو روشنی طلوع ہو رہی تھی حالؔی اس سے متاثر بھی ہوئے اور اس روشنی کے حلقہ اور فیضان کو وسیع کرنے کی مہم میں شریک کار بھی بنے۔''

(سہ ماہی جمنا تٹ، خصوصی شمارہ، حالی نمبر، یکم جنوری تا 31 مارچ 2005، ص 31)

درج بالا اقتباس اس بات کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے کہ حالؔی نے جو رباعیات

ابتدا میں لکھیں وہ رباعیاتِ قدیم کہلائیں اور جو بعد میں مرزا غالب اور خصوصاً سرسید کے دائرہ حلقہ میں آنے کے بعد کہیں وہ جدید طرز اور منفرد فکری رجحان کی رباعیاں کہلائیں۔ کیونکہ سرسید کی شخصیت اور ان کی تحریک کا حالی پر عجیب وغریب اثر پڑا۔ انھیں وہ رہنما مل گیا، وہ راہِ عمل نظر آ گئی، وہ مقصدِ حیات ہاتھ آ گیا جس کی انھیں تلاش تھی۔ انھوں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ اپنی زندگی اور اپنی شاعری کو مسلمانوں کے شعر وادب کے مذاق کو سنوارنے، قومی جذبے کو بیدار کرنے اور ان میں تعلیم وترقی کا شوق پیدا کرنے میں صرف کریں گے۔ حالانکہ حالی کی ایسی بہت ساری نظمیں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں جن سے ان کی وطن پرستی اور قومی اصلاح کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے۔ اصلاح کے ساتھ ساتھ یہ نظمیں ان کی سیاسی وسماجی، معاشی اور تعلیمی فکر ونظر کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ جذبہ ان کا اپنا تھا۔ ان کے دل میں اہلِ وطن کے لیے بڑا درد تھا۔ وہ خدمت کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اسی جذبے نے ان سے ''مدو جزر اسلام'' جیسی یادگار نظم لکھوائی جس کا واحد مقصد قوم کی اصلاح اور اخلاق کی بازیافت کرنا تھا۔ حالی افادی اور مقصدی ادب کے پیروکار تھے۔

''دیوانِ حالی'' مرتبہ رشید حسن خان میں حالی کی قدیم اور جدید رباعیوں کو الگ الگ خانوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ حالی کی قدیم رباعیاں گنی چنی ہی ہیں جو سب بلاعنوان ہیں۔ جب کہ جدید رباعیاں تمام باعنوان ملتی ہیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ حالی کی بعض رباعیوں میں اصلاحی پہلو پوشیدہ ہے۔ حالی کی اصلاحی رباعیوں میں فنی، فکری، معنوی اور علمی پہلو بدرجۂ اتم موجود ہے۔ حالی کی رباعیات نہ صرف ہندوستان میں مقبول ہوئیں بلکہ ان کو ایک مسٹر وارڈ نے انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے یورپ میں بھی شائع کر دیا۔

مولانا الطاف حسین حالی نے رباعی کو ایک خاص مناسبت کی وجہ سے غزل کے ذیل میں داخل کیا ہے۔ ان کے خیال میں شاعر کے جذبات وخیالات کے اظہار کا ''کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہوسکتا''۔ انھوں نے رباعی کو اپنے جذبات وخیالات کے اظہار کا مؤثر وسیلہ پایا۔ میر انیس نے مذہب واخلاق پر رباعیاں لکھی ہیں جب کہ حالی کی شاعری کا میدان اصلاح واخلاق تھا۔ اُن میں رباعیاں کہنے کی فطری صلاحیت موجود تھی۔

چنانچہ انھوں نے اپنے مشن کی تبلیغ و ترویج رباعیوں کے توسط سے کی۔ رباعی میں وہ اپنے خیال کو جامع انداز میں بیان کرتے ہیں۔ رباعی گوئی کی بدولت ہی قوم نے انھیں سعدیٔ ہند کا لقب دیا۔ یوں تو حالؔی نے کل 153 رباعیاں کہی ہیں جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ جن میں اصلاحی رباعیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان کی اصلاحی رباعیوں میں ''دوستوں سے بے جا توقع''، ''شراب اور جوانی''، ''غرور سب عیبوں سے بدتر ہے''، ''گفتار و کردار میں اختلاف''، ''عالم و جاہل میں کیا فرق ہے''، ''موجودہ ترقی کا انجام''، ''کام کی جلدی''، ''غرض''، ''انقلابِ روزگار''، ''تقاضائے سن''، ''جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا''، ''آثارِ زوال''، ''شانِ ادبا''، ''نفاق کی علامت''، ''مسلمانوں کی بے مہری''، ''علم''، ''خاندانی عزت''، ''عزت کس چیز میں ہے''، ''عیش و عشرت''، ''غیبت''، ''عشق''، ''بے پروائی و بے غیرتی''، ''سختی کا جواب نرمی ہے''، ''محنت''، ''اول کوشش اور بعد دعا''، ''کام کرنا جان کے ساتھ ہے''، ''جھوٹی نمائش''، ''انسان کی حقیقت''، ''دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے''، ''علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے'' وغیرہ شامل ہیں۔

حالؔی کی یہ رباعیات اُس دور کی یادگار ہیں جب زمانہ ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ ان کی رباعیات ہی میں انقلابِ روزگار کے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دیتی ہے۔ حالؔی کی رباعیات میں قوم کراہتی ہوئی اور سسکیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے حالؔی کی رباعیاں قوم کا مرثیہ ہے۔ لیکن حالؔی کی رباعیات کو صرف قوم کا مرثیہ ہی نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ وہ قوم کے لیے پیغام بھی ہے۔ ان کی رباعیوں میں ہر جگہ اصلاحی پہلو کارفرما ہے۔ انھوں نے قوم کی زبوں حالی پر افسوس کا اظہار کیا اور نوجوان نسل کو علم و عمل کی تحریک دی۔ ان کو تحصیلِ علم کے لیے آمادہ کیا۔ گداگری کے پیشے کی مذمت کی اور ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ نوجوانوں کو بازاری عشق کے مضر اثرات سے آگاہ کیا۔ ان کو محنت و مشقت کی طرف مائل کیا نیز انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا درس دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی رباعیات کے ذریعے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اسی بنیاد پر مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی نے حالؔی کو ''رباعیات حالؔی'' کے دیباچہ میں اٹلی کے نامور وطن پرست کاردوشی سے نسبت دی ہے اور لکھا ہے کہ کاردوشی

کی زندگی ملک کی لٹریری زندگی تھی۔ اُس نے اٹلی کی خدمت کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا، ملک کے پردہ غفلت کو چاک کیا اور سرزمینِ وطن کے ذرّے ذرّے کو منور کر دیا۔ مولانا وحیدالدین سلیم نے یہی خوبیاں حالؔی کی بتائی ہیں۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی حالؔی کی قوم سے متعلق اصلاحی رباعیوں کے حوالے سے یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

> ''حالؔی کی رباعیات میں اخلاقی واصلاحی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ انھوں نے قوم کی پستی و بدحالی کو دور کرنے اور اس کو محنت و مشقت، ہمت وحوصلہ، جوش واستقلال کے ساتھ کام کرتے رہنے اور اعلیٰ کردار، بلند اخلاق پیدا کرنے کی ترغیب دی اس کے اندر جمود وقنوطیت کے بجائے حرکت و رجائیت کے جذبات بیدار کیے اس کو علم وعمل کی طرف توجہ دلائی، ہمدردی و انسانیت کا درس دیا۔''

(حالؔی بحثیتِ شاعر از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ص 235)

حالؔی نوجوانوں کو راہِ راست پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں، عقلِ خداداد، شعور اور سمجھ سے کام لینے کی ترغیب دیتے ہیں، نوجوانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ بادہ خواری میں بدمست نہ ہو جائیں، جوانی زندگی کے شباب کا دور ہوتی ہے، اس میں بہت جنون ہوتا ہے اور اس جنون پر تم ایک اور جنون کرتے ہو جو نہ صرف زندگی کے لئے مُضر ہے بلکہ ایک بہت بڑے گناہ کے مترادف بھی ہے۔ کیوں اپنی عقلِ خداداد اور اپنی عقلِ سلیم کا قتل کر رہے ہو، کیوں گناہوں میں گرفتار ہو رہے ہو، سبق لو، اس ضمن میں ان کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے:

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو مفتوں
گردن پہ نہ لو عقلِ خدا داد کا خوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے اب تم
کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اور جنوں

حالؔی محنت ومشقت کو خاصی اہمیت دیتے ہیں۔ ظاہر ہے انسان کی ترقی کا راز اس

کی محنت و مشقّت، ہمت اور حوصلے کے ساتھ کام کرنے میں پنہاں ہے۔ محنت میں برکتیں ہیں، محنت جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے، محنت کے باعث صحیح اور غلط میں فرق کیا جا سکتا ہے اور محنت ہی میں خوش حال زندگی کا راز مضمر ہے۔ محنتی انسان میں خودداری اور ایمانداری پنپتی ہے۔ حالیؔ قوم کو محنت کرنے اور عملِ پیہم پر زور دیتے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے تاریخی واقعات کا سہارا بھی لیا ہے تاکہ قاری کو افہام و تفہیم میں آسانی ہو کہ کیسے محنت کش انسان کو اپنی محنت کا پھل ملتا ہے۔ رباعی ملاحظہ فرمائیں:

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو نہ ملی قوم کی چوپانی
جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

حالیؔ عیش پرستی اور عیش و عشرت والی زندگی سے سخت نالاں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ عیش پرستی والی زندگی میں انسان خدا کو بھول جاتا ہے، اس میں وہ اپنی زندگی کا مقصد و مدعا فراموش کر بیٹھتا ہے، عیش و آرام کی زندگی میں انسان جس قدر غفلت برتتا ہے اسی قدر انسان کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ حالیؔ جس قوم کو عیش پرست اور عیش دوست پاتے ہیں اس کے لیے وہ یہ کہنے میں ذرا بھی ہچکچاتے نہیں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اس عیش و نشاط میں انسان غفلت شعار بن جاتا ہے، وہ دنیا کی سچائی سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے، صحیح اور غلط میں فرق کرنا بھول جاتا ہے۔ کچھ رباعیوں میں حالیؔ ایک پیشن گو کی حیثیت سے بھی نظر آتے ہیں۔ کیونکہ حالیؔ بہ خوبی واقف تھے کہ اب تک جو بھی قوم عیش پرستی کی شکار ہوئی اس کے ہاتھ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں آیا۔ انھوں نے یہاں پر بھی تاریخی واقعات کا سہارا لے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اسی عیش و عشرت نے نینوا، بابل، بغداد اور قرطبہ جیسی عظیم الشان سلطنتوں کو تباہ کیا۔ حالیؔ نے کہا ہے کہ یہ دنیا کلجگ نہیں بلکہ کرجگ ہے اور جب تک جیو سرگرمِ عمل رہو۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی چیز رہنے والی نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔ اس لیے حالیؔ

کہتے ہیں کہ دنیائے دنی کے ہر نقش کو فانی سمجھو، دنیاوی حقیقت کو صرف ایک کہانی سمجھو اور جب بھی کوئی بڑا کام کرنے کی ٹھان لو تو اس میں ہر سانس کو زندگی کا حاصل سمجھ کر کرو کیونکہ انسان کی ہر سانس اوپر والے کی دین ہے، ہر سانس کے لئے جواب دہ ہونا پڑے گا، سانس سانس پر اس کا حق ہے، اس لیے جو بھی قدم اُٹھانا ہو بہت ہی محتاط ہو کر اٹھاؤ۔ نمونے کے طور پر چند رباعیاں قارئین حضرات کی ذوق نذر:

عشرت کا ثمر تلخ صدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں
کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا
سلطان کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل
بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

حالؔی نے سماجی و معاشرتی برائیوں کی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ ان کی نظر سماج کی چھوٹی بڑی ہر خرابی پر تھی۔ غیبت و بدگوئی، مکر و ریا، نخوت و غرور، خود غرضی و خود پسندی، نفاق و شقاق، بے پروائی و بے غیرتی، جہالت و اسراف، کاہلی و پستی، نکبت و افلاس، چغل خوری و دُشنام طرازی وغیرہ کے نتائج سے خبردار کیا ہے۔ کیونکہ اب جہاں بھی محفلیں سجتی ہیں

وہاں غیبت کا ماحول گرم ہوتا ہے۔ ہر کسی کی صحبت میں بدگوئی نظر آتی ہے اوروں کی برائی کرنے پر فخر محسوس کیا جاتا ہے۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اُمت میں کوئی خوبی باقی ہی نہیں رہی۔ حالیؔ یہ سب باور کرانا چاہتے ہیں کہ سماج اور قوم کس حد تک پستی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ رباعی ''غیبت'' ملاحظہ کیجیے:

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمت میں

علم کی عظمت واہمیت وافادیت پر حالیؔ نے کئی رباعیاں لکھی ہیں۔ ان کے نزدیک علم ہی سرمایۂ ابدی ہے۔ اسی سے دین ودنیا دونوں سنورتی ہے، اسی سے دونوں جہاں میں آسائش اور عزت وافتخار ہے۔ حالیؔ نے ملک وقوم کو پسماندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے علم وعمل کی ترغیب دی۔ جن قوموں نے علم کو ٹھکرایا اور اس کی روشنی سے کنارہ کشی میں اپنی عاقبت سمجھی وہ جاہل اور گمراہ ہوئے، ساتھ ہی ان پر اللہ کا قہر بھی نازل ہوا۔ جنھوں نے علم کو ایک اہم پونجی سمجھ کر اس سے روشنی پائی وہ دین ودنیا دونوں کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ یہ رباعی ملاحظہ فرمایئے:

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے
سرچشمۂ نعما و ایادی تو ہے

آسائشِ دو جہاں سایہ میں ترے
دنیا کا وسیلہ دین کا ہادی تو ہے

عشق ومحبت جو ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔حالؔی نے ڈیڑھ سوسال پہلے جس عشق کی طرف اشارہ کیا تھا،اُس میں انھیں تباہی اور بربادی کا منظر نظر آیا۔ گویا دو دِلوں کا میل نہیں ہورہا تھا بلکہ جھگڑے اور تنازعے پیدا ہورہے تھے۔اس عشق نے گھرانوں کو تباہ کیا،خاندانوں کو اجاڑا،قوموں کو ذلیل ورسوا کیا،جوانوں کو تباہ کیا۔یہاں تک کہ پیروں کو بھی بدحواس کر کے چھوڑا۔حالؔی نے اس قسم کے عشق کو ڈیڑھ صدی قبل دیکھا تھا اور دراصل اس رباعی کے پیچھے صرف قوم کے جوانوں ہی کی اصلاح کارفرما ہے کہ عشق سے باز رہے کہ اس میں صرف تباہی اور بربادی ہی ہاتھ آتی ہے۔عشق کی یہ صورتِ حال جس کا عکس حالؔی نے پیش کیا تھا آج کے عہد میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔اب اس میں اس قدر شدت پیدا ہوگئی ہے کہ انسان توبہ توبہ کہنے اور سرگرانی پر مجبور ہوجاتا ہے۔عشق جو ہوس کا مترادف ہو چکا تھا اور قوموں کی تباہی کا خاص سبب بن رہا تھا۔مولانا حالؔی اس سے سخت بےزار ومتنفر تھے۔وہ اس کو ہزاروں بیماریوں کا گھر بتاتے ہیں۔اس حوالے سے کچھ رباعیاں ملاحظہ ہو:

اے عشق کیا تو نے گھرانوں کو تباہ
پیروں کو خرف اور جوانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری
قوموں کو ذلیل، خاندانوں کو تباہ

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا
یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے، پر اتنی ہے خبر
اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

حالی نے گداگری کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی ہے۔انھوں نے دکھایا ہے کہ لوگ کس قدر پستی کا شکار ہو گئے تھے۔اُس زمانے کے افراد جن خرابیوں میں مبتلا تھے، حالی نے ان کی عکاسی اپنی رباعیات میں احسن اسلوب میں کی ہے۔انھوں نے ایک مریض کو مرض سے آگاہ کیا ہے ساتھ ہی حالی نے ایک ہمدرد معالج کی حیثیت سے اس کا علاج بھی تجویز کیا ہے۔مولانا حالی نے اپنے اندر بلند اخلاقیات پیدا کرنے اور سماجی امراض سے چھٹکارا پانے کے لیے حصولِ علم پر زور دیا ہے۔اس تعلق سے ''گدائی کی ترغیب'' کے بعنوان ایک رباعی ملاحظہ فرمایئے:

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا
کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا اُن کی گردن پہ وبال
دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

حالی نے اپنی رباعیات کے ذریعے دردمندی کے ساتھ ناصح بن کر قوم کی اصلاح فرمائی ہے۔وہ قوم کے ابتر حالات کے تئیں بہت سنجیدہ تھے۔حالی نے ماحول کے اس مدو جزر کا بغور مطالعہ کیا اور اس سے بڑی حد تک متاثر ہوئے۔اس طرح حالی کی رباعیات اس دور کی یادگار ہیں۔حالی نے غرور کو عیب سے بدتر قرار دیا ہے۔عیب جو ہر کسی شخص میں کسی نہ کسی مقدار میں پایا جاتا ہے لیکن انھوں نے عیب سے بھی بچنے کی تلقین کی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بات بھی ذہن نشین کراتے ہیں کہ کہیں عیب سے غرور و تکبر کا نشہ نہ بڑھ جائے کیونکہ سب عیبوں سے برتر چیز انسان کا غرور ہے۔حالی وقت کی اہمیت سے بھی روشناس کراتے ہیں کہ یہاں ہر انسان کی زندگی کی معیاد مقرر ہے جس کے آگے پیچھے نہیں ہو سکتا،کوئی کام کرنے کے لیے انسان کو مہلت نہیں مل سکتی، جو دنیا میں آیا ہے کل اس کو جانا بھی ہے۔انھوں نے وقت کی قدر و قیمت کا احساس بھی کرایا ہے۔یہاں کام سے مراد نیکی کے کام ہیں نہ کہ دنیاوی عیش و آرام کی خاطر نبٹانے والے کام۔ایک رباعی میں حالی انسان

کی نرم گفتاری کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اگر کوئی زہر بھی اگلے تو اس کے ساتھ نرم روّیہ اختیار کرتے ہوئے میٹھی باتیں کیجیے کیونکہ غصہ غصّے کو اور بھڑکاتا ہے اور اس مرض کا علاج بالکل نہیں۔ حاؔلی کے مطابق حسن گفتاری کے ساتھ ساتھ کردار کا اعلیٰ ہونا لازمی ہے ورنہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جس قدر گفتار بڑھ جاتا ہے اسی قدر کردار میں خراب بھی آجاتی ہے۔ حاؔلی انسان کے کام کرنے پر زور دیتے ہیں کیونکہ بغیر کام کے زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ اگر جینا ہے ہی تو کام کیجیے زندوں کی طرح، مردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے۔ کاہلی اور سستی کی بھی انھوں نے سخت مذمت کی ہے کیونکہ یہ بُری عادتیں گھرانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں، حاؔلی اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق حاؔلی کی چند رباعیاں ملاحظہ فرمایئے:

یہاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام اُن کو جلدی نپٹاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
پر عیب سے بچیۓ تابمقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ، پر خبردار رہو
گھٹنے سے کہیں اُن کے نہ بڑھ جائے غرور

جو کرتے ہیں کچھ، زبان سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع، دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حُسنِ گفتار
بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

رباعیاتِ حالؔی کے مطالعہ سے عیاں ہوجاتا ہے کہ جس طرح حالؔی نے اپنی نظموں کے ذریعہ قوم کی اصلاح کی اس سے بھی زیادہ قوم کی اصلاح کا جذبہ ان کی رباعیوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ حالؔی مفکر تھے، شاعر تھے، ایک بلند درجے کے ناقد تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک عظیم انسان بھی تھے، وطنیت اور قوم کی ملنساری کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے پورے علمی سرمایے کو قوم کے لیے وقف کیا۔ حالؔی کی رباعیات کے اصلاحی پہلو کو شیر علی قدوائی نے بھی ''ادبی مقالات'' میں واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''حالی کی بعض رباعیات عوام میں مقبول ہیں۔ اکثر باعیات اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہیں اور بعض پر تو پند و وعظ کا دھوکا ہوجاتا ہے۔''

(بحوالہ مطالعہ حالی از ساحل احمد، ص 243)

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی کی بعض رباعیوں پر پند و وعظ کا دھوکا ہوجاتا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں قوم کی فلاح و بہبودی کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ وہ اپنے پیغام کو اپنے طرز بیان پر ترجیح دیتے تھے۔ دراصل حالؔی پیغمبر پہلے تھے اور شاعر بعد میں۔ حالؔی کی اس پیغمبری کی طرف ڈاکٹر سید عابد حسین نے بھی اشارہ کیا ہے اور ساتھ ہی اکبر اور حالؔی کے نظریات کا فرق بتایا ہے۔ یہی فرق حالؔی اور اکبؔر کی رباعیات پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ دو ادیبوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی مایوسی کو توڑا۔ ایک حالؔی نے سوز دروں کے لہجہ میں ملّت اسلامیہ کو اس عروج و زوال کی داستان سنا کر گذشتہ عظمتِ اقبال کی یاد تازہ کردی اور موجودہ پستی و نکبت پر غیرت دلائی۔ دوسرا اکبؔر جس نے ظرافت کے پیرائے میں مسلمانوں کو غیروں کی ذہنی غلامی کی ذلت سے آگاہ کیا اور ان کی نظر میں اپنے مذہب و تمدن کا احترام دوبارہ قائم کردیا۔ حالؔی جدت پسند تھے۔ قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے اور جدید تہذیب کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ اکبؔر قدامت پسند تھے۔ نئی روشنی کی ہر چیز پر ہنستے تھے اور پرانی روشنی کی ہر چیز کو سراہتے تھے مگر دونوں نے مسلمانوں میں غیرتِ قومی کے جذبات کو ابھارا۔ اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ دیا اور یاس و تاریکی میں اُمید کی ایک جھلک دکھائی۔ ڈاکٹر شہزاد انجم لکھتے ہیں:

''حالی کی رباعیوں نے عام عوام کو غور وفکر کی دعوت دی۔ وہ قوم وملت کے غم خوار تھے اور سماج کی پھیلی ہر طرح کی برائیوں پر ان کی نظر تھی اور ان برائیوں کو وہ جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے اپنی شاعری سے بھی کام لیا۔''

(مونوگراف خواجہ الطاف حسین حالی از ڈاکٹر شہزاد انجم، ص92)

حالی نے قوم کے جوانوں میں ولولہ قائم کرنے کی خاطر تاریخ کو دہرایا، اپنے اسلاف کے کارناموں، ان کی حوصلہ مندی اور عظیم تاریخ کو بیان کیا نیز قوم وملت میں اصلاح کرنے اور اخلاقی درس دینے کی بھرپور کوشش کی۔ حالی کی رباعیوں میں قوم وملت کی اصلاح کا جذبہ کارفرما تو تھا ہی، ساتھ ہی سیاست داں کا دماغ، ماہر تعلیم کا ذہن، فلسفی اور حکیم کی نظر سب کچھ موجود ہے۔ ان کی ژرف نگاہی نے جو دیکھا، ان کے شعور نے جس طرح زمانے کے حالات کو سمجھا اور زندگی میں جس قسم کے تجربات کیے وہ سب ان کی رباعیوں میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔

# حوالہ جات


1۔ حالیؔ بحیثیتِ شاعر، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، دسمبر 1960، ص 23

2۔ ایضاً: ص 235

3۔ ایضاً 236

4۔ مطالعہ حالیؔ، مرتبہ از ساحل احمد، اُردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، 1997، ص 242

5۔ ایضاً: ص 243

6۔ ایضاً: ص 244

7۔ ایضاً: ص 245

8۔ مطالعہ حالیؔ، مرتبہ از ساحل احمد، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، 1997، ص 242

9۔ جہانِ اُردو رباعی، علیم صبا نویدی، تامل ناڈو، اُردو پبلی کیشنز، چنئی، 2011، ص 29

10۔ ایضاً: ص 31

11۔ دیوانِ حالیؔ، مقدمہ از رشید حسن خاں، اُردو اکادمی، دہلی، 2016

# افسانوی ادب کا ایک گُم شدہ فن کار: بلونت سنگھ

بلونت سنگھ کو افسانوی ادب کا گُم شدہ فن کار قرار دینا قارئینِ اردو کے لیے بالعموم اور فکشن ناقدین کے لیے بالخصوص کسی المیے سے کم نہیں۔ جن افسانہ نگاروں نے آزادی سے قبل افسانہ نگاری میں اچھی خاصی شہرت پائی ان میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔ ان سے قبل بھی کئی اہم افسانہ نگار پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کے معاصرین میں ایک دو نہیں بلکہ بہت سے افسانہ نگاروں نے اردو فکشن میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ جن میں غلام عباس، خواجہ احمد عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، مہندر ناتھ، ممتاز مفتی، بلونت سنگھ، دیوندر ستیارتھی اور قدرت اللہ شہاب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ کئی افسانہ نگاروں نے کچھ مدت تک افسانے لکھے اور بعد میں اس میدان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اردو میں بعض ایسے بھی افسانہ نگار پیدا ہوئے جنھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور بے شمار افسانے تخلیق کر کے اردو ادب کی تاریخ میں اپنا نام درج کرا لیا۔ چنانچہ ان افسانہ نگاروں نے چند یادگار افسانوں کے ذریعے ادبی حلقے میں خوب شہرت کمائی۔

بلونت سنگھ بھی اسی قبیل کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ جنھوں نے اردو کے چھے افسانوی مجموعے، چار ناول، تین ناولٹ، ڈرامے اور کئی طنز و مزاحیہ مضامین لکھے ہیں۔ ان کا تخلیقی سرمایہ نہ صرف اردو میں شائع ہوا بلکہ ہندی میں ان کے دس افسانوی مجموعے اور چوبیس ناول شائع ہو چکے ہیں۔ بلونت سنگھ کے اردو میں لکھے گئے افسانوی مجموعوں میں ''جگا''

(اپریل 1944) ''تاراپوڈ'' (سن اشاعت درج نہیں ہے، ڈاکٹر جمیل اختر کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب 1945 کے اواخر میں یا 1946 کے اوائل میں شائع ہوئی ہے) ''ہندوستان ہمارا'' (1947)، ''سنہرا دیش'' (سن اشاعت درج نہیں، ڈاکٹر جمیل اختر کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب 1950 کی دہائی میں شائع ہوئی ہوگی)، ''پہلا پتھر'' (دسمبر 1953) اور ''بلونت سنگھ کے افسانے'' (سن اشاعت درج نہیں) قابلِ ذکر ہیں۔ بلونت سنگھ کے اردو ناولوں میں ''رات، چور اور چاند'' (1961)، ''چک پیراں کا جسّا'' (سن اشاعت درج نہیں) اور ''کالے کوس'' (سن اشاعت درج نہیں ہے) ناول ہیں۔ جب کہ ایک ''معمولی سی لڑکی''، 'عورت اور آبشار' اور ''راوی بیاس'' ان کے ناولٹوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سب کتابوں پر کہیں سن اشاعت درج نہیں ہے۔

بلونت سنگھ کے سارے افسانوی مجموعے پاکستان سے شائع ہوئے ہیں۔ ماسوائے افسانوی مجموعہ ''ہندوستان ہمارا''، جس کو الہ آباد سے سنگم پبلشرز نے شائع کیا تھا۔ یہ سب افسانوی مجموعے بلونت سنگھ کی زندگی میں اور زیرِ نگرانی ہی شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان کتابوں کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی۔ ہمیں احسان ماننا چاہیے ڈاکٹر جمیل اختر کا جنھوں نے بلونت سنگھ کے افسانوی مجموعوں اور ناولوں کو تحقیق، تدوین اور ترتیب کے بعد آٹھ جلدوں میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان سے شائع کیا۔ جمیل اختر ہمیشہ ایسے کام کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہیں جن سے لوگ یا تو خوف کھاتے ہیں یا نام سنتے ہی سر دُھنتے ہیں۔ جمیل اختر کا تحقیقی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا ہر طریقہ نرالا ہوتا ہے۔ انھوں نے بلونت سنگھ کے افسانوی مجموعوں میں پہلے سے شامل 65 کہانیوں کے علاوہ نئی دریافت شدہ 67 کہانیوں کو بھی کلیات میں شامل کر دیا ہے جن سے بلونت سنگھ کے افسانوں کی مجموعی تعداد 132 تک پہنچتی ہے۔ اگر اس فہرست میں ہندی کے دس افسانوی مجموعوں میں شامل 112 کہانیوں کو بھی جوڑ دیا جائے تو یہ تعداد 244 سے تجاوز کر جاتی ہے۔ بلونت سنگھ کی کہانیوں کی یہ فہرست حتمی نہیں ہے۔ اس میں اور بھی اضافے کی گنجائش موجود ہے۔ بہر کیف بلونت سنگھ کے حوالے سے جمیل اختر کی تحقیق معتبر اور مستند قرار دی جاسکتی ہے۔ مواد

کی فراہمی میں انھیں کن دشوار گزار اور جاں توڑ مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ ہم لگا سکتے ہیں۔جمیل اختر نے بلونت سنگھ کے ساتھ اپنی دلچسپی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''بلونت سنگھ کے کلیات کو مرتب کرنے کا خیال میرے دل میں کئی وجھوں سے پیدا ہوا۔جس میں سب سے بڑی وجہ اس عظیم افسانہ نگار کو ناقدوں کے ذریعے نظر انداز کیا جانا تھا۔اردو اور ہندی میں ملا کر تین درجن سے زائد کتابوں کا مصنف اور بقولِ اوپندر ناتھ اشک تقریباً ''تین سو کہانیوں کا خالق'' ہونے کے باوجود ان کے انتقال کے بعد نہ ہی اخبارات میں ان کے موت کی خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی اور جب ارتھی اُٹھی تو اردو، ہندی کے ادیبوں میں سے کوئی وہاں موجود نہیں تھا۔یہ کیسی دردنا کی تھی۔نہ ہی کسی رسالے نے اس کے شایانِ شایان کوئی نمبر ہی شائع کیا۔سوائے چند ایک کے۔مضامین لکھنے والے لوگوں کی بھی بے حد کمی رہی ۔ زیادہ تر مضامین رسائل نے ایک دوسرے سے نقل کیے۔شاید کسی ناقد نے لکھنے کی حامی نہیں بھری۔یہ ناانصافی اور دردنا کی مجھ سے دیکھی نہ گئی اور یہیں سے یہ خیال پختہ تر ہوا کہ پرانی پیڑھی نے جو کیا سو کیا۔میں نئی پیڑھی سے ان کو متعارف کراؤں تا کہ اس ناانصافی کی تلافی ہو سکے۔یہ سوچ کر قدم آگے بڑھایا۔''

(کلیات بلونت سنگھ(افسانے)،جلد چہارم، جمیل اختر، این سی پی یو ایل،نئی دہلی، 2010ص8)

ڈاکٹر جمیل اختر سے پہلے بلونت سنگھ پر سب سے پہلی کتاب ''بلونت سنگھ کے بہترین افسانے'' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی لکھی ہوئی ہے۔اس میں بلونت سنگھ کی شخصیت اور فن پر گوپی چند نارنگ نے مفکرانہ انداز میں بہت ہی مبسوط مقدمہ بعنوان ''سائیکی، ثقافت اور شکست رومان'' 70 صفحات پر تحریر کیا ہے۔انھوں نے اب تک جن موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔اُن میں اپنی تحقیق وتنقیدی صلاحیت، علمی ذکاوت وادراک کی قوت، عالمانہ سوجھ بوجھ اور

بصیرت افروز معلومات کی بنیاد پر نئے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ان کے بلیغ ذہن اور روشن دماغ ہی کی یہ نسبت بلونت سنگھ آج پوری اردو دنیا سے متعارف ہو چکے ہیں۔انہی کی تحریک پر ''کتاب نما''، ''جامعہ''، ''سوغات'' اور ''آجکل'' میں بلونت سنگھ پر خصوصی گوشے شائع کیے گئے۔ ''بلونت سنگھ کے بہترین افسانے'' کتاب کے ہندی اور انگریزی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔اس کتاب میں بلونت سنگھ کے اکیس بہترین افسانوں کا انتخاب شامل ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بعد اور جمیل اختر سے پہلے بلونت سنگھ پر ہندوستان کی مختلف جامعات میں تین تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔ان میں ایک مقالہ دہلی یونی ورسٹی، دوسرا مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونی ورسٹی اور تیسرا مقالہ کلکتہ یونی ورسٹی میں لکھا گیا ہے۔ممتاز آرا کو دہلی یونی ورسٹی میں ''بلونت سنگھ: شخصیت اور فن'' پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ان کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں 2003 میں شائع ہوا۔ان تینوں مقالات میں کوئی نئی اور پُر مغز تحقیق نظر نہیں آتی۔اس کی وجہ بلونت سنگھ کے تئیں اردو ناقدین کا ادبی یا ذاتی تعصب ہو سکتا ہے۔دوسری وجہ مواد کی عدم دستیابی ہے۔لیکن پھر بھی ان کی تحقیق برحق قرار دی جا سکتی ہے

بلونت سنگھ کے تخلیق کردہ ادبی سرمایے پر اتنا کم لکھا گیا ہے کہ چند سطروں میں پوری داستان بیان ہو سکتی ہے۔پرانے تو پرانے آج کے ادبا اور ناقدین حضرات بھی تنگ نظری کے شکار نظر آتے ہیں۔ایسے میں کہا جا سکتا ہے کہ ادبی دائرے کو وسعت بخشنے اور کشادگی عطا کرنے کے بجائے اسے سمیٹنے کی کوشش کی جارہی ہے۔بلونت سنگھ پر نہ لکھنے کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟اس کا خلاصہ اس مضمون کی آئندہ سطور سے خود بخود واضح ہوتا جائے گا۔

بلونت سنگھ جون 1921 میں ضلع گوجرانوالہ موضع بہلول، مغربی پنجاب، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں کے پریپریٹری اسکول میں ہوئی۔ان کے والد لال سنگھ دہرہ دون کے ملٹری کالج میں لکچرر تھے۔کچھ سال بعد انھیں بھی والد کے پاس دہرہ دون جانا پڑا۔یہیں سے انھوں نے میٹرک کیا۔بعد میں الہ آباد یونی ورسٹی سے ایف۔اے اور پھر اس کے بعد بی۔اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔1948 میں ان کی شادی ہوئی۔لیکن

بعض وجوہ کی بنا پر ایک سال بعد ہی طلاق لیا۔ اس کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بقول دوسری شادی اکیس برس بعد منجھو سے ہوئی، جن سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئی۔ ان کی دوسری بیوی ان سے 25 سال چھوٹی تھی۔ بلونت سنگھ جولائی 1948 سے جنوری 1950 تک پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند کے رسائل ''آجکل''، ''بساطِ عالم'' اور ''نونہال'' کے ادارتی عملے سے وابستہ رہے۔ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد مستقل طور پر الٰہ آباد منتقل ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کے والد کا انتقال بھی ہو گیا۔ ابتدا میں والد کے قائم کردہ ''امپیریل ہوٹل'' کو سنبھالا۔ لیکن بعد میں عدم توجہی کے باعث ہوٹل کو فروخت کردیا۔ آخر میں کینسر جیسی موذی بیماری لاحق ہوئی۔ بالآخر 27 رمئی 1986 کو ان کا انتقال ہوا۔

بلونت سنگھ بڑے بڑے اعزازات کے مستحق تھے لیکن ان کی زندگی میں انھیں صرف اتر پردیش سرکار ادبی ایوارڈ، بھاشا وبھاگ حکومتِ پنجاب کا ادبی ایوارڈ اور پنجاب ہی سے شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی اردو اور ہندی زبانوں میں مجموعی طور پر چالیس سے زائد تصانیف شائع ہوئی ہیں جن میں زیادہ تر ہندی کتابیں ہیں۔ بلونت سنگھ کو اردو میں غیر معمولی صلاحیت حاصل تھی۔ پھر اردو میں کم لکھنے کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟۔ اس کو جمیل اختر کے مندرجہ درج ذیل اقتباس سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

> ''ہندوستان ہمارا'' کو چھوڑ کر بلونت سنگھ کے باقی تمام افسانوی مجموعے پاکستان میں شائع ہوئے ہیں۔ ''ہندوستان ہمارا'' الٰہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ تمام مجموعوں کی اشاعت دوم کی نوبت نہیں آئی۔ قاری نے بھی نہ جانے کیوں ایسی بے رُخی برتی کہ بلونت سنگھ یا تو دل بدل ہو گئے یا انھوں نے اس جانب توجہ نہیں دی اور صرف ہندی میں کتابیں چھپوانے میں مشغول رہے۔ کیونکہ تقسیم کے کچھ دنوں بعد اردو کی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ہندی میں لکھنا شرع کردیا تھا۔ اردو میں برائے نام لکھتے تھے۔''
>
> (کلیات بلونت سنگھ از مرتب کردہ جمیل اختر، جلد 1، ص 22)

بلونت سنگھ نے اردو میں کئی لازوال کہانیاں لکھیں۔ انھوں نے پہلی کہانی ''سزا''

میٹرک میں لکھی تھی جو ماہ نامہ ''ساقی'' دہلی میں شائع ہوئی تھی جس کو پڑھ کر کرشن چندر بھی بے حد متاثر ہوئے تھے۔ بلونت سنگھ نے نریش کمار شاد کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ نذیر احمد چودھری کے بقول ''کرشن چندر تو لاہور بھر میں ''ساقی'' کے اس شمارے کو گھماتا پھرا اور اپنے ہر ملنے والے سے کہتا رہا کہ دیکھو افسانے یوں لکھے جاتے ہیں۔'' اس کے بعد بلونت سنگھ کا قلم نہیں رُکا بلکہ مسلسل لکھتے گئے۔ ان سے پہلے بیدی، کرشن چند، عصمت، منٹو وغیرہ اردو ادب میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ لیکن جب بلونت سنگھ نے افسانوی دنیا میں اپنے قدم جمانے شروع کیے۔ تو ان افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ بلونت سنگھ کے بھی افسانے شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے جن ملکی اور غیر ملکی افسانہ نگاروں سے اثر قبول کیا ہے۔ ان میں اردو میں کرشن چندر، سدرشن، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، حجاب امتیاز اور غیر ملکی افسانہ نگاروں میں چیخوف، کیتھرین، مینس فیلڈ، ڈی۔ ایچ۔ لارنس، ٹامس مان، ٹالسٹائی وغیرہ اہم ہیں۔

بلونت سنگھ نے بہت لکھا اور اعلیٰ درجے کا لکھا۔ ان کے لکھے ہوئے افسانے نامور رسائل ''ساقی''، ''ادبی دنیا''، ''آجکل''، ''سوغات''، ''نقوش''، ''ہمایوں''، ''فسانہ''، ''مسیحی دنیا''، ''نئی دنیا''، ''تیج ویکلی'' وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ بلونت سنگھ نے اس زمانے میں لکھا جب ترقی پسند تحریک کا دور دورہ تھا۔ ادب میں افادیت ترقی پسندی کے لیے نزدیک ناگزیر تھی۔ ہر ادیب ترقی پسند تحریک کی حمایت میں لکھتا تھا۔ کرشن چندر، عصمت، بیدی، منٹو، خواجہ احمد عباس، غلام عباس وغیرہ سب ترقی پسند کہانیاں لکھتے تھے۔ قطع نظر اس کے بلونت سنگھ کی کہانیوں میں بظاہر کوئی ایسی افادیت نہ دکھائی دیتی تھی۔ شاید اس لیے کہ کسی نقاد یا ادیب نے اعلیٰ درجے کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں بلونت سنگھ کا نام نہیں لیا۔ اس کی ایک وجہ بلونت سنگھ کی انا بھی تھی جو انھیں اپنے زمانے کے دوسرے ادیبوں سے دور کر رہی تھی۔ وہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کو اپنے سے کم تر تصور کرتے تھے۔ ابتدا سے آج تک 'ادب' مختلف ادبی گروہوں، ادبی تحریکوں اور دبستانوں کے زیر اثر وجود میں آتا رہا ہے اور ہر زمانے میں ادبا ان ہی حلقوں اور گروہوں کے بنائے ہوئے اصولوں کے کاربند اور پیروکار رہے ہیں۔ بلونت سنگھ کے دور میں بھی ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ اکثر بیشتر ادبا

اسی کے بنائے میمورنڈم اور بینر تلے لکھتے تھے۔ افسانہ نگاروں کے اپنے اپنے گروہ تھے جو اپنے اپنے لوگوں کا نام اچھالتے تھے لیکن بلونت سنگھ نے نہ کبھی کسی حلقے کا اثر قبول کیا، نہ ہی کسی گروہ کے ساتھ وابستہ رہے، نہ کسی نقاد کو پٹایا اور نہ ہی کبھی کسی سے لکھنے کی فرمائش کی۔ یہاں تک کہ رسائل کے مدیران ان کی کتابوں پر خود انہی سے مضمون لکھوانے کی پیش کش کرتے۔ یہ کیا کسی المیہ سے کم ہے کہ شخصیت کی آڑ میں ادب کو قربان کیا جا تا رہا ہے۔ بلونت سنگھ کو اپنے معاصرین سے شاذ ہی ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ دوست واحباب انھوں نے بنائے ہی نہیں۔ انھوں نے بالکل گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ کہیں جانا ہوتا تو اکیلے ہی جاتے۔ ان کی شخصیت نمایاں ہونے میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ ملنا جلنا انھیں پسند نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ''اَن سوشل'' کہا گیا۔ بلونت سنگھ پر مضامین اور دوسری لکھی ہوئی تحریروں سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ اندرون بین شخص تھے۔ انھوں نے دنیا کی باتوں سے بے پروا ہو کر لکھا اور بہت لکھا۔ یہاں تک ان کے لکھنے کی رفتار بڑھتی گئی اور وہ اپنے تخیل کی خلق کی ہوئی دنیا میں مگن ہو گئے تھے۔ ان کی کہانیوں کی مہک اور نگارنگی سے ان کی زندگی کا اصلی حسن نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ پرفیسر گوپی چند نارنگ نے بلونت سنگھ کی افسانوی جہات کا مندرجہ ذیل اقتباس میں تذکرہ کیا ہے:

> ''اردو افسانہ تنوع کے اعتبار سے ایک قوس قزح کی طرح ہے، جس کے رنگ ایک کے بعد ایک تنے ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ بلونت سنگھ کو ان کی زندگی میں بھی کوئی اہمیت نہ دی گئی، اور موت کے بعد تو فراموش ہی کر دیا گیا۔ لیکن اردو افسانوں کے رنگوں میں ایک رنگ بلونت سنگھ کا بھی ہے، جو خاصا خوشنما ہے اور دوسروں سے الگ بھی ہے، افسانوں کے افق پر اس وقت منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چھائے ہوئے تھے۔ جس سے بلونت سنگھ کی مہک پھیلی تو لیکن اتنی نہ پھیلی جتنا اس کا حق تھا۔ اس میں کچھ خود بلونت سنگھ کی کم آمیزی کا بھی دخل تھا اور کچھ یہ بھی کہ بعد میں ان کی زیادہ تر کتابیں، ناول اور افسانے ہندی میں بھی شائع ہوتے رہے اور اردو

نے اپنے ایک البیلے فنکار کو فراموش کر دیا۔"

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے از مرتبہ گوپی چند نارنگ، ص68)

بلونت سنگھ شریف النفس، خوددار، خود پسند، بے باک، صاف گو اور تنہائی پسند آدمی تھے۔ان کی سادگی، بے ساختگی اور نرم مزاجی کا اثر ان کے افسانوں پر بھی پڑا ہے۔ بلونت سنگھ کی طرف اگر چہ ابتدا سے ہی کم توجہ مبذول فرمائی گئی لیکن ان کے تخلیق کیے گئے افسانوں کو ہمیشہ پسند کیا گیا۔ بلونت سنگھ اردو کے معروف اور بلند پایہ افسانہ نگار تھے۔اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار کرشن چندر نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "بلونت سنگھ ان خوش نصیب افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو صرف ایک افسانہ لکھ کر بقائے دوام حاصل کر لیتے ہیں۔ان کا افسانہ "سزا" ان کی پہلی کوشش ہے لیکن اس قدر کامیاب، اس قدر خوبصورت، اس قدر جامع کہ حرفِ اول حرفِ آخر معلوم ہوتا ہے۔" راجندر سنگھ بیدی نے بھی ان کے افسانوں کے تنوع اور شگفتگی کی داد دی۔ پروفیسر وقار عظیم بلونت سنگھ کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

"بلونت سنگھ کے متعلق میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ انھیں دیکھ کر افسانہ کا گمان تو ہو سکتا ہے، افسانہ نگار کا نہیں۔ جب یہ بات لکھی گئی تھی اس کے بعد سے بلونت سنگھ نے اپنے اور بھی زیادہ افسانہ نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے، اور اپنی افسانہ نگاری کی بہت تھوڑی عمر میں اپنے آگے چلنے والوں سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔"

(نیا افسانہ از وقار عظیم، ص190)

ان ناقدین میں شمس الرحمٰن فاروقی کا نام بھی اہم ہے، جنھوں نے بلونت سنگھ کو ابتدا سے ہی پڑھا اور بعد میں ایک مبسوط مقالہ تحریر فرما کر اردو والوں کی بلونت سنگھ کے تئیں ناحق شناسی کی بازیافت کی ہے۔ان کے مطابق:

"آج کے لوگوں میں سے اکثر نے بلونت سنگھ کا نام ہی نام سنا ہوگا، ان کی کوئی تحریر پڑھی نہ ہوگی۔ ہاں جب ہم لوگ ادب کی دنیا میں داخل ہو رہے تھے، اور ہر نو آمدہ ادیب کی جیب میں ایک دو افسانے ہر وقت پڑے رہتے

تھے، اور ہر شخص، منٹو، بیدی، کرشن چندر کے تازہ افسانوں کو جلد از جلد پڑھ
ڈالنا چاہتا تھا، ان دنوں میں بلونت سنگھ کے بھی جاننے والے، ماننے
والے اور چاہنے والے بہت تھے۔"

(افسانے کی حمایت میں از شمس الرحمٰن فاروقی، ص76)

بلونت سنگھ اردو کے ایک مقبول افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کو اُس وقت بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور دلچسپی سے پڑھا گیا جس وقت اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگاروں کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ مندرجہ بالا میں پیش کی گئی مختلف مشاہیر کی آرا سے اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔

بلونت سنگھ کثیر التصانیف اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ اگر چہ ناولوں کے برعکس ان کے افسانوی کتابوں کی تعداد کم ہے لیکن جتنی بھی ہے ان کے ناولوں پر بھاری پڑتی ہے۔ بلونت سنگھ نے پنجاب کے دیہات، دیہات میں رہنے والے کسانوں، ان کسانوں کی جفاکش زندگیوں، نچلے اور درمیانہ طبقے کے دیہاتیوں، ان دیہاتیوں کی معاشی اور اخلاقی اقدار کی صورتِ حال، ان کی مظلومیت، بھوک، بے کاری، ذہنی اور نفسیاتی مسائل، دیہات میں رہنے والے مختلف مذاہب کے لوگوں، ان کے فکر و احساسات، جذبات اور خیالات، رشتوں، ان کی جرائم پیشہ زندگی، تند مزاجی وغیرہ کو اپنے افسانوں کے موضوعات بنا کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سِکھ خصوصاً جاٹ سِکھ کو بنیادی کردار بنانے کی بے حد عمدہ کوشش ہے۔ مشکل سے ہی کوئی افسانہ ایسا ہوگا جس میں جاٹ سِکھ کے کردار کا استعمال نہ کیا گیا ہو اور جس خوبی سے اس کردار کو افسانوں میں پیش کیا ہے وہ انہی کی تخلیقی صلاحیت کا خاصہ ہے۔

ہندوستان کی سماجی زندگی دیہات سے عبارت ہے۔ اس لیے ہمارے بیشتر ابتدائی افسانہ نگاروں کے یہاں دیہات سے جڑے بہت سارے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں پریم چند، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی، سدرشن، علی عباس حسینی، بیدی، عصمت چغتائی وغیرہ شامل ہیں۔ بلونت سنگھ سے پہلے بھی ہمارے

یہاں بعض افسانہ نگاروں نے پنجاب کے دیہات کو موضوع بنایا ہے۔ البتہ جب بلونت سنگھ اس میدان میں آئے، ان کے افسانوں کو پڑھ کر یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم نے اب تک پنجاب کے دیہات کو یا تو دیکھا نہیں تھا یا دیکھا تھا تو بہت دور سے دیکھا تھا۔ پنجاب کے دیہات سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ بدحال کسانوں اور ظالم زمینداروں کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جاگیردارانہ معیشت، جہالت، مفلسی اور ان سب کے پیدا کردہ حالات جن کا دباؤ آدمی کو جرائم پیشہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ''بابا مہنگا سنگھ''، ''کالی تیتری''، ''پنجاب کا البیلا''، ''تین چور'' اور ''گرنتھی'' جیسے افسانوں میں کم و بیش انہی موضوعات کو بنیاد بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب ''بلونت سنگھ کے بہترین افسانے'' میں جن افسانوں کو شامل کیا گیا ہے ان میں ''جگا''، ''گرنتھی''، ''سزا''، ''راستہ چلتی عورتیں''، ''تین باتیں''، ''کالے کوس''، ''لمحے''، ''ہندوستان ہمارا''، ''دیبلے 38''، ''پہلا پتھر''، ''دیش بھگت''، ''سورما سنگھ''، ''کالی تیتری''، ''گمراہ''، ''نہال چند''، ''خوددار''، ''سمجھوتہ''، ''پیپرویٹ''، ''دیمک'' اور ''کٹھن ڈگریا'' خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کا شمار بلونت سنگھ کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب بلونت سنگھ ان کے بہترین افسانوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے بھی ''گرنتھی''، ''دیوتا کا جنم''، ''سزا'' اور ''چکوری'' وغیرہ کا ذکر کیا۔ جب گوپی چند نانگ نے ان کے بہترین افسانوں کا انتخاب کیا تھا۔ تب ان کے سامنے محض وہی چھے افسانوی مجموعوں میں شامل 65 کہانیاں رہی ہوں گی۔ لیکن اب صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے۔ اب اس میں جمیل اختر کی بہترین تحقیقی صلاحیت سے مزید 67 کہانیوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر اس وقت بلونت سنگھ کے بہترین افسانوں کی بات کی جائے گی، تو اس میں یقیناً اور بھی کہانیاں شامل کی جا سکتی ہیں۔

''جگا'' کو بلونت سنگھ کے بہترین رومانی افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یوں تو ان کی بہت ساری کہانیوں میں رومان، حقیقت اور تخلیقی حسیّت کے آہنگ کا امتزاج بالعموم نظر آتا ہے۔ لیکن ''جگا'' ان میں سے بالکل ایک منفرد کہانی ہے۔ اس کہانی کا آغاز بھیکن نام

کے ایک چھوٹے سے غیر معروف علاقے سے ہوتا ہے جہاں صرف سکھوں کی آبادی تھی۔
اس گاؤں میں حسین لڑکیوں کا پیدا ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب یہ لڑکیاں جوانی میں قدم رکھتی تھیں تو روایتی طور پر یہاں عشقیہ کہانیوں کا جنم ہوتا تھا۔ گورنام اسی گاؤں کی ایک حسین، شیتل، کومل، نرمل، چنچل، نازک، معصوم الھڑ لڑکی تھی جس کے کئی دیوانے تھے۔ شدگار اسنگھ اور دلیپ سنگھ بھی اس کے عاشق تھے۔ شدگار اسنگھ کے ہوتے ہوئے گاؤں میں کوئی بھی گورنام کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک دفعہ دلیپ اس سے مار بھی کھاتا ہے۔ لیکن ایک روز ''جگا'' نام کا ایک خوفناک ڈاکو جس کا اصلی نام سردار جگت سنگھ وِرک تھا، رات کی تاریکی میں سانڈنی پر سوار اس گاؤں سے گزرتے ہوئے رہٹ پر پیاس بجھانے کے لئے رکتا ہے۔
بلونت سنگھ نے ''جگا'' کے کردار کو بڑے خوفناک اور وحشت ناک انداز میں پیش کیا ہے۔
آس پاس کے سبھی علاقوں کے لوگ جگا کے نام سے کانپتے اور لرز جاتے تھے لیکن ایک دن رہٹ پر اچانک اس کی حسنِ اتفاق سے گرنام سے ملاقات ہوتی ہے۔ گرنام اس کی اصلیت سے واقف نہیں تھی۔ ''جگا'' گرنام سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے بعد اس کے ساتھ اسی کے گھر جاتا ہے۔ جہاں وہ گرنام کے گھر والوں سے اجازت حاصل کرنے کے بعد رات بھر ٹھہرتا ہے۔ وہ شام کے وقت گرنام کو اکیلے کھیتوں میں ملنے کے لیے کہتا ہے۔ گرنام اس سے بالکل معصومانہ انداز میں ملنے جاتی ہے۔ جہاں باتوں باتوں میں ''جگا'' کے ہاتھوں سے زیور گرتے ہیں۔ بالآخر سمجھانے بجھانے کے بعد دونوں ایک دوسرے کی چیزیں بدل دیتے ہیں۔ صبح کو جب ''جگا'' نکلنے کی تیاری کرتا ہے تو گرنام کا باپو اس سے نام پوچھتا ہے، جواب ملتا ہے کہ کسی سے مت کہنا کہ آج رات ''جگا'' تمہارا مہمان تھا، ورنہ انجام سب کی موت ہے۔
اس کے بعد ''جگا'' گرنام کو رات کے اندھیرے میں روز ملنے آتا ہے۔ آہستہ آہستہ ''جگا'' کو گرنام سے محبت ہوتی ہے لیکن اس محبت سے گرنام انجان تھی۔ اس دوران لوگوں کو بھی پتہ چل جاتا ہے کہ گرنام کی محبت میں ''جگا'' نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے اور اب وہ اپنے آپ کو گرنام کے قابل بنانا چاہتا ہے۔ دراصل حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ گرنام سے کبھی اپنے پیار کا اظہار نہیں کر پایا۔ ایک دن جب گرنام کے گھر والے اس کی کسی انجان لڑکے سے

شادی طے کرتے ہیں تو وہ ''جگا'' سے مدد مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ دلیپ سنگھ سے پیار کرتی ہے، 'جگا' سن کر چونک اُٹھتا ہے اور ایک دن دلیپ سنگھ پر قاتلانہ حملہ کر بیٹھتا ہے۔ مگر دلیپ سنگھ اس حادثے میں بال بال بچ جاتا ہے۔ بالآخر ''جگا'' کو حقیقی محبت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ ان دونوں کی شادی کرا دیتا ہے اور پھر سے ایک خون خوار ڈاکو کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

یہ کہانی بہت اچھا پیغام دیتی ہے۔ 'جگا' ایک بڑی قد کاٹھی کا، تندرست، لحیم شحیم، بدصورت، ظالم، سخت گیر نوجوان ہے۔ امیروں کے یہاں ڈاکہ ڈال کر غریبوں میں فراخدلی سے تقسیم کرتا ہے۔ ہر غریب کی دعا اس کے ساتھ ہے۔ کوئی اس کے خلاف گواہی دینے کو تیار نہیں۔ کیونکہ یہ سب کا اَن داتا ہے۔ لیکن ''جگا'' خون کی ہولی بھی کھیل سکتا ہے۔ گرنام سے محبت کے بعد اس میں بہت بدلاؤ آنے لگتا ہے۔ کچھ وقت تک خون خرابے سے دور بھی رہتا ہے۔ لیکن جب اس کو پتہ چلتا ہے کہ گرنام کسی اور سے پیار کرتی ہے۔ تب طیش میں آکر مرنے مارنے پر دوبارہ آمادہ ہو جاتا ہے۔ آخر کار سچی محبت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس طرح وہ گرنام اور دلیپ سنگھ کی شادی کی رسم اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا ہے۔

بلونت سنگھ نے یہاں پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک ڈاکو میں بھی انسانیت کا جذبہ موجود ہے۔ جو جابر اور ظالم سرمایہ داروں کو لوٹ کر غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ ہر چند اس کے دل میں محبت کا جذبہ بھی ہے۔ وہ غلط کاموں سے باز بھی آ سکتا ہے۔ وہ عاشق ہے لیکن محبت کو قربان کرنے کا سلیقہ بھی رکھتا ہے۔ اگر ''جگا'' چاہتا تو دلیب سنگھ کا قتل بھی کر سکتا تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ گرنام کو دُکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دراصل ایک اچھا انسان بننے کی ہر ایک خوبی ''جگا'' ڈاکو میں موجود تھی۔ تو پھر اس کو ڈاکہ زنی، لوٹ مار، خون خرابہ جیسا راستہ اختیار کرنے پر کس نے مجبور کر دیا؟۔ اس کا ذمے دار ہمارا معاشرہ ہے جو ''جگا'' جیسے ڈاکوؤں کو جنم لینے سے پر مجبور کرتا ہے۔ اوپندر ناتھ اشک اس کہانی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''جگا، تخیلی، رومانی اور فارمولا کہانی ہے۔ نک چڑھے ساتھی، ادیب یا نقاد

اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے لاکھ اسے ہوائے اڑائیں۔لیکن جب
یہ دنیا بنی ہے اور نامرادی عاشقوں کے قصّے مشہور ہوئے ہیں ایسی کہانیاں
لکھی اور پڑھی جاتی رہی ہیں اور آئندہ بھی لکھی اور پڑھی جاتی رہیں گی، اور
اگر بلونت سنگھ جیسے کسی فنکار کے سدھے ہوئے ہاتھوں کا لس اُنہیں مل گیا تو
زندہ جاوید بھی ہو جائیں گے۔''

(بلونت سنگھ: شخصیت اور فن از اوپندر ناتھ اشک، ماہ نامہ آجکل، جنوری 1995، ص8)

اس کہانی میں ماحول، واقعات، فضا، مکالمے کردار سب جیتی جاگتی دنیا کے معلوم ہوتے ہیں۔غرض کہ پوری کہانی حقیقی اور تجرباتی زندگی سے قریب تر نظر آتی ہے۔

''آزادی کے بعد اردو افسانہ: ایک انتخاب'' میں بلونت سنگھ کا ایک افسانہ ''دیش بھگت'' بھی شامل کیا گیا ہے۔ان کے کم و بیش افسانوں میں سکھ کرداروں کے ساتھ ساتھ مسلمان کردار بھی نظر آتے ہیں۔اس افسانے کی بھی یہی خوبی ہے۔''دیش بھگت'' ان کی حاضر راوی کہانی ہے جس میں راوی صرف حالات سے واقف کراتا ہے، تبصرہ نہیں کرتا۔'راوی' نے ایک ادھیڑ عمر کے سردار جی کو 'چچا' کہا ہے۔جس کی عمر تقریباً 45 ہے لیکن وہ اپنے آپ کو بائیس سال کی عمر کا ٹھہراتا ہے۔'چچا' راوی کا کچھ نہیں لگتا۔فرق صرف اتنا ہے کہ دونوں ایک ہی گاؤں کے ہیں۔'چچا' ایک شام 'راوی' کو اپنے ساتھ کسی کام کے واسطے لے جاتا ہے۔راستے میں انھیں تیرہ چودہ برس کی ایک کم سن، لاچار، بے بس، غریب، مظلوم عورت دھول میں لپٹی ہوئی ملتی ہے۔اپنے سامنے لحیم شحیم مردوں کو پا کر یہ کم سن لڑکی خوفزدہ ہوتی ہے اس کو اپنی عزت خطرے میں محسوس ہوتی ہے۔'چچا' دیکھتا ہے کہ ایک عورت جو ایک چالاک لومڑی جیسی بڑھیا کے قریب ٹاٹ پر بیٹھی ہے، جس میں سوائے اس کے کہ جوان تھی، اور کوئی خوبی نہ تھی۔بڑھیا اس کا سودا آٹھ آنے کر رہی تھی۔راوی کے مطابق پھر چلتے چلتے کئی گلیوں سے گزرتے ہوئے آخر کار مجید کے گھر پہنچے۔مجید نے خوب آؤ بھگت کی۔'چچا' اور مجید کے درمیان کانا پھوسی ہوئی اور کچھ منٹوں بعد وہی لڑکی بڑھیا کے ساتھ آتی ہے اب پانچ لوگ موجود تھے۔جہاں سب کے سامنے لڑکی کو 'چچا' کو سپرد کیا جاتا ہے۔'چچا' اس لڑکی کو بہلا پھسلا

کر گھر لے جانے میں کامیاب ہوتا ہے اور بعد میں اپنی ہوس کا شکار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ دنوں بعد جب راوی چچا کے گھر سے گزرتا ہے تو لڑکی کے چلانے کی آواز سن کر اسے لگتا ہے کہ چچا لڑکی کے ساتھ زور زبردستی کر رہا ہے۔ جہاں کرب کی حالت میں لڑکی اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد انہی دنوں میں جواہر لال نہرو کی آمد میں جلسہ منعقد کیا جاتا ہے۔ جہاں چچا اور مجید بھارت ماتا کی جے، پنڈت جی کی جے، مہاتما گاندھی کی جے وغیرہ کے نعرے لگاتے ہیں۔

اس افسانے میں چچا جیسے لوگوں کے چہروں سے نقاب اُٹھایا گیا ہے جو ایک طرف محبت قوم کے نعرے بلند کرتے ہیں، تو دوسری طرف عورتوں کی آبرو کے ساتھ کھیلنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اس کھیل میں صرف ایک سکھ چچا مجرم نہیں ہے بلکہ مجرم ہے مجید، مجرم ہے بڑھیا، مجرم ہے راوی جو مظلوم کی مظلومیت پر اپنی بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس کی چیخیں سنتے ہیں اور بڑی بے شرمی کے ساتھ سب کچھ دیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان گھناؤنے کاموں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ دراصل یہ سب لوگ ملک و قوم کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔ جو معاشرت کو پلیدہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جن کی پہنچ ہر چھوٹے بڑے شخص تک ہے۔ یہاں جرائم پیشہ افراد کسی ایک مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس افسانے کی منظر کشی کمال کی ہے اور اس کا بیانیہ بھی بے حد متاثر کن ہے۔

بلونت سنگھ نے افسانہ ''ہندوستان ہمارا'' میں ایک ہندوستانی سکھ فوجی کی داستان پیش کی گئی ہے۔ جگجیت سنگھ جو فوج کی نوکری کرتا تھا اور جس کی شادی کو ابھی صرف چار پانچ مہینے ہی ہوئے تھے۔ ایک دن بیوی کو پہاڑی کی سیر کرانے کی غرض سے چھٹی لے کر گھر آجاتا ہے۔ گھر میں اسے ماں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بیوی 'جوڑ' میلے میں اس کے بہنوں کے ساتھ چلی گئی ہے۔ چونکہ اس کی تازہ تازہ ہی شادی ہوئی تھی اس لیے اُتاؤلے پن میں بیوی کو دیکھنے کا زیادہ ہی اشتیاق پیدا ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے میلے میں پہنچ گیا اور میلے کی ہر بھیڑ والی جگہ چھان ماری لیکن بیوی کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ اس دوران اسے میلے کے کئی پرکشش مناظر دیکھنے کو ملے۔ بالآخر تھک ہار کر وہ من ہی من میں بیوی کو کوستا رہا۔ بہت تلاش و جستجو کے

بعد اسے اپنی بہن کے ساتھ بیوی بھی نظر آئی۔ پھر وہ اس سے اپنی آپ بیتی سنانے لگتا ہے۔ وہ گھر پہنچنے کے بعد اپنی بیوی کو سیر پر لے جانے کی تیاری کرتا ہے۔ لیکن ماں اشارتاً کنایاً سمجھاتی ہے کہ اس کی بیوی ماں چار مہینے کے پیٹ سے ہے اس لیے وہ انھیں سیر پر جانے سے منع کرتی ہے۔ لیکن بیٹے کی ضد کے آگے اس کی ایک نہیں چلتی۔ دونوں میاں بیوی رختِ سفر کی تیاری کرتے ہیں۔ چونکہ جگجیت سنگھ کی ترقی ہوئی تھی اور اب وہ لیفٹیننٹ بن گیا تھا، خوشی میں جگجیت اپنی بیوی کو ایک مہنگے ہوٹل میں کھانا کھلاتا ہے۔ اس دن جنگ کی وجہ سے پلیٹ فارم پر زیادہ بھیڑ ہوتی ہے۔ ان دونوں کے پہنچنے پر سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں صرف ایک انگریز بیٹھا تھا جو انھیں ڈبے میں چڑھنے سے منع کرتا ہے۔ پہلے جگجیت نے کوئی قانون نہیں توڑا۔ اس کے بعد بھی کچھ نہ چلا۔ چونکہ جگجیت سنگھ بڑا انڈر تھا اور بہادر فوجی بھی۔ انگریز کی آنا کانی کرنے پر اُسے پلیٹ فارم پر دھکیل دیا۔ ''جونہی جگجیت سنگھ نے پائیدان پر پاؤں رکھا۔ گاڑی چل دی۔''

اس کہانی میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح غیر ملکی ہونے کے باوجود انگریز نے جگجیت کو ڈبے میں بیٹھنے سے منع کیا۔ مادرِ وطنی کے باوجود انگریز یہاں کے لوگوں کے ساتھ کس قدر استحصال کر رہے تھے۔ اس کہانی میں انگریز سامراج سے نفرت اور عوام میں آزادی کے احساسات کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔ سِکھ مذہب کے رسم و رواج کی اس کہانی میں خوب عکاسی کی گئی ہے۔ سِکھوں میں جوش، جذبہ، محبت، بھائی چارگی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بہادری کے قصے بھی اس کہانی میں سنائے گئے ہیں۔

بلونت سنگھ کی دیگر کہانیوں میں ''پردیسن''، ''ماتا ہری''، ''خدا کی وصیت''، ''بھول بھلیاں''، ''خلا''، ''تین باتیں''، ''تلچھٹ''، ''رقیب''، ''آشیانہ''، ''کلی کی فریاد''، ''حدِ فاصل''، ''بازگشت''، ''اعتراف''، ''ایک ہی ناؤ میں''، ''چالان''، ''بھیک''، ''سکوت''، ''ڈاکو'' اور ''موت'' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

بلونت سنگھ نے اپنی کہانیوں کو کسی ایک موضوع تک محدود نہیں رکھا، بلکہ انھیں تو ہر موضوع کو برتنے میں فنی اختصاص حاصل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے صرف سِکھ جاٹ

کے لوگوں پر مبنی کہانیوں کو ہی اہمیت دی ہو۔ بلکہ انھوں نے ہر طبقے، فرقے اور مذہب کی برابر نمائندگی کی ہے۔ انھوں نے پنجاب کے دیہات کو خصوصاً اپنے افسانے کا بنیادی موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہری ماحول کی عکاسی نہ کی ہو۔ بلونت سنگھ نے ہندو مسلم، سکھ، امیر، غریب، بچے، بوڑھے، مرد، عورت، خواندہ، ناخواندہ، کسان، فوجی، کلرک، ڈاکو، کمزور، طاقتور، ظالم و جابر، سیاست دان، سرمایہ دار، زمیندار، بھوک، جنس، دیہات، درمیانہ اور متوسط طبقہ، آزادی، حق پرستی، چوری، عشق و محبت، نفسیات، رومانیت وغیرہ سب کو اپنے افسانوں میں گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں قصبوں کی فضا اور مٹی کی بوباس تو ہے ہی، لیکن فقط کھیت کھلیان یا سرسوں کا پھول ہی نہیں، طور طریقے، رہن سہن، پوجا پاٹھ، شبد کیرتن، میلے ٹھیلے، تیج تہوار، گانا بجانا، رسمیں، عقیدے، سبھی کچھ ہے جس سے پوری معاشرت اور ثقافت عبارت ہے۔

بلونت سنگھ کے افسانوں میں منظر نگاری، جذبات نگاری، واقعات نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور حقیقت نگاری وغیرہ کی عمدہ فن کاری ملتی ہے۔ ان کے اکثر افسانے طربیہ انجام پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں افسانوں میں معنوی پہلو، فکری عنصر، تخلیقی ہیجان، ادب اور آرٹ کو برتنے کا فن کارانہ حسن، جدت اور ندرت، شگفتگی اور تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے تقسیم سے چند برس پہلے بلونت سنگھ کے پہلے افسانوی مجموعے پر لکھا تھا کہ "بلونت سنگھ اپنے موضوع میں تنوع، تحریر میں شگفتگی اور ہر لحظ ایک ایسا نیا پہلو پیش کرتے ہیں کہ پڑھ کر ہماری جمالیاتی حس کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔" بیدی کی رائے ہر اعتبار سے صحیح ثابت ہوئی۔ بلونت سنگھ کے افسانوں کو آج بھی ہر اعتبار سے شرفِ قبولیت کا درجہ حاصل ہے۔

## کتابیات


1۔ نیا افسانہ، وقار عظیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1973

2۔ بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1995

3۔ آزادی کے بعد اردو افسانہ: ایک انتخاب (جلد اول) مرتبہ گوپی چند نارنگ / ارتضیٰ کریم / اسلم جمشید پوری، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، نومبر 2003

4۔ بلونت سنگھ: فن اور شخصیت، ممتاز آرا، تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی، 2003

5۔ اردو افسانے کی حمایت میں، شمس الرحمٰن فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2006

6۔ کلیات بلونت سنگھ: جلد اول، مرتبہ: جمیل اختر، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، 2009


## رسائل


1) بلونت سنگھ نمبر: ماہنامہ آجکل، جلد، 53، شمارہ 6، جنوری 1995


☆☆☆

# پروفیسر ظہیر احمد صدیقی: حیات وخدمات

اے بدایوں، اے ہزاروں باکمالوں کے وطن
اے دیار اولیا، اللہ والوں کے وطن
اے ادیبوں، شاعروں، نازک خیالوں کے وطن
اے بدایوں آج ہم آشفتہ حالوں کے وطن

(احساس وادراک از ظہیر احمد صدیقی، ص170)

تاریخ گواہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے برصغیر میں ضلع بدایوں کی اپنی ایک مسلمہ حیثیت رہی ہے۔ آریوں کا زمانہ ہو یا ہندوؤں کا، مسلمانوں کا عہد ہو یا انگریزوں کا، ہر زمانے میں اس کی انفرادیت رہی ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے عہد میں اس کو سیاسی اور سماجی اقتدار حاصل رہا اور اسے صوبہ صدر کا مقام بھی قرار دیا گیا۔ بدایوں بہت عرصے تک علم وادب کی دانش گاہ کا مرکز بنا رہا۔ جس میں علم وفضل، درس واصلاح اور ذکر وفکر کے انمول نمونے ملتے ہیں۔ غیر ممالک سے آنے والے ذکر وفکر کے روحانی قافلے بارہا یہاں سے گزرے ہیں اور اپنے دیرپا نقوش چھوڑ گئے۔ قطب الدین ایبک کی حکومت کے قیام سے پہلے جن مقامات میں اسلامی نوآبادیاں قائم ہوگئی تھیں اور جہاں فرزندانِ توحید اپنے طور پر علم و مذہب کی خدمت میں مصروف تھے ان میں بدایوں کا نام سرفہرست ہے۔

سرزمین بدایوں کو عالموں، فاضلوں، دانشوروں، مفکروں، شاعروں، قلم کاروں، صوفیوں، سنتوں، امراؤں، مورخوں وغیرہ کا گہوارہ کہا جائے تو تعجب نہ ہوگا۔ سلطان

قطب الدین ایبک، سلطان شمس الدین التمش، سید علاؤالدین، شیخ حمیدالدین برادر شیخ سعدی جیسی ہستیوں کا تعلق بدایوں سے رہا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی، حسن صغانی لاہوری، حسن سنجری دہلوی، استاد امیر خسرو شہاب الدین مہمرہ، مورخ ملا عبدالقادر وغیرہ کی پیدائش کا شرف بدایوں ہی کو حاصل ہے۔ دوسرے باکمال لوگوں میں ظہور اللہ نوا، محشر، بے خود، محو، بسمل، مذاق، فانی، رضی، شکیل، حیرت وغیرہ جیسے روشن چراغ تھے، جنھوں نے نہ صرف بدایوں بلکہ پورے برصغیر میں اپنی شہرت کا پرچم بلند کیا ہے۔ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بدایوں کو مقامِ خلعتِ فاخرہ حاصل ہے۔

متذکرہ بالا بدایوں اور بدایوں سے متعلق شخصیات کا تذکرہ کرنا اس لیے ضروری تھا کیونکہ راقم الحروف کے مضمون کا موضوع بدایوں کی ہی ایک شخصیت ہے جو تعارف کے محتاج نہیں۔ جی ہاں! ان کا نام پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ہے جو پروفیسر ضیاء احمد ضیا بدایونی کے بیٹے، رفیع احمد عالی کے پوتے، رضی احمد رضی اور آفتاب احمد جوہر کے بھتیجے تھے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی کی اولاد میں ایک لڑکی اور پانچ لڑکوں کا تولد ہوا۔ ان کی ایک ہی صاحبزادی تھی جس کا نام بلقیس خاتون تھا جس کا عقد پروفیسر ظفر احمد صدیقی سابق صدر شعبۂ فلسفہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ہوا تھا۔ لیکن وہ 32 سال کی عمر ہی میں انتقال کر گئیں۔ ضیاء صاحب کے صاحب زادوں میں سب سے بڑے حبیب احمد صدیقی تھے۔ ان کے بعد رفیق احمد میکش اور ظہیر احمد صدیقی کا نام آتا ہے۔ پھر ڈاکٹر نصیر احمد صدیقی اور سب سے چھوٹے معین احمد صدیقی ہیں۔ وہ سب درس و تدریس سے وابستہ رہے اور اچھے عہدوں پر فائز ہوئے۔ شعر و سخن اور علم وادب سے وابستگی آپ کی خاندانی وراثت رہی ہے۔ ضیاء احمد بدایونی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ اردو، عربی اور فارسی کے صدر بھی رہے۔ بدایوں کے جن چند خاندانوں کو خدا نے عزت و وقار سے نوازا نیز جن کو آج بھی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان میں ایک خاندان ضیاء احمد بدایونی کا بھی ہے۔ جہاں ظہیر احمد صدیقی نے آنکھیں کھولیں۔ ان کا خاندان علم و ادب کے باب میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے خاندان کا سلسلہ کئی واسطوں سے محمد بن ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔

شروع میں اس خاندان کے بزرگ سنبھل میں آباد تھے۔تقریباً ڈھائی سو سال قبل مولانا وجیہ الدین سنبھل کی سکونت ترک کر کے بدایوں میں مقیم ہوئے اور یہیں ظہیر صاحب کی پیدائش ہوئی۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی پیدائش 10 رجولائی1929 میں ہوئی۔ان کی تربیت ان کے والد ضیاء احمد بدایونی اوران کے چچا آفتاب احمد جوہر کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔یہ اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔ظاہر سی بات ہے کہ جس ماحول میں ظہیر احمد صدیقی کی پرورش و پرداخت ہوئی ،اس ماحول نے ان کی ذہنی کیفیت کو جز رس وجزوِ لاینفک عطا کیا۔ظہیر احمد صدیقی نے1953 میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ایم۔اے اردو امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔1954 میں شعبۂ اردو،علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں عارضی لیکچرر کی حیثیت سے درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔مگر اردو ادب کی تدریسی خدمت کے لیے قدرت نے انھیں دہلی کے لئے قبول کیا تھا۔چنانچہ 1955 میں سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی میں ان کا بحیثیت لیکچرر تقرر ہوا۔پھر اسی سال دہلی کالج المعروف دہلی یونی ورسٹی میں بحیثیت لیکچرر منتخب ہوئے اور 1955 تا 1961 تک اسی عہدے پر فائز رہے۔درس وتدریس کے دوران ہی انھوں نے 1959 میں مسلم یونی ورسٹی،علی گڑھ سے فارسی میں ایم۔اے کی سند حاصل کی۔ دورانِ تعلیم علی گڑھ انجمن اردوئے معلّٰی کے سکریٹری اور علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔

ظہیر احمد صدیقی نے دہلی یونی ورسٹی ہی سے خواجہ احمد فاروقی کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔جس پر انھیں 1962 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ 1961 میں وہ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت ریڈر بھی تعینات ہوئے۔انھوں نے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے قیام یورپ و امریکہ کے زمانے میں دو بار قائم مقام صدر کی حیثیت سے شعبۂ اردو کی صدارت سنبھالی۔بعد ازاں ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے منصب پر بھی فائز رہے۔1964 میں مسلم یونی ورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب کیے گئے۔1968 میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے نائب صدر منتخب ہوئے۔اس کے علاوہ وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کورٹ کے ممبر، جامعہ اردو (علی گڑھ) کی مجلس عام کے ممبر، ٹیگور اکادمی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے

ممبر، غالب اکادمی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر، غالب اکادمی کی اشاعتی کمیٹی کے ممبر، کل ہند اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جوائنٹ سکریٹری وخزانچی، ممبر اقلیتی کمیشن (دہلی)، پرووائس چانسلر، جامع اردو (علی گڑھ)، مدیر ونگراں دہلی کالج میگزین وغیرہ کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ علی گڑھ میگزین کا طنز وظرافت نمبر انھی کی ادارت میں شائع ہوا۔ 1969 ان کی زندگی کا مہتم بالشان زمانہ ہے۔ اسی سال انھیں حج بیت اللہ کا شرف حاصل ہوا۔ ہندو پاک کے نامور رسائل وجرائد میں ان کے مضامین ومقالے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''دہلی کالج میگزین'' ماہ نامہ ''انشاء'' ماہ نامہ ''آجکل'' سہ ماہی ''عصری ادب'' ماہ نامہ ''تہذیب الاخلاق'' ماہ نامہ ''پیام تعلیم'' سہ ماہی ''تحریر'' ماہ نامہ ''فاران'' ماہ نامہ ''کتاب نما'' سہ ماہی ''اردوادب'' ششماہی ''غالب نامہ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ کتابوں میں بھی ان کے مضامین زینت بنے ہوئے ہیں۔ کتابوں پر کیے گئے تبصروں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے جن کو اگر اکٹھا کیا جائے تو ان کی ایک ضخیم کتاب وجود میں آسکتی ہے۔ تنقیدی اور تحقیقی کاوشوں کے اعتراف میں دہلی اور یوپی اردو اکادمیوں نے انھیں اعزازات سے نوازا ہے۔ ظہیر احمد صدیقی 1995 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور 17 رفروری 2003 کو وہ اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی تجہیز وتکفین علی گڑھ ہی میں عمل میں آئی۔ دہلی یونی ورسٹی میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر فضل الحق، پرفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر شمیم نکہت، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، ڈاکٹر امیر عارفی وغیرہ حضرات ان کے معاصرین تھے۔

ظہیر احمد صدیقی کی ذاتی زندگی کا تذکرہ کیا جائے تو وہ بچپن ہی سے محنتی اور متحرک تھے۔ ان کا یہی مزاج ہمیشہ رہا۔ وہ متعدد علمی انجمنوں ادبی رسالوں اور سیمیناروں کے ساتھ وابستہ رہے۔ سفر کرنے والے اساتذہ میں ظہیر صاحب سرفہرست ہوں گے۔ ان کے علمی وادبی اسفار کی تعداد بلاشبہ سینکڑوں سے متجاوز ہیں۔ ان کا شمار بلا شبہ ان اساتذہ میں ہوتا ہے جو تصنیف وتالیف اور درس وتدریس دونوں سے مزین تھے۔ چونکہ ان کا تعلق علمی اور مذہبی

گھرانے سے تھا۔اس لیے تہذیب وشرافت، اخلاق و اقدار، سادگی واخلاص وغیرہ جیسے اوصاف بھی ان کی شخصیت کا آئینہ بن گئے تھے۔وہ طلبا کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔بقول پروفیسر عبدالحق ''وہ تین حیثیتوں سے متعارف ہیں۔ڈاکٹر صدیقی، ظہیر صاحب اور ظہیر بھائی۔ظہیر بھائی کا حلقہ ''حلقہ درویشاں'' ہیں۔''

ظہیر احمد صدیقی کی ذہنی تربیت کا بیشتر وقت چونکہ علی گڑھ میں گزرا ہے۔ اس لیے علی گڑھ ان کی سیرت کا دوسرا جز ہے۔ظہیر احمد صدیقی اس اعتبار سے خوش نصیب واقع ہوئے ہیں کہ انھیں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی شاگردی اور قربت حاصل ہوئی۔ یہ شرف انھیں علی گڑھ میں دورانِ تعلیم حاصل ہوا۔رشید احمد صدیقی سے ظہیر احمد صدیقی کے تعلقات کا سلسلہ یہی تک محدود نہیں بلکہ جب موصوف دلّی کالج میں استاد کی حیثیت سے فرائضِ منصبی انجام دے رہے تھے۔اس وقت ان دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا اور کبھی کبھی ملنے کا اتفاق بھی ہوتا تھا۔ظہیر احمد صدیقی کے والد محترم پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے رشید احمد صدیقی سے دوستانہ مراسم تھے۔ظہیر احمد صدیقی کے ساتھ رشید احمد صدیقی کی قربت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ظہیر احمد صدیقی نے علی گڑھ سے اپنی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

ے مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پروفیسر ایمرٹس وسابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی عبدالحق، ظہیر احمد صدیقی کی علی گڑھ سے عقیدت مندی کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

> ''جب ان کی موجودگی میں علی گڑھ پر تنقید ہوئی انہوں نے پوری جذباتی وابستگی کے ساتھ علی گڑھ کے اقدار مدافعت ہی نہیں کی بلکہ اسے بین الاقوامی وسیع پس منظر میں ایک بلند معیار بنا کر پیش کیا ہے وہ معیار جو اعلیٰ بھی اور محبوب بھی، جس کی نظیر علی گڑھ کے عقیدت مندوں کے دلوں کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔''

(ذکرِ یارمہرباں از پروفیسر عبدالحق، ص97)

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی تخلیقی مزاج ذہن رکھتے تھے۔ان کی شخصیت میں فن کارانہ تخلیقی جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس کا خود بھی اعتراف کرتے تھے اور نہ دوسروں پر اس کو ظاہر ہونے دیتے۔ یہ ان کی انکسار مزاجی کا نتیجہ تھا۔ظہیر احمد صدیقی شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ان کے فن میں سوز و جگر، درد و داغ و زار کی تڑپ ہے۔وہ شاعری میں نظمیں کہنے کے قائل تھے لیکن ان کی غزل گوئی میں بھی امتزاج کا رنگ نمایاں ہے اور ایسی غزل کہہ جاتے ہیں کہ آمیزش سے غزل کے آبگینہ کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔

شاعری ان کا باضابطہ مشغلہ نہیں تھا بلکہ تفریحاً شعر کہتے تھے۔شعر زبانی یاد نہیں رہتے تھے بلکہ ان کے جیب میں ہمیشہ بیاض پائی جاتی جس میں ان کے اشعار درج ہوتے تھے۔بیاض رکھنے کی دو وجہیں تھی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شعر زبانی یاد نہیں رہتے تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مقتضائے وقت پر کام آسکے۔اس لیے ''احتیاط بڑی چیز ہے'' اسی بیاض کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مانجھی ہمت ہار نہ دینا، کر تو ذرا پتوار بلند
عزم کے آگے طوفاں کیا شئے، کشتی کب دھار بلند

میرے گھر میں دھوپ خوشی کی آئے بھلا تو کیسے آئے
میرے گھر کا آنگن چھوٹا، در نیچے دیوار بلند

❦

آثار پھر سحر کے نمایاں ہوئے تو ہیں
ذرے حریفِ مہر درخشاں ہوئے تو ہیں

اُن پر بھی کچھ اثر میری وحشت کا ہو گیا
میرے لئے وہ چاک گریباں ہوئے تو ہیں

چلے ہیں زیست کی راہوں میں روشنی کرنے
جو اب گھر کے اندھیرے نہ کر سکے روشن

ہماری دشت نوردی کی داد دے کوئی
بھری بہار میں چھوڑ آئے گھر کا گھر تنہا

ظہیر احمد صدیقی کی کم وبیش غزلیں ان کی بیاض میں درج ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف رسائل وجرائد میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ان کی غزلیں تخلیقی کارفرمائی کا جیتا جاگتا ثبوت کرتی ہیں جن کا مطالعہ قاری کو اپنی طرف کھینچتا ہے، جو دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کے ساتھ ساتھ ایک نئی صبح کا پیغام لے کر آتی ہیں۔نظموں میں "نذرِعلی گڑھ"، "ڈاکٹر ضیاءالدین کی تربیت پر"، "نذرِجوہر"، "ساقی نامہ" وغیرہ ان کی تخلیقی ذہن کی نمائندگی کرتی ہیں۔ظہیر احمد صدیقی کی شاعری میں جدید حسیت ہے،ایسی حسیّت شاعری داخلی اور ذاتی بناتی ہے۔ظہیر احمد صدیقی کے مزاج میں فطری سادگی تھی،اس سادگی میں بھولا پن اور معصومیت کا پہلو ٹپکتا تھا۔ان کی شخصیت میں کوئی چھل کپٹ نہیں تھی۔ان کی سادگی خلوص پر مبنی تھی،ان کی سیرت میں وہ باغ وبہار شخصیت موجود تھی۔شاید اسی لیے وہ زندگی اور کائنات کے منفی اقدار اور طرز فکر کے منفی پہلوؤں کو خاطر میں نہیں لاتے،یہی وجہ ہے کہ وہ فانی کو قنوطی شاعر نہیں مانتے۔

ظہیر احمد صدیقی کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔تصنیفی وتخلیقی کام ان کے رگ وریشہ میں رچا بسا تھا۔چونکہ تصنیفی وتالیفی کام میں مصروف رہنا ان کا خاندانی مشغلہ تھا۔اس لیے ادبی کاموں کے تئیں دلچسپی پیدا ہونا فطری بات تھی۔ساتھ ہی ان کی طبیعت کا سوز وگداز ایسا تھا جو انھیں ادبیات کے منصفانہ پہلوؤں کی طرف لے گیا۔"خواجہ میر دردؔ" اور "دیوان خواجہ میر دردؔ مع مقدمہ وشرح" لکھ کر دردؔ شناسی کا ثبوت پیش کیا۔خواجہ میر درد کا فکر وفن اردو ادب میں ایک محور کی حیثیت رکھتا ہے۔میر دردؔ کے فکر وفن کی ترجمانی میں ظہیر احمد صدیقی کا نام سرِفہرست ہے۔انھوں نے دیوان درد جامع اور مبسوط مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔اس کے بعد "مومن خان مومنؔ"، "انتخاب دیوان مومنؔ مع مقدمہ و شرح"، "قصائد مومن مع مقدمہ وشرح"، "انشائے مومنؔ"، "مومنؔ شخصیت اور فن" وغیرہ جیسی تصانیف لکھ کر مومن شناسی کا ثبوت بھی پیش کیا۔کلاسیکی ادب بالخصوص غزل ظہیر احمد

صدیقی کا پسندیدہ موضوع تھا اور اس میں بھی اختصاص مومن اور اس کے کلام کے ساتھ تھا۔ اسی موضوع پر انھوں نے پی۔ایچ۔ڈی بھی کی تھی۔ مومن شخصیت اور فن ان کی تحقیقی کاوش کا وقیع ثمرہ ہے۔ مومن شناسی پر اتنا وقیع اور معیاری کام شاید ہی کسی دوسرے شخص نے کیا ہو۔ انھوں نے مومن کے بیشتر مخفی گوشوں کو منظر عام پر لاکر مومن کی عظمت کو اجاگر کیا۔ جب تک اردو کے یہ دومایہ ناز شاعر اور بزرگ موجود ہیں۔ تب تک ظہیر احمد صدیقی کا نام زندہ رہے گا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ظہیر احمد صدیقی کی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

> ''ظہیر احمد صدیقی یقیناً ہماری تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مومن کے قصائد کی مستند شرح لکھی۔ مستند اس لئے کہتا ہوں کہ ان کے پیش نظر وہ شرحیں بھی رہی ہیں جو ان کے والد محترم مولانا ضیاء احمد بدایونی صاحب نے وقتاً فوقتاً تصنیف فرمائی ہیں۔ فارسی اور اردو ادب پر بالعموم اور مومن کے جملہ اصناف کلام پر بالخصوص مولانائے ممدوح کی جو نظر ہے اور اس پر جتنا کام موصوف نے کیا ہے وہ میری ہی نہیں میرے جیسے بہت سے دوسروں کی بھی تعریف و تعارف سے مستغنی ہے۔''
>
> (پیش لفظ، قصائد مومن و شرح از ظہیر احمد صدیقی، ص6)

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مومن کو عام و خاص سے متعارف کرانے میں ضیاء احمد بدایونی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ انھیں ''قصائد شرح مومن'' (1928) اور ''دیوان مومن'' (1934) لکھ کر یہ شرف حاصل ہوا۔ انھوں نے ہی مومن کو ''شاعرِ مکر'' قرار دیا ہے۔ اس سلسلے کو ان کے فرمانبردار سپوت ظہیر احمد صدیقی نے صحیح سمت عطا کی۔ لیکن انھوں نے مومن سے متعلق اپنے والد کے خیالات کو جوں کا توں نہیں اپنایا، بلکہ بعض باتوں سے اختلاف بھی کیا۔ لیکن ان کے بعد نیاز فتح پوری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، کلب علی خاں فائق اور ظہیر صاحب بھی اس میدان میں نبرد آزما ہوئے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ''مومن اور مطالعہ مومن''، کلب علی خاں فائق کی ''مومن''، نیاز فتح پوری کا ''نگار'' میں ''مومن نمبر'' کے علاوہ ظہیر احمد صدیقی کی ''مومن خاں مومن: شخصیت اور فن'' کے علاوہ متعدد تصانیف

مومن شناسی کا بہترین ثبوت ہے۔ نیاز فتح پوری نے مومن کو غالب پر فوقیت دی، تو عبادت بریلوی نے مومن کی تمام مثنویوں کو ان کی آپ بیتی قرار دینے سے انکار کر دیا۔ کسی نے قومیت کے سلسلے میں غلط انکشاف کیا، تو کسی نے مومن کی محبوبہ کے نام کے سلسلے میں۔ غرض ظہیر احمد صدیقی نے ان انکشافات کی مستند اور معتبر حوالوں کے ذریعے تردید کی۔ مومن پر انھوں نے آدھی درجن سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں اور درجنوں مضامین تخلیق کر کے مومن کے تئیں اپنی حق شناسی ادا کر دی۔ مومن اور درد کے علاوہ انھوں نے اردو زبان وادب کے اہم شاعر فانی بدایونی پر بھی اہم تحقیقی کام کیا ہے۔ فانی پر لکھی گئی ان کی کتابوں میں ''کلیات فانی''، ''فانی کی شاعری'' اور ''بچوں کے فانی'' قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ''فانی کی شاعری'' میں فانی کی شاعری کا پس منظر، فانی کے غم کی نوعیت اور اس کے داخلی وخارجی اسباب، فانی اور درد کے متصوفانہ رجحان کا تقابلی جائزہ، میر، غالب اور فانی کے غم میں ہم آہنگی، اور فانی کے ناقدین کا محاکمہ کیا ہے۔ ظہیر احمد صدیقی نے فانی سے متعلق اس بات کی تردید کی ہے کہ وہ قنوطی ہیں۔ کلام فانی کی متعدد مثالوں سے انھوں نے فانی کے عزم و یقین کا واضح تصور کو اجاگر کیا ہے۔ ظہیر احمد صدیقی نے اردو زبان وادب کے تقریباً ہر ایک بلند پایہ ادیب وشاعر پر لکھا ہے اور بے تکلف لکھا ہے۔ وہ چاہے مومن ہو یا درد، غالب ہو یا اقبال، حالی ہو یا میر انیس، آتش ہو یا فانی غرض ہر ایک پر بے دھڑک لکھا ہے۔ کلاسیکی وجدید ادب اور شعر دونوں پر طبع آزمائی کی ہے۔

ظہیر احمد صدیقی کے اب تک مضامین کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جس میں مضامین کا پہلا مجموعہ ''فکری زاویے'' دوسرا مجموعہ ''احساس وادراک'' اور تیسرا مجموعہ ''میزان قدر'' پر مشتمل ہے۔ مضامین کے دوسرے مجموعے ''احساس وادراک'' میں رشید احمد صدیقی کے خاکے میں ان کی شخصیت کا خاکہ یوں لکھا ہے:

> ''اگر آپ رشید صاحب سے نہیں ملے تو آیئے میں آپ کی ملاقات ان سے کراؤں۔ دبلا پتلا جسم، لمبا چہرہ، آنکھوں پر عینک، علی گڑھ کٹ پاجامہ، شیروانی اور اسی کے ساتھ کی ٹوپی اور کبھی رامپوری وضع کی مخملی ٹوپی۔ میں نے

اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان کو ڈپارٹمنٹ سائیکل پر آتے دیکھا ہے۔
وہ سائیکل پر ایک رفتار سے شعبہ کی طرف خراماں نظر آتے تھے۔ رشید صاحب
نے نہ کبھی سائیکل کی رفتار معمول سے کم کی اور نہ کبھی تیز محسوس ہوتا تھا کہ
گویا زندگی ایک متوازن انداز سے رواں دواں ہے جس کو نہ غم جاناں کی
فکر ہے اور نہ غم دوراں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان دونوں کو اپنی گرفت
میں لیا ہے۔"

(احساس وادراک از ظہیر احمد صدیقی، ص159)

ظہیر احمد صدیقی نے خاکہ نگاری میں بھی اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ انھوں نے کئی خاکے لکھے ہیں۔ ان کی کتاب "احساس وادراک" میں 13 مضامین اور 4 خاکے ہیں، جو سبھی اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ ظہیر صاحب کا تیسرا مجموعہ "میزان قدر" کل 14 مضامین پر مشتمل ہے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین کے تینوں مجموعوں میں مشاہیرِ ادب پر بھی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ سحر البیان اور گلزار نسیم جیسی اردو ادب کی اعلیٰ پایہ مثنویوں کو بہت پہلے مرتب کر کے ان پر اپنا تنقیدی مقدمہ ثبت کیا۔ انھیں فارسی زبان پر بھی پورا عبور حاصل تھا جس کے سبب ان کے فارسی سے اردو میں کیے گئے ترجمے بے حد مقبول ہوئے۔ پروفیسر موصوف کی بیشتر تصانیف کو ملک کے نامور و معروف ناشرین نے شائع کیا ہے اور انھیں مخصوص موضوعات پر کتابیں لکھنے کی دعوت بھی دی جاتی تھی۔ ایک استاد کے لیے اس سے بڑی اعزاز کی بات اور کیا ہو سکتی ہے جو ان کے تخلیقی و تصنیفی اور تحقیقی و تدوینی کاموں کے اعتراف میں انھیں پیش کیا جاتا۔ الغرض ادب کی بیشتر اصناف نظم، غزل، خاکہ نگاری، مضمون نگاری وغیرہ میں ظہیر احمد صدیقی نے طبع آزمائی کر کے اپنی تخلیقی جوہر کے نقوش چھوڑے ہیں۔ جس کا اعتراف تقریباً اردو ادب کے ہر بڑے ادیب نے کیا ہے۔

## مطبوعات ظہیر احمد صدیقی

1۔ تحقیقی مطالعہ حالی (سوانحی مطالعہ) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1960
2۔ تحقیقی مطالعہ انیس (سوانحی مطالعہ) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1961

| | | | |
|---|---|---|---|
| 3۔ | فانی کی شاعری (تنقیدی مطالعہ) | نسیم بک ڈپو، لکھنؤ | 1962 |
| 4۔ | فکری زاویے (مضامین کا مجموعہ) | ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ | 1972 |
| 5۔ | مومن: شخصیت اور فن (تحقیق) | دہلی یونی ورسٹی، نئی دہلی | 1972 |
| 6۔ | اردو ادب میں جمالیاتی اقدار (تنقید) | مکتبہ الفاظ، علی گڑھ | 1979 |
| 7۔ | احساس و دراک (مضامین کا مجموعہ) | مکتبہ الفاظ، علی گڑھ | 1981 |
| 8۔ | خواجہ میر درد (سوانحی مطالعہ) | این۔سی۔پی۔یو۔ایل، نئی دہلی | 1983 |
| 9۔ | بچوں کے فانی (سوانحی مطالعہ) | این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، نئی دہلی | 1984 |
| 10۔ | مومن خان مومن (مونوگراف) | ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی | 1985 |
| 11۔ | میزان قدر (مضامین کا مجموعہ) | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | 1993 |
| 12۔ | جدید شاعری (تنقیدی مطالعہ) | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی | 1993 |
| 13۔ | دبستان مومن (سوانحی و تنقیدی مطالعہ) | انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی | 1996 |
| 14۔ | بچوں کے درد (سوانحی مطالعہ)۔۔۔۔۔۔۔ | | |

## ترتیب

| | | | |
|---|---|---|---|
| 15۔ | طنز و ظرافت نمبر (علی گڑھ میگزین کا خصوصی شمارہ نمبر) | ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ | 1953 |
| 16۔ | مثنوی سحر البیان (ترتیب اور تنقیدی مقدمہ) | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | 1954 |
| 17۔ | مثنوی گلزار نسیم (ترتیب اور تنقیدی مقدمہ) | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | 1955 |
| 18۔ | انتخاب دیوان مومن (ترتیب و حاشی مع مقدمہ و شرح)، | انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی | 1959 |
| 19۔ | قصائد مومن (ترتیب و حواشی مع مقدمہ و شرح) | ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ | 1960 |
| 20۔ | دلی کا دبستان شاعری نمبر، | دہلی یونی ورسٹی، نئی دہلی | 1961 |
| 21۔ | ارمغان فاروقی (نذرِ خواجہ احمد فاروقی) | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی | 1963 |
| 22۔ | جذبات رضی (ترتیب مع تنقیدی مقدمہ) | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | ستمبر 1965 |
| 23۔ | فانی کی شاعری (تنقیدی مطالعہ)، 1969 | (دوسرا ایڈیشن) | 1981 |

24۔ دیوان خواجہ میر درد (ترتیب اور تنقیدی مقدمہ) مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، نئی دہلی 1971
25۔ کلیات فانی (ترتیب مع مقدمہ) این۔سی۔پی۔یو۔ایل، نئی دہلی 1993
26۔ نقیب بہار (دیوان حبیب احمد صدیقی معہ مقدمہ)..................... 1990
27۔ مغیث الدین فریدی (کتاب نما کا خصوصی شمارہ)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1999
28۔ مجموعہ نظم حالی (ترتیب مع مقدمہ) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1998
29۔ کلیات ضیاء (پروفیسر ضیاء احمد بدایونی) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1998
30۔ نقیب بہار مع مقدمہ (ترتیب مع مقدمہ)..................................
31۔ اردو نصاب (اول)، قمر رئیس ر ظہیر احمد صدیقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔
32۔ اردو نصاب (دوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی......
33۔ منتخباتِ جامعہ اردو (حصہ سوم).......................................... 1996

## ترجمہ

34۔ نقشِ ہائے رنگ رنگ (انتخاب کلام غالب فارسی غزلیات و مثنویات مع ترجمہ اردو)
دہلی یونی ورسٹی، نئی دہلی فروری 1969
35۔ اردوئے معلیٰ غالب نمبر (ترتیب مع مضمون)
دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی فروری 1969
36۔ انشائیہ مومن (ترتیب مکاتیب مومن فارسی مع شرح و ترجمہ اردو)
غالب اکادمی، نئی دہلی مارچ 1977

## اعزازات و انعامات

☆ 1984 میں ظہیر احمد صدیقی کو دہلی اردو اکادمی کی جانب سے تحقیق و تنقید ایوارڈ ملا۔
☆ اتر پردیش اردو اکادمی نے ظہیر احمد صدیقی کو دسویں، گیارہویں اور بارہویں جماعت کی کتابوں پر انعام و اکرام سے نوازا۔

☆ اس کے علاوہ ظہیر احمد صدیقی کو نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی)، میر اکادمی ایوارڈ (لکھنؤ)، بزمِ انجم ایوارڈ (بدایوں)، میکش اکبر آبادی ایوارڈ (آگرہ) جیسے اعزازات سے نوازا گیا۔

## بیرونی ممالک کا سفر

☆ پاکستان اور سعودی عرب۔
☆ روس کا سفر کرنا تھا لیکن ذاتی مصروفیت کی وجہ سے نہ کر سکے۔

## انٹرویو

☆ ماس کمیونکیشن ریسرچ سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اردو زبان وادب کے معروف محقق، بانی اور پہلے صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا 30 منٹ تک انٹرویو لیا ہے جو یوٹیوب پر دستیاب ہے۔
☆ انھوں نے اردو زبان وادب کے مشہور محقق مالک رام کا انٹرویو بھی لیا ہے۔ جو 20 منٹ کا ہے۔ ان انٹرویوز میں موصوف بحیثیت انٹرویور فرائض انجام دے رہیں ہیں۔

## مدیر

☆ دلّی کالج میگزین اور علی گڑھ کالج میگزین کے مدیر رہے۔

☆☆☆

## حوالہ جات


1۔ احساس وادراک، ظہیر احمد صدیقی، علی گڑھ، مکتبہ الفاظ، 1981، ص157

2۔ ایضاً: ص159

3۔ ایضاً: ص170

4۔ ایضاً: ص171

5۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی حیات اور کارنامے، ڈاکٹر معین فاطمہ، ناشر رمصنفہ 2011، ص34

6۔ ذکرِ یار مہرباں، پروفیسر عبدالحق، دہلی یونی ورسٹی، نئی دہلی ۔2011، ص101

7۔ قصائد مومن مع شرح، ظہیر احمد صدیقی، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، 1960، ص6

8۔ ایضاً، ص114

9۔ میزان قدر، ظہیر احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1993، ص202

10۔ ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعرا، گوپی چند نارنگ رعبداللطیف اعظمی، اردو اکادمی، نئی دہلی 1996، ص312

11۔ ذہن آباد، ڈاکٹر محمد نفیس حسن، ناشر رمصنف، دسمبر 2013، ص52

12۔ ایضاً: ص156


## رسائل و جرائد


1۔ رسالہ سہ ماہی عصری ادب، اشاعت، دہلی، جلد نمبر، شمارہ نمبر 1، سال 1970، ص146

2۔ رسالہ دہلی کالج میگزین، دہلی، 1959۔1960، ص4

# مقالاتِ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار:
# ایک تجزیاتی مطالعہ

انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی کا ایک ممتاز و معروف تعلیمی ادارہ ہے۔ جس کے وجود کا بنیادی مقصد مسلمانانِ ممبئی میں تعلیمی و سیاسی بیداری کے علاوہ ملکی پیمانے پر ہو رہی مختلف النوع قسم کی سرگرمیوں سے متعلق متحرک و فعالیت پیدا کرنا ہے۔ گذشتہ چند برسوں سے اس ادارے کے کام کاج میں بڑی تیزی آنے لگی ہے۔ یہ ادارہ اب صرف مسلمانانِ ممبئی تک محدود نہیں رہا بلکہ قومی سطح پر مسلمانوں کی آبیاری کا اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ راقم کی طلبا اور زبان و ادب کے خدمت گزاروں سے یہی گزارش ہے کہ اس ادارے سے جڑ کر اس کے رکن بن جائیں تا کہ اس سے انجام پانے والی علمی و ادبی، تعلیمی و فلاحی، سیاسی و سماجی اور تحقیقی کاموں میں مزید سرعت لائی جا سکے۔ یہ تحقیقی ادارہ اب مسلمانوں کی لسانی، ادبی اور تہذیبی شناخت کی ایک اہم علامت بن کر اُبھر رہا ہے۔ اس سے ادبی، قومی و فلاحی خدمت کرنے والی مایہ ناز ہستیاں جیسے جسٹس بدرالدین طیب جی، ناخدا محمد علی روگھے، منشی غلام محمد اور محی الدین ولوی، ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، عبدالرزاق قریشی وغیرہ منسلک رہی ہیں۔ اس ادارے کی اپنی ایک لائبریری ہے جس میں علمی و ادبی موضوعات پر نایاب و نادر کتب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ وقتاً فوقتاً علم و ادب کی سرپرستی کرنے والی کئی اہم شخصیات کی تحقیقی کتابیں بھی شائع کرتا رہا ہے۔ ''مقالاتِ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار'' بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ مزید سہ ماہی ''نوائے ادب''

کے نام سے ایک ادبی تحقیقی مجلّہ بھی اسی ادارے کی دین ہے جو گذشتہ ساٹھ برسوں سے متواتر شائع ہورہا ہے جس کی زبان وادب کے تئیں خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

سطور بالا میں جس ادارے کا تعارف پیش کیا گیا ہے اس کے بانی وسرپرستِ اعلی اردو، عربی اور فارسی کے جید عالم اور استاد پروفیسر محمد ابراہیم ڈار تھے۔ جنھوں نے یوں تو بے شمار علمی وادبی تحقیقی مقالات سپردِ قلم کیے ہیں، لیکن افسوس کہ زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی میں کوئی کتاب شائع نہ کرسکے۔ ڈار صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے باوصف ان کے بے شمار مخلص معاصرین، ہمنوا، شاگرد اور دوست واحباب پیدا ہوئے ہیں جو انھیں عزیز مانتے تھے۔ انہی عزیزوں میں ایک ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی بھی شامل ہیں جو ان کے معاصر بھی رہے ہیں۔ جنھوں نے بعد میں ڈار صاحب کے بکھرے مقالات کو ''مقالاتِ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار'' کے نام سے شائع کیا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کے مطابق مضامین ڈار کی ایک اشاعت اردو ساہتیہ اکادمی گجرات نے کی تھی جو طباعت کے اعتبار سے بہت ناقص تھی۔ اس طرح ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی کا پہلا ایڈیشن جو کہ ختم ہو چکا تھا یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ نایاب ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد دوسرا ایڈیشن بھی ناقص اور غیر معیاری طباعت کی نظر ہوا تھا۔ غور کرنے والی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ایڈیشن کتابت میں تھے اور کچھ مقالات کے اضافے کی تشنگی کا احساس بھی ہورہا تھا۔ اس لیے اس کے نئے اور جدید ایڈیشن میں شائع ہونے کی اشد ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ ہمارے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ مضامین ڈار کے ان عالمانہ، تحقیقی مقالات کو زبان وادب کے خدمت گزار بزرگ، معتبر محقق، ماہر لسانیات، قابل صد احترام اور بے باک استاد، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کارگزار اعزازی ڈائریکٹر، ان سب سے بڑھ کر ایک مخلص اور شریف النفس انسان پروفیسر عبدالستار دلوی نے جدید طرز پر ترتیب دیا ہے۔ اس مجموعے میں کچھ مضامین کا اضافہ بھی کیا گیا ہے جو اسے بہت وقعت اور اعتبار بخشتے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ مقالاتِ ڈار کے مرتبِ اوّل ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی ڈار صاحب کے شاگرد رہے ہیں جب کہ مرتبِ ثانی عبدالستار دلوی کو مدنی صاحب کا شاگرد ہونے کا فخر

حاصل ہے۔اس کے علاوہ ان تینوں اعلیٰ پائے کی شخصیات کا تعلق انجمن اسلامیہ سے رہا ہے۔ عبدالستار دلوی آج بھی اس کے سرپرست ہیں۔ یہ سب چیزیں اس کتاب کے طبع سوم کی اشاعت کا جواز پیدا کرتی ہیں۔

''مقالاتِ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار'' کی ابتدا انجمنِ اسلام، ممبئی کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی کی ''اپنی بات'' سے ہوتی ہے۔جس میں ادارے کا تعارف،اس سے وابستگان حضرات اور کتاب کی اشاعت کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد مرتب ثانی پروفیسر عبدالستار دلوی نے پُر مغز تحریر بعنوان''ابتدائیہ''قلم بند کی ہے۔انھوں نے اس میں موصوف کی اسماعیل یوسف کالج،بمبئی میں تقرری،کشمیری النسل ہونے کا ذکر،تعلیمی قابلیت،مختلف زبانوں پران کا عبور،معاصرین سے ان کے تعلقات،ان کی مشفقانہ شخصیت کا تذکرہ،ان کے چند مضامین سے متعلق اہم انکشافات،فلسفہ کے پروفیسر سوامی داسن کے ڈار صاحب سے متعلق انگریزی میں تاثرات، ان کے شاگردوں کا ذکر،کتاب کی اشاعت کی غرض و غایت اوراضافی مضامین وغیرہ پر بے حد خوبصورت انداز میں گفتگو کی ہے۔مقالات ڈار کا ''پیش لفظ'' جوڈاکٹر سید عبداللہ نے پہلے ایڈیشن کے لیے لکھا تھااس کی اہمیت زیرِنظر طباعت میں بھی برقرار ہے۔سید عبداللہ اورڈار صاحب کے درمیان گہرے مراسم پنجاب یونی ورسٹی میں قائم ہوگئے تھے،جب ڈار صاحب نے عربی ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے پنجاب یونی ورسٹی میں 1927 داخلہ لیا تھا۔سید عبداللہ نے ڈار صاحب سے اپنے گہرے مراسم کے علاوہ ان کی شخصیت کے اوصاف،علمی خدمات اور تحقیقی مضامین پر بہترین تجزیہ کرکے ان کی علمی اور ذاتی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔مضامینِ ڈار کے مرتبِ اوّل ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی کا مقدمہ بعنوان ''مرحوم ڈار'' کے نام سے مرقوم ہوا ہے۔موصوف مرتب اوّل بھی ڈار صاحب کے ساتھ اسماعیل یوسف کالج کے شعبۂ اردو میں پڑھاتے تھے۔انھوں ڈار صاحب کو بہت قریب سے دیکھا تھا،اس لیے وہ ان کی ذات اور زندگی کے چنندہ پہلوؤں کو بیان کرنے میں کامیاب نظر آرہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر سچائی، دردمندی اور پاکیزہ خیالات کا منبع معلوم ہوتی ہے۔ظہیر الدین مدنی نے ان کے خاندان، رشتہ داروں، دوستوں،

ان کی تعلیم و تربیت، حافظ محمود شیرانی سے ان کے مراسم، ان کی منکسر المزاجی، ان کے محبوب مشاغل، گجرات میں قیام کی وجوہات، ملازمت، قیامِ ممبئی، تحریر و تقریر پر قدرت، تحقیقی و تنقیدی صلاحیت سب پر فن کارانہ انداز سے مدلل روشنی ڈالی ہے۔ مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی، ڈار صاحب کے خصوصی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ جب ڈار صاحب کا انتقال ہوا تب خاں موصوف کا ایک بھرپور مضمون بعنوان ''پروفیسر محمد ابراہیم ڈار: دنیا سے ایک انسان اٹھ گیا'' سہ ماہی ''نوائے ادب'' ممبئی میں چھپا تھا۔ جس میں انھیں بہترین انداز میں خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ یہ مضمون انتالیس صفحات پر مشتمل ہے جو ڈار صاحب کی زندگی کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ اس مضمون سے ڈار صاحب کے تصورات، نظریات اور فکر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کے سیاسی حالات، ڈار صاحب کے سیاسی نظریات، مذہبی نقطہ نظر، علماء و ادبا سے ان کی وابستگی، ان کی عالمانہ، فاضلانہ اور محققانہ صلاحیت، ذہانت و ذکاوت کا اعتراف کیا گیا ہے۔

مقالات ڈار میں کل 12 مضامین شامل ہیں۔ ابتدائی مضمون ''جہاں آرا بیگم کی ایک غیر معروف تصنیف صاحبیہ'' پر مشتمل ہے۔ جہاں آرا بیگم ایک مغل شہزادی اور دارا شکوہ کی بہن تھی جسے تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ ''مونس الارواح'' کے بعد ''صاحبیہ'' ان کی دوسری تصنیف ہے جو گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی ہے۔ یہ ایک رسالہ ہے جس کے انیس اوراق ہیں۔ موصوفہ کا فطری ذوق و شوق انھیں اپنے بزرگانِ دین کی سوانح و کوائف تصنیف کرنے کے محرک بنے۔ مذکورہ رسالے میں بھی موصوفہ نے ملّا شاہ بدخشی کے اوصاف و محاسن نمایاں کیے ہیں۔ مزید شاہ صاحب کے بچپن کے حالات، قیل و قال، خوارق و کرامات، مریدوں، جہاں آرا بیگم کے ذاتی حالات و واقعات پر خوب بات کی گئی ہے۔ اس رسالے کی تحقیق، تاریخ، شواہد و دلائل اور اس پر محققانہ نظر ڈار صاحب کی تحقیق جس کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ ''دیوانِ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری'' مقالاتِ ڈار کا ایک اور اہم تحقیقی مضمون ہے۔ چونکہ دیوانِ خواجہ معین الدین چشتی کو حافظ محمود شیرانی نے پہلے ہی اپنی تحقیق سے باور کرایا تھا کہ یہ تصنیف ملا معین واعظ فراہی کی ہے اور خواجہ معین الدین چشتی سے اسے

منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ ڈارؔ صاحب نے مزید تحقیق کر کے اس کا ٹھوس ثبوت پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ غزلیں جو خواجہ معین الدین چشتی کے دیوان میں پائی جاتی ہیں ان کا پہلے سے ہی ملا معین واعظ فراہی کی تصنیف ''معارج النبوۃ'' میں موجود ہونا شک وشبہ پر سچائی کی مہر ثبت کرتا ہے۔ غور طلب ہے کہ ان غزلوں کی نشاندہی شیرانی صاحب خود بھی نہیں کر سکے تھے۔ یہاں تک کہ ان غزلوں کی تشریح وتفسیر بھی ڈارؔ صاحب نے کی ہے۔

''شیخ فرید الدین عطار کے حالات اور تصانیف کے متعلق ہندوایران کے علماء کی تحقیقات'' ڈارؔ صاحب کا حیرت میں ڈال دینے والا تحقیقی مضمون ہے۔ اس میں موصوف نے بیسویں صدی کے ایرانی محقق علامہ محمد قزوینی کی ان تصانیف، جن کو شیخ فرید الدین عطار کے ساتھ بلا وجہ منسوب کر دیا گیا ہے پر بھرپور اختلاف کیا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ پروفیسر نکلسن، براؤن اور علامہ شبلی نعمانی بھی محمد قزوینی کی تائید کرتے ہیں۔ حالانکہ محمود شیرانی نے بھی عطارؔ سے منسوب حقیقی تصانیف کی نشاندہی کی تھی لیکن ڈارؔ صاحب نے ان کتابوں کے متن، شیخ عطار کے دور کے حالات اور سوانح کی بنیاد پر قزوینی کی تحقیق کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ ڈارؔ صاحب لکھتے ہیں کہ نویں صدی میں تون کے باشندوں میں ایک شخص گزرا ہے جس نے عطار اور فرید الدین کا لقب اختیار کر کے شیخ عطار کی بعض کتابوں کو اپنے نام سے منسوب کیا ہے۔ انھوں نے قزوینی کی سخت نکتہ چینی کی ہے اور ان تصانیف کی نشاندہی بھی کی ہے جنھیں بلا وجہ عطارؔ سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ اس طرح مذکورہ مضمون محمود شیرانی کے مضمون پر مستزاد تحقیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب'' اس قدر طویل اور اہمیت کا حامل مضمون ہے کہ اگر اس کو ایک الگ سے کتابی صورت میں شائع کیا جاتا تب بھی اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی۔ صفحہ نمبر 126 سے لے کر صفحہ نمبر 247 تک پھیلے اس مبسوط مضمون کا بنیادی محور شمس العلماء عبد الغنی کی تصنیف ''ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب'' ہی ہے۔ جس کو ڈارؔ صاحب نے شمس العلماء عبد الغنی کا تازہ علمی کارنامہ کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ دراصل اس تصنیف پر محمود شیرانی نے ایک ناقدانہ تبصرہ شائع کیا تھا جو اتنا طویل تھا کہ مصنف کو تبصرے کا جواب لکھنا پڑا۔ اس تبصرے میں محمود شیرانی نے شمس العلماء کی تصنیف میں بعض

فاش غلطیوں کی نشاندہی کی تھی جس سے مضمون کی اہمیت وافادیت میں کمی واقع ہوئی۔انھوں نے ردعمل میں موصوف کی سخت نکتہ چینی کی ، یہاں تک کہ انھیں بصیرت سے محروم قرار دیا۔ ڈار صاحب نے پھر مزید اس کتاب کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لے لیا اور شمس العلماء کی فاش غلطیوں کو از سر نو نمایاں کیا۔ ڈار صاحب نے جن عنوانات کے تحت موضوع کو آگے بڑھایا اس میں غلطی اور اس پر بے جا اصرار،تحریف اور غلط بیانی کی بعض مثالیں،شمس العلماء بہ حیثیت ایک ناقل اور مقلد کے، ہندوستان میں ایرانی ادیبوں اور شاعروں کی آمد،بعض غیر متعلق اور غیر ضروری مباحث،رسم الخط کے متعلق شمس العلماء کا ارشاد،ہم عصر علماء کی تحقیقات سے فائدہ اٹھانا اور اس کا اعتراف نہ کرنا،بعض ایسی غلطیاں جن کی طرف پہلے سے اشارہ نہیں کیا گیا تھا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔موصوف نے شمس العلماء کی کتاب کے متن کو صفحہ نمبر کے ساتھ رکھ کر اس کی غلطیوں کا پردہ فاش کیا ہے اس طرح محمود شیرانی کی تحقیق کی تائید بھی ہوتی ہے۔

پروفیسر محمد ابراہیم ڈار نے جو مضمون اقبال پر قلم بند کیا ہے اس میں ''اقبال کی وطن دوستی'' کو موضوع خاص بنایا ہے۔انھوں نے اقبال کی شاعری میں بعض ایسی نظموں کا ذکر کیا ہے جن میں اگر چہ وطن دوستی،قومی یکجہتی،قومی وحدت،ہم آہنگی، بھائی چارگی ،مساوات و انسانیت کی قدریں نظر آتی ہیں،تو وہیں ان میں اختلاف اور تنگ نظری کا عیب بھی نظر آتا ہے۔ لیکن انھوں نے اس مضمون میں اقبال کو صرف وطن دوست شاعر کی حیثیت سے ہی دیکھا ہے کیونکہ بقول ان کے ''ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ انسان کا کمال اس بات میں ہے کہ اس میں کم سے کم خامیاں پائی جائیں ورنہ ایسا کامل انسان تو کہاں مل سکتا ہے جو تمام خامیوں سے پاک ہو۔'' مقالاتِ ڈار کے پیش لفظ میں ماہر اقبال شناس ڈاکٹر سید عبداللہ اس مضمون کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ میری رائے میں ''اقبال کی وطن پرستی'' مضمون نسبتاً نا تمام اور محتاج تکمیل ہے اور کسی حد تک سیاسی جوش کے تحت لکھا گیا ہے۔اسی وجہ سے اس کی علمی روح خاصی کمزور ہے۔

''مقالاتِ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار'' کا چھٹا مضمون ''حیاتِ شبلی پر ایک نظر'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔مولانا شبلی نعمانی انیسویں صدی کے اعلیٰ پایہ کے قلم کاروں میں شمار کیے

جاتے ہیں۔شبلی ایک عظیم مورخ، حقیقت شناس محقق، وسیع النظر شاعر، بہترین دانشور، جدید طرز کے سوانح نگار، معتبر ناقد، رمز شناس مبصر اور مقبول مکتوب نگار تھے۔شبلی نہ صرف ایک اچھے ادیب بلکہ ایک نامور عالم بھی تھے۔انھیں اردو، عربی اور فارسی زبان پر قدرت حاصل تھی۔مشرقی ادب اور اس کی تاریخ کے مطالعہ میں انھیں اردو کے تمام ادبا پر فوقیت حاصل ہے۔اس طرح مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی شخصیت گوناگوں اوصاف سے مہمیز ہیں۔ سید سلیمان ندوی جو اِن کے معنوی فرزند اور حقیقی جانشین تھے، ساتھ ہی جن کی علمی فتوحات کا دائرہ بھی بہت وسیع تصور کیا جاتا ہے، نے ہی ان کی سوانح حیات لکھی۔جب شبلی نعمانی سیرت النبی ﷺ کو تکمیل تک پہنچائے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اس کو سید سلیمان ندوی نے ہی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ڈار صاحب نے اسی عظیم شخصیت پر سید سلیمان ندوی کی سوانح ''حیاتِ شبلی'' کو اپنے مقالے میں موضوع بنایا ہے اور ابتدا میں سید صاحب کے علمی کارناموں کے حوالے سے عقیدت سے پُر تمہید لکھی۔انھوں نے سید صاحب کی علامہ شبلی سے بحیثیتِ ایک شاگرد وابستگی، بحیثیتِ ایک عالم شبلی کے ساتھ ان کی قربت، بحیثیت ایک جوہر قابل شخصیت، رسائل الندوہ اور معارف میں ان کے شریکِ کار مدیر اور خصوصی طور پر سیرت النبی کی تکمیل میں شبلی کے خاص معاون کار کی حیثیت سے سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی اور مذہبی خدمات کو بیان کیا ہے۔ڈار صاحب نے حیاتِ شبلی پر بات کرتے ہوئے ''حیاتِ شبلی کے ماخذ''، ''حیاتِ شبلی کا درجہ بطور سوانح عمری کے''، ''حیات شبلی کی کامیابی کے اسباب''، ''حیات شبلی میں سید صاحب کا ذکر''، ''سید صاحب کا اسلوب'' وغیرہ کا پورا جائزہ لے کر حیات شبلی کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

حیات شبلی میں ڈار صاحب ایک اہم پہلو کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب کے رجوع کی ایک اور مثال جانداروں کی تصویر کی ہے۔غالباً 1920 یا 1921 میں تصویر کھنچوانے کے جواز میں انھوں نے رسالۂ معارف میں دو مضمون لکھے تھے لیکن اب آپ کے نزدیک کسی جاندار کی تصویر کی اشاعت جائز نہیں۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حیات شبلی

میں شبلی کی تصویر کو جگہ نہیں دی گئی ہے۔"

حیات شبلی کی کامیابی کے اسباب میں محمد ابراہیم ڈار نے لکھا ہے کہ شبلی کی رائے میں سیرت کی کتاب ایسی ہونی چاہیے کہ اس سے صاحب سیرت کا پایہ اونچا نظر آئے۔ موصوف مقالہ نگار بھی حیات شبلی کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ حیات شبلی کے اوراق شبلی کی عظمت اور بزرگی کے شاہد عدل ہیں۔ سید صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اپنے مرحوم استاد کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے اور اردو شناسوں کی علمی اور ادبی ضیافت کا خوش گوار فرض مع تمام تکلفات کو بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔

"اقبال اور عربی شعرا" مقالات ڈار کا ایک بہت ہی مفید اور معلومات افزا مقالہ ہے۔ اس میں محمد ابراہیم ڈار نے اُن عربی شاعروں کے کارناموں اور زندگی کے اہم واقعات کو صفحۂ قرطاس پر اُتارا ہے جن کا ذکر علامہ اقبال نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ اقبال ہمیشہ عجمیت کے مخالف اور عربیت کے دلدادہ تھے، اس کو ڈار صاحب نے بھی لکھا ہے۔ موصوف مقالہ نگار ہماری توجہ اس جانب مرکوز کرتے ہیں کہ اگرچہ اقبال عجمیت کے مخالف تھے تو اس کے باوجود انھوں نے عجمیت کی ہی پیروی کی ہے اور عربیت کو اپنی شاعری میں کم جگہ دی ہے۔ شاید یہ مقالہ لکھنے کی تحریک دراصل انھیں ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون "اقبال کے مرغوب فارسی شعراء" سے ملی ہے۔ اس سے پہلے بھی سید عبداللہ "اقبال شعرائے فارسی کی صف میں" لکھ چکے تھے۔ ان مضامین میں انھوں نے بالترتیب ایک تو اقبال کے کلام پر فارسی شعرا کا اثر دکھانے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ساتھ اقبال کے فارسی کلام کی خوبیاں بیان کر کے انھیں فارسی شعرا کی صف میں کھڑا کیا ہے۔ اقبال معروف فارسی شعرا عرفی، نظیری، حافظ، بیدل اور رومی وغیرہ کی شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں جب کہ عربی شعرا کی تعداد اس کے برعکس نہایت قلیل ہے۔ ڈار صاحب نے جن عربی شعرا سے اقبال کو متاثر پایا ہے اور جس کی نشاندہی ان کے کلام سے ہوتی ہے۔ ان شعرا میں ابن بدرون، شیخ حسام الحق ضیاء الدین، بوصیری، زہیر، کعب، عبدالرحمٰن اوّل، معتمد، ابوالعلاء وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ موصوف نے مختلف اشعار

کا حوالہ دے کر واقعات کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شعر وادب میں اقبال کے وہ اشعار خاص اہمیت کے حامل ہیں جن میں انھوں نے شعرائے عرب کو خطاب کیا ہے۔ ان اشعار کی مدد سے ایک حد تک یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ نے عربیت کے اس درجہ دلدادہ ہونے کے باوجود عربی شعرا کے سرچشمہ سے کیوں فیض حاصل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبالؔ ''نواگران'' کی جادو طرازی سے اس درجہ مسحور تھے کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک اس سحر سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ عربی شعرا کی طرف ان کی عدم توجہی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ عجم کے سبزہ زاروں کی تازگی اور طراوت نے انھیں ہمیشہ اپنی طرف کھینچا اور ان کی سدابہار شادابی ورنگینی شاعر کے لیے لطف اندوزی کا سامان بہم پہنچاتی رہی۔

محمد ابراہیم ڈار مسلمانوں سے متعلق تاریخی واقعات کا اچھا خاصا علم رکھتے تھے جس کا اندازہ ان کے اس مضمون ''اسپین کی اسلامی تاریخ کا ایک ورق: اشبیلیہ کا نامور تاجدار المعتمد علی اللہ'' سے ہوتا ہے۔ تاہم اس کا آئیڈیا بھی ڈار صاحب کو اقبال کی شاعری سے ہی ملتا محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اقبالؔ نے محمد بن عباد المعروف کی ایک آزاد نظم کا ترجمہ کیا تھا جو کہ ان کے مجموعہ کلام ''بالِ جبریل'' میں شامل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے المعتمد علی اللہ کی عالی جاہ، فرمانبردار، عدل و شجاعت، رعایا پسند حکمران اور بے شمار اوصاف سے متصف شخصیت کا خاکہ تیار کیا ہے۔ المعتمد علی اللہ ایک صالح اولاد، وفادار دوست، دردمند باپ، دلیر اور منصف حکمران، مساوات پرست، علم پرور اور عظیم المرتبت بادشاہ تھا۔ جو اپنے باپ کا صالح، فرزندوں کا دردمند، رعایا پرور اور دوستوں کا دوست تھا۔ جو بھائی چارگی میں یقین رکھتا تھا، شعر وادب کا نہ صرف دلدادہ تھا بلکہ خود بھی مذاق سخن رکھتا تھا، جانباز اور دلیری میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ بچوں کی تربیت اس طرح کرتا تھا کہ وہ قوم پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ ایسے شخص کو عظیم نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ ڈار صاحب نے جس طرح ان کی عالی شخصیت کو سپرد قلم کیا ہے وہ بہت ہی قابل تعریف ہے۔ ڈار صاحب کا المعتمد پر یہ ایک ایسا مضمون ہے جس سے اسپین میں اسلامی تاریخ کے ایک اہم باب کا پتہ چلتا ہے۔ اس مضمون سے بادشاہوں کے شعر و سخن کے مذاق سے واقفیت بھی حاصل ہوتی

ہے، مسلمانوں کے کمالات اور انسان پرستی کی مثال بھی ملتی ہے۔ مجموعی طور پر مضمون بہت دلچسپ اور معلومات سے لبریز ہے۔

''باقر علی ترمذی مرحوم'' پر ڈار صاحب کا ایک مؤثر مضمون ہے۔ باقر علی ترمذی ان کے خاص رفقاء کار رہے ہیں جن سے ان کی ملاقاتیں اکثر و بیشتر ہوتی رہتی تھیں۔ ڈار صاحب ان کی شخصیت سے متاثر بھی تھے۔ یہ مضمون ترمذی صاحب کے انتقال کے بعد لکھا گیا ہے جس کا اظہار موصوف نے خود بھی کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ترمذی صاحب سے اپنے تعلقات، ان کی تعلیمی اور علمی لیاقت، اسماعیل یوسف کالج، بمبئی میں بحیثیت لیکچرر ان کی تعیناتی، ان کے خاندانی علمی روایات، اردو، عربی اور فارسی زبان میں ان کا علمی ذوق، ان کی محنتی اور جفاکش شخصیت، محققانہ صلاحیت، ان کے اجداد، ان کے مذہبی نظریات و خیالات، مطالعہ کتب کا شوق، مذہبی عقائد، ان کی سادہ لوحی، دوستانہ مزاج، ان کی خط و کتابت میں عمدہ مرقع نگاری وغیرہ کا غیر جانبداری سے تذکرہ کیا ہے۔ قارئین کو اس بات سے آگاہ کراتے جائیں کہ باقر علی ترمذی عنفوان شباب میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے تھے۔ مرتے وقت ان کی عمر محض پینتیس برس تھی۔ ترمذی مرحوم کی مشاغل کے حوالے سے ڈار صاحب یوں رقمطراز ہیں:

> ''مطالعۂ کتب کے علاوہ بھی وہ گوناگوں مشاغل میں الجھے رہتے تھے۔ کبھی خاندانی اُلجھنیں سلجھانے میں مصروف ہیں اور کبھی خانگی اُمور کی غور و پرداخت ان کی سرگرمیوں کا محور ہوتی۔ ان میں کام کرنے کی صلاحیت حد سے زیادہ تھی۔ ان کے فلسفۂ زندگی کا مرکزی نقطہ عملِ پیہم تھا۔ نہ وہ خود چین سے بیٹھتے اور نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتے۔ کالج سے اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کے بعد اکیلے وہ شہر کا رخ کرتے۔ شہر کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر کتب خانہ ہوگا جس کی انھوں نے سیر نہ کی ہو۔ بمبئی یونیورسٹی، بمبئی ایشیاٹک سوسائٹی، کاما انسٹی ٹیوٹ اور جامع مسجد کے کتب خانے ان کی علمی فتوحات کے مرکز تھے۔ ان کتاب خانوں میں اسلامیات سے متعلق تمام نادر مخطوطات ایک ایک

کر کے ان کے علم میں تھے اور وقتاً فوقتاً وہ ان سے اقتباس کرتے رہتے۔"

(مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، مرتب ثانی از پروفیسر عبدالستار دلوی،

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی، اپریل 2014، ص322)

مقالات ڈار کا ایک مضمون سترھویں صدی کے جانباز مغل حکمراں اورنگ زیب پر بعنوان "رقعاتِ عالمگیر" تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں اورنگ زیب کے خطوط کو موضوع بنایا گیا ہے جو اُنھوں نے اپنے جانشین اور رفقاء کو لکھے تھے۔ اس کے علاوہ کئی خطوط ایسے ہیں جن کی حیثیت محض ایک سرکاری دستاویز کی ہے۔ اورنگ زیب کے یہ خطوط کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ڈار صاحب لکھتے ہیں کہ عالمگیر کے رقعات کے مجموعوں میں بہت سے خطوط ادبی اعتبار سے بہت بلند مقام کے مستحق ہیں۔ جس کی بنا پر محمد حسین آزاد نے اورنگ زیب کے رقعات کو گلستانِ سعدی کہا ہے۔ ڈار صاحب نے یہ مضمون کس سن میں لکھا تھا اس کا اندازہ لگانا اگرچہ مشکل ہے، تاہم جس زمانے میں ڈار صاحب نے یہ مضمون لکھا تھا اس وقت رقعات عالمگیر کے جمع وترتیب کی طرف توجہ نہ دی جانے پر انھوں نے اظہار افسوس کیا تھا۔ حالانکہ نجیب اشرف ندوی نے انہی دنوں رقعاتِ عالمگیر جلد اوّل کو مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اِسی جلد پر مذکورہ مضمون زیر بحث آیا ہے۔ کیونکہ ڈار صاحب نے اس جلد میں قرأت وطباعت کی بہت سی اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے ہر غلط قرأت کے سامنے صحیح قرأت کی صراحت کردی ہے۔ بہر حال اورنگ زیب کے ان خطوط کی تاریخی، علمی اور ادبی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

محمد ابراہیم ڈار نے چونکہ ایک طویل عرصہ گجرات میں دورانِ ملازمت گزارا تھا۔ اس لیے جو تجربہ انھیں زبانوں کے بارے میں وہاں رہ کر ہوا اُس کا کچھ اثر اس مضمون "گوجری اور اردو زبان کی نشوونما میں اہل گجرات کا حصہ" میں بخوبی نظر آتا ہے۔ اس میں ڈار صاحب نے گجرات کے ابتدائی زمانے سے لے کر ولی تک کے سبھی متقدمین گجراتی قلم کاروں کے زبان وادب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، جنھوں نے اردو زبان کی بڑی حد تک آبیاری کی ہے۔ موصوف نے شیخ احمد کھٹو، قطب عالم، فضل الدین محمد بن قوام بلخی، شاہ بہاء الدین باجن، قاضی محمود، شاہ علی جی گام دھنی، ابوالحسن، سید ابراہیم، شاہ برہان الدین جانم، امین الدین

اعلیٰ، خوب محمد چشتی، محمد امین، مسکین، ولی کے عہد، حالات، سوانح، رواج، نظریے، ملفوظات، تصانیف، زبان، فقرے اور پیری مریدی کا ذکر چھیڑ کر اصل موضوع تک رسائی حاصل کی ہے اور اس طرح انھوں نے گوجری اور اردو زبان کی نشو ونما میں گجراتی اہلِ قلم کے رول کو واضح کر دیا ہے۔ ''جاحظ کے سوانح حیات اور اس کی تصنیفات'' ایک ایسا مضمون ہے جس کی تلاش وجستجو میں پروفیسر عبدالستار دلوی کو ایک سال سے زائد عرصہ لگا اور جب رسائی ہوئی تو اورینٹل کالج میگزین جس میں یہ مضمون چھپا تھا کی حالت نہایت ابتر تھی۔ بہر کیف دلوی صاحب کی اس کھوج کی داد بھی دینی ہوگی جو انھوں نے اس قدر مفید مضمون سے قارئین کو فیض پہنچایا۔ اس میں جاحظ کی سوانح حیات اور تصنیفات کی پوری تفصیل ملتی ہے اور کتابوں کی تقسیم بہ لحاظِ موضوع بھی دی گئی ہے۔

ڈار صاحب نے یہ تمام مقالات بڑی محنت، جانفشانی اور عرق ریزی سے لکھے ہیں۔ ہر مقالے میں ان کی اہمیت کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے ان مضامین سے صرف تحقیق ہی نہیں بلکہ تنقیدی عنصر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اس مجموعۂ مقالات میں ایک دو مضامین تاثراتی نوعت کے ہیں۔ جب کہ دیگر میں اعلیٰ تحقیقی کاوش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان مضامین میں حد سے زیادہ تعریف وتنقیص بھی نہیں کی گئی ہے بلکہ ہر مقالے میں مساویانہ روّیہ اختیار کیا گیا ہے جو کہ حقیقت پسند اور صداقت شعار قلم کار کی پہچان ہے۔ یہ مقالات ایک سلجھے ہوئے فن کار کی باریک بین، نکتہ رس اور دقیقہ شناس نظر سے آشنا کراتے ہیں۔ محمد ابراہیم ڈار کے پیرایۂ اظہارِ بیان پر گفتگو کی جائے تو یہاں بھی وہ کسی مقالہ نگار سے پیچھے نظر نہیں آتے بلکہ ان کا اسلوب بیان بہت دلکش، شستہ، دلپزیر اور روانی کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ گنجلک و پیچیدہ اظہارِ بیان کا کوئی عیب ان کی تحریر میں نہیں۔ ان کا لب ولہجہ پر سکون اور فرحت بخش ہے۔ ان کی باتوں میں ایسی کوئی گن گھرج اور خشکی نہیں پائی جاتی جس سے کسی کو ٹھیس پہنچتی ہو۔ ان کی تحریریں سادگی اور دلنشینی کی مثال قائم کرتی ہیں۔ ان کے مقالات میں کہیں تسلسل ٹوٹتا نظر نہیں آتا بلکہ ربط وضبط اور موزونیت کو برقرار رکھنے میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ مقالات ڈار پر گفتگو کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

مضمون نگار نے سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ اپنی بات رکھی ہے۔انھوں نے اپنے معاصرین پر بغیر ہچکچاہٹ صحیح رائے قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ مقالات منطقی استدلال، معجز بیانی اور جذب صادق سے ممیز ہیں۔

مقالاتِ ڈآر کے تقریباً سبھی مضامین تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں اور سب کو تحقیق کے میدان میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔زیرِنظر جدید ایڈیشن کے منظر عام پر آنے سے اس کی وقعت میں قابل قدر اضافہ ہوگیا ہے۔اس قدر دیرپا، مستند اور اعلیٰ تحقیقی سرمایے کی حفاظت بھی اردو کی بقا، ترقی اور اس کے تحفظ کا ضامن بنتی ہے۔ورنہ ہمارے بزرگوں کا بہت سا علمی و ادبی تحقیقی سرمایہ دستبرد زمانہ ہوگیا ہے اور بہت سا اردو رسائل و جرائد کے اوراق میں دب کر رہ گیا ہے۔کیونکہ بہت سے محقق و ادیب اپنے فن پاروں کو زمانے کی ستم ظریفی کے سبب جمع کر کے شائع کرنے سے قاصر رہے۔مزید زمانے میں انھیں صحیح قدر شناس بھی نہیں ملے۔محمد ابراہیم ڈار کی خوش بختی ہے کہ ان کے حصے میں مدنی صاحب جیسے شاگرد آئے۔اب مدنی صاحب کے ہونہار و باصلاحیت، لائق و فائق شاگرد عبدالستار دلوی نے اس کام کو نئے سرے سے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔مقالات ڈآر کی پشت پر دونوں مرتبین کا سرسری تعارف پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب سے تحقیقی کام انجام دینے والے حضرات نہ صرف تحقیقی طریقہ کار سیکھ سکتے ہیں بلکہ اس سے ان کے تحقیقی نظریات میں وسعت بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

# شوکت پردیسی: شخصیت اور شاعری

ریاست اتر پردیش کے ضلع جونپور کو نہ صرف تاریخی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے بلکہ ادبی، مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے بھی سرزمینِ جونپور بہت زرخیز ہے۔ شیرازۂ ہند کے نام سے مشہور اس مقام سے وقتاً فوقتاً نامی گرامی ادبی ہستیاں جنم لیتی رہی ہیں جنھوں نے جونپور کو سرمایۂ افتخار سے سرفراز کیا ہے۔ عالموں، شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں وغیرہ کی یہ فہرست اگرچہ کافی طویل ہے لیکن احسان فراموشی ہوگی اگر اردو علم و ادب کو بحرِ بیکراں جیسی وسعت عطا کرنے والے ان معماروں کے نام نہ لیے جائیں۔

فخرِ مشرق شفیق جونپوری، مولانا ظفر احسن ظفر صدیقی، مولانا عزیز ربانی عزیز، رشید احمد صدیقی، حفیظ جونپوری، بیدل جونپوری، کامل شفیقی، شمیم پردیسی، حبیب ظفر آبادی، واحد جونپوری، انور صدیقی، سید غلام سمنانی، محسن رضا جون پوری، رہبر جونپوری، سلام مچھلی شہری اور وامق جونپوری وغیرہ جیسے علمی و ادبی حضرات کے کارنامے اردو زبان و ادب میں تابناکی کی روشن مثال پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے زمانے کی پیڑی کو متاثر کیا بلکہ آنے والی نسلیں بھی ان کے چھوڑے ہوئے سرمایہ سے استفادہ کرتی رہی ہیں۔

شیخ محمد عرفان المتخلص شوکتؔ پردیسی بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں ادبی افق پر اُبھرنے والے ایک کثیر الجہت اور معتبر شاعر گزرے ہیں۔ ان کا آبائی وطن بھی جونپور ہی ہے مگر ان کے والد شیخ صاحب علی مرحوم کی زندگی کا بڑا حصہ ملیشیا میں گزرا اور یہیں شوکت پردیسی کی پیدائش اپریل 1924 میں ہوئی۔ ایامِ طفلی کافی مادی آسائشوں کے ساتھ

ملیشیا کے سبز دامن میں گزری۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم ملیشیا ہی میں پائی۔ بارہ سال کی آپ والدین کے ساتھ ہندوستان آئے اور پھر نامساعد حالات کی وجہ سے کبھی واپس نہ جاسکے۔ ان کے والد صاحب نے ابتدائی دو سال لکھنؤ میں رہنے کے بعد شہر جونپور میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ یہاں آکر شوکت پردیسی کا داخلہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کرایا گیا۔ جونپور ہجرت کرنے کے بعد ان کا تعلیمی سفر مشن اسکول جونپور میں درجہ ہشتم تک جاری رہا۔ لیکن شوکت پردیسی اپنی تعلیم کو مزید جاری نہ رکھ سکے۔ جس کی وجہ پہلے ان کی شادی اور بعد میں یکے بعد دیگرے والدین اور بڑی بہن کا اس دارِ فانی سے کوچ کر جانا تھا اور نتیجتاً گھر گرہستی کی ذمہ داریوں کا پورا بوجھ شوکت پردیسی ہی کو اٹھانا پڑا۔ حصولِ معاش کے سلسلے میں پہلے ہومیوپیتھی سے منسلک ہوئے لیکن بحیثیتِ معالج انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ حاصل ہوسکی۔ بعد میں اپنے خسر حافظ اختر علی کے پاس چلے گئے جو کاشت کاری کے ساتھ ساتھ شہر جونپور میں مختار تھے اور شوکت پردیسی بطورِ معاون ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ بالآخر بعض مصلحتوں کی بنیاد پر ان کے رشتے میں دراڑ پیدا ہوئی اور غالباً 1950 کے آس پاس بمبئی کو جو آج ممبئی کے نام سے مشہور ہے کو اپنا میدان عمل بنایا۔ بمبئی میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے کئی ملازمتیں کیں۔ روزنامہ ''انقلاب'' میں کام کیا۔ بچوں کا رسالہ ''منا'' جاری کیا اور کچھ فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔ غرض کہ جہدِ زندگی کے سفر میں مسلسل مصروف رہے اور اسے کامیاب بنانے کی حد درجہ کوشش کی۔ ابھی اپنے ادبی ذوق وشوق ہی کی نمو میں لگے تھے۔ یہاں تک کہ اردو شعر وادب کی دنیا میں کوئی خاص مقام حاصل کرتے یا اپنی خاص پہچان بناتے کہ اختلاجِ قلب کے مریض ہوگئے اور پھر بیماریوں نے اس قدر اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ واپس اپنے آبائی وطن کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ اس کے بعد پوری زندگی اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ جونپور میں ہی بسر کی۔

جونپور آکر شوکت پردیسی کھیتی باڑی سے منسلک ہوگئے، چونکہ ادب کے ساتھ ان کا واسطہ فطری تھا، شاعری کرتے تھے، ادبی لوگوں کے ساتھ ان کا اُٹھنا بیٹھنا تھا، ادبی کاموں کے ساتھ جڑے رہنے میں ہی ان کی فارغ البالی تھی لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مگر

جونپور میں انھیں بے کسی، تنگ دستی، مفلسی، لاچاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا پڑی۔ آلام و مصائب اور ذہنی کرب نے انھیں لاغر بنا دیا۔ جس کا اندازہ مرتبِ کتاب اور ان کے سعادت مند فرزند ندیم احمد جونپوری کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

> ''بچپن میں مَیں نے انہیں صرف شیروانی میں ہی نہیں سوٹ اور ٹائی میں بھی دیکھا تھا۔ وقت کے ساتھ سوٹ گیا، ٹائی گئی اور آخر میں شیروانی بھی۔ کچھ دنوں تک کرتے اور پاجامے میں رہے۔ لیکن سفید پوشی کا یہ لباس بھی ایک وقت کے بعد ان کی بساط سے باہر ہوگیا۔ پھر اپنی زندگی کا آخری دور انھوں نے بالعموم پڑے کے پاجامے اور معمولی قسم کے کرتے میں گزارا۔ اسے میں اپنی آنکھوں کا المیہ ہی کہوں گا کہ سوٹ، ٹائی اور شیروانی پہننے والے شوکت پردیسی کو اس نے اُن کے آخری دور میں پیوند لگے پاجامے میں بھی دیکھا۔''

متذکرہ بالا اقتباس سے شوکت پردیسی کی شاہانہ اور مفلسانہ زندگی کے دونوں رُخ آشکارا ہو جاتے ہیں۔ جس شخص کی ابتدائی زندگی خوشحالی اور فارغ البالی میں بسر ہوئی ہو اس کے لیے یکسر غریب الوطنی کی زندگی گزارنا کس قدر المیہ کا باعث تھا اس کا صحیح صحیح اندازہ شوکت پردیسی کی حیات کے مطالعہ سے آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ مالی اعتبار سے شوکت پردیسی کا اونچائی سے پستی کا یہ سفر انتہائی کرب انگیز رہا ہے۔ بنیادی طور پر موصوف بہت نفاست پسند، بے حد حساس، نہایت حلیم ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گفتار و خوش کردار، مخلص و بے باک، خوددار و شریف النفس، خوبصورت و خوب سیرت انسان واقع ہوئے ہیں۔ بحیثیتِ ایک شوہر، باپ، دوست اور ایک انسان کے انھوں نے حد درجہ مخلصی، اخلاق اور وضع داری کا فریضہ انجام دیا۔ موصوف نے اپنے بچوں کو تنگ دامنی کا احساس تک نہیں ہونے دیا بلکہ انھیں ایک اچھی تعلیم و تربیت دی۔ شوکت پردیسی 1995 میں اس جہاں فانی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گئے۔ ان کے فرزندان میں چار بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی جن کے نام شمیم احمد، وسیم احمد، ندیم احمد، کلیم احمد اور بیٹی شگفتہ روبی ہیں جو سب بقیدِ حیات ہیں۔

شوکت پردیسی پر خامہ فرسائی کرنے کا موقع بھی ان کے فرزندان ہی کے سبب نصیب ہوا ہے۔ خصوصاً ندیم احمد جونپوری کے ہم بے حد ممنون و مشکور ہیں جنھوں نے اپنے والدِ محترم کے ادبی سرمایے کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ مواد کو اکٹھا کیا اور بعد میں اسے سلیقے سے ترتیب دے کر شائع بھی کیا۔ حقیقی معنوں میں شوکت پردیسی کے ورثاء مبارکبادی کے مستحق ہیں جنھوں نے اپنے مرحوم والد کے ادبی سرمایے کو منظر عام پر لانے کا اہتمام کیا۔

شوکت پردیسی اپنی ذاتی زندگی میں مشکلات، مصائب اور پریشانیوں کے باوجود ایک اچھے انسان بن کر اُبھرے۔ ان کی زندگی میں غم، دکھ، درد اور تکلیفیں آئیں لیکن کبھی نا اُمید نہیں ہوئے۔ انھوں نے شاعری کو وسیلہ بنا کر اپنے غم کی دوا کی۔ موصوف ایک باکمال شاعر تھے۔ اردو کے مشہور و معروف شعرا اور ادبا رئیس امروہوی، حرمت الاکرام، سلام مچھلی شہری، تصدیق سہاوری، جاں نثار اختر، سنجر عظیم آبادی، ماہر القادری، نازش پرتاب گڑھی، مخمور سعیدی، ساغر نظامی، تابش مہدی، سلام سندیلوی، شفیق جونپوری اسرار الحق مجاز، ملک زادہ منظور احمد وغیرہ حضرات ان کے معاصرین میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کے ہم راہ ادبی و شعری نشستوں میں بیٹھ کر موصوف نے اپنے شیریں کلامی اور قادر الکلامی سے سامعین کے دل جیتے ہیں۔

شاعری میں شوکت پردیسی حد درجہ حساس نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ نثر نگاری بھی آپ بے حد فتین ثابت ہوئے۔ لیکن نثر نگاری سے صرفِ نظر انھوں نے شاعری ہی کو اپنی ذات اور شخصیت کا محور سمجھا۔ شوکت پردیسی کو اس بات کا بڑا ملال رہا ہوگا کہ نجی زندگی میں گونا گوں مصرفیات اور تکلیفات کے باعث وہ اپنی بیش قیمتی ادبی سرمایے کا ایک بڑا حصہ محفوظ نہ کر سکے۔ اردو کے بہت سارے ادبا کے ساتھ ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جس کے سبب دنیا اُن کے علم و فن سے نا آشنا رہی۔ اس کے برعکس موصوف کی خوش بختی یہ تھی کہ انھیں لائق و فائق فرزندان عطا ہوئے جنھوں نے ان کی بچی ہوئی تحریرات اور نگارشات کو شائع کر کے ادبی دنیا کو ایک باوقار اور باصلاحیت شخصیت سے متعارف کرایا۔ شوکت پردیسی کی اب تک چار کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں تین شعری مجموعے اور ایک نثری مضامین کا مجموعہ شامل ہے۔ ان کا اوّلین شعری مجموعہ

''تحفۂ اطفال'' 2011 میں شائع ہوا، جو بچوں کی نظموں پر مشتمل ہے۔ نظموں، گیتوں اور تہنیتی نغمات پر مشتمل ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''مضرابِ سخن'' کے نام سے دسمبر 2012 میں منظر عام پر آیا۔ جب کہ ان کے تیسرے شعری مجموعے ''سازِ نغمہ بار'' کی اشاعت اول مئی 2015 میں عمل میں آئی۔ اس مجموعے میں موصوف کی غزلیات، قطعات اور رباعیات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نثری مضامین پر مشتمل ایک چھوٹی سی کتاب بھی 2015 ہی میں شائع ہوئی۔

شوکت پردیسی نے اپنا ادبی سفر غالباً 1938 میں ''محمد عرفان جونپوری'' کے قلمی نام سے شروع کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف اوقات میں ''محمد عرفان نشاط جونپوری'' اور ''شوکت جونپوری'' کا تخلص بھی اپنے نام کے ساتھ موسوم کیا۔ بالآخر 1950 میں بمبئی میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے ''شوکت پردیسی'' کے تخلص کو اپنی ادبی زندگی کی شناخت اور پہچان کا ذریعہ بنایا۔ اردو ادب سے وابستہ حضرات اب انھیں شوکت پردیسی کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ انھیں علامہ محوی صدیقی لکھنوی، سرشار کسمنڈوی، سیماب اکبر آبادی، حسرت موہانی، بتین سروش، حرمت الاکرام اور نوح ناروی جیسے اصحابِ قلم سے شرفِ تلمذ رہا ہے۔ شوکت پردیسی نے اپنی پہلی غزل 14 برس کی عمر میں کہی۔ جس کا ایک شعر یوں ہیں:

ہم نشین ابتدائے الفت میں
نظر انجام پر نہیں جاتی

جب جب شوکت پردیسی کے فن اور شخصیت پر کوئی تحریر رقم کی جائے گی۔ تب تب اس شعر کو یقیناً دہرایا جائے گا۔ اپنے تخلیقی سفر کے آغاز کی اشاعت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''غالباً 1945 میں یا اس کے آس پاس بھائی رئیس امروہوی نے پہلی بار ''نیرنگ خیال'' لاہور میں مجھے پیش کیا۔ اس کے بعد مسلسل لکھنے اور چھپنے کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن پھر صحت نے جواب دینا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ دل و دماغ کی توانائی، آنکھوں کی بینائی اور

دانتوں کی نعمت ہر چیز سے محروم ہوگیا۔ اب تو میں صرف اختلاج قلب کا مستقل مریض ہوں''۔ اسی لیے یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں:

زندگی پر مَیں بار ہوں شوکتؔ
بار ہے مجھ پہ زندگی میری

امراض نے نہ صرف موصوف کو مالی، جسمانی، ذہنی اور طبعی اعتبار سے کمزور کردیا بلکہ ان کے محبوب مشغلۂ حیات کو بھی اثر انداز کردیا۔ جس کی حسرت انھیں اندر ہی اندر تڑپاتی رہی اور جس کے زیاں کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا۔ اس سلسلے میں ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے:

کوئی زندہ تمنا دل کے گوشے میں ہے اے شوکتؔ!
کہ چشمِ شوق سے کچھ گلفشانی اب بھی ہوتی ہے!!

شوکتؔ پردیسی کا ادبی سفر رُک رُک ہی کر سہی لیکن مسلسل رواں دواں رہا۔ ان کی شاعری شیریں گفتاری، خوش کلامی اور ژرف نگاری کے فنی رچاؤ کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل وجرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں جن کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ انھوں نے فلمی اور غیر فلمی گیت بھی لکھے ہیں۔ جنھیں گلوکارِ اعظم محمد رفیع، طلعت محمود، آشا بھونسلے، مکیش، منا ڈے، سی ایچ آتما، انوپ جلوٹا، دلراج کور وغیرہ گلوکاروں نے اپنی مدھر آوازیں دی ہیں۔ لیکن بحیثیتِ گیت کار انھیں اپنی شخصیت کی طرح فلموں اور گیتوں میں بھی گمنامی ہی حاصل ہوئی۔

شوکتؔ پردیسی نے جس عہد اور زمانہ میں شعروشاعری شروع کی۔ اُس وقت اُن کے ہم پلہ اردو شعروادب کی مایہ ناز شخصیات کا دبدبہ تھا۔ لیکن موصوف نے ایسے ہی شعرا کے دوش بدوش اپنی پہچان بنائی۔ کسی گروپ ازم کے شکار نہیں ہوئے بلکہ اپنے رنگِ سخن میں فنی کمالات کا مظاہرہ پیش کرتے رہے۔ شوکتؔ پردیسی ذاتی زندگی میں جن حادثات وواقعات سے دوچار ہوئے انہی کو اپنی شاعری کا موضوع خاص بھی بناتے رہے۔ مگر ان کی شاعری غم و

یاس، درد و کرب اور حزن و ملال جیسے موضوع کے ارد گرد ہی نہیں گھومتی بلکہ نشاط و انبساط، عدل وانصاف، امن وامان، محبت وعقیدت، نصیحت و پیام، مذہبی رواداری، قومی یکجہتی، تعمیری و تربیتی، فکری و اصلاحی موضوعات ان کی شاعری جلوہ گر ہوئے ہیں۔ دراصل مصنف کو زندگی کا بڑا تجربہ حاصل ہے۔ انھوں نے بلندی اور پستی دونوں پہلوؤں کی عکاسی غیر جانبداری سے کی ہے۔ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے اور کیا کہہ رہا ہے اس کا علم اسے خوب ہے اور اُسے اپنے فن کو کسی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے شوکت پردیسی نے بجا طور پر اپنے فن کے بارے میں کھلے الفاظ میں اظہار کیا ہے کہ:

> ''میری شاعری کا موضوع ویسے تو رومان ہی رہا ہے، لیکن دراصل میری شاعری نہ رومانی ہے نہ سیاسی بلکہ میرے اپنے حالات کی ترجمان ہے اور بس۔ رباعی، قطعہ، غزل، نظم کم وبیش میں نے سب ہی اصناف سخن کا گلا گھونٹا ہے۔''

شوکت پردیسی نے زندگی کی ہر سطحِ منزل اور سطحِ فکر کو موضوعِ سخن بنایا۔ انھوں نے زندگی، ذات، حیات و ممات اور کائنات کا وسیع و عمیق مطالعہ اور مشاہدہ کر کے اپنے فکر و احساسات اور جذبات و خیالات کو سپرد قلم کر کے ہمیشہ کے لیے جاودانی بخشی۔ ان کا فن رومانیت سے لبریز ہے جس میں خارجیت ہے اور داخلیت بھی۔ جس میں فنی اختصاص ہے اور حسن وعشق کی آمیزش بھی۔ جس میں موسیقیت ہے اور غنائیت بھی۔ جس میں مسّرت ہے اور غم کی کیفیت بھی۔ جس میں حقیقت پسندی ہے اور معاملہ بندی بھی۔ جس میں جاذبیت ہے اور معنویت بھی۔ جس میں معاشرے کے لاتعداد مسائل کی منظر کشی ہے اور ان کے تئیں فکر بندی بھی وغیرہ۔ سید راشد حامدی، شوکت پردیسی کی رومان پسند شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ان کی نظموں کا آہنگ رومانیت سے بھرپور ہے مگر ان کی شاعری پر رومانی شاعری کا لیبل لگانا قدرے مشکل امر ہے۔ کیونکہ ان کی نظمیں بالعموم اپنے پورے جمالیاتی دروبست اور رومانی آہنگ کے ساتھ ایک خاموش فضا پیدا

کرتی ہیں، جو سامع اور قاری کو لاشعوری طور پر کشاں کشاں اس بنیادی نکتے کی طرف لے جاتی ہیں جس کی تہہ میں صالح عناصر کی کارفرمائی پورے شدومد کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے''۔

متذکرہ بالا اقتباس سے شوکت پردیسی کی رومانی شاعری کے درپردہ وسیع وعمیق معنی اور افکاروخیالات واضح ہوجاتے ہیں۔ادبِ اطفال میں ان کی خصوصی دلچسپی کا رنگ جھلکتا ہے۔انھوں نے وافر مقدار میں بچوں کے لیے نظمیں لکھی ہیں۔''تحفۂ اطفال'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔جس میں کل ملاکر 95 نظمیں مختلف موضوعات کے تحت قلم بند کی گئی ہیں۔اس بات کو کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنا کوئی آسان کام نہیں۔لیکن اس صنف میں شوکت پردیسی کو جو وصف حاصل ہے وہ ہر کسی قلم کے نصیب میں کہاں۔انھیں بچوں کی فطری دلچسپیوں کا صحیح اندازہ ہے جس کی بناپر انھوں نے بچوں کے لیے بہت خوبصورت اور عمدہ نظمیں تخلیق کی ہیں۔چند ایک مقبول نظموں میں ''جاگو اور جگاؤ''، ''وہ بچپن کہاں ہے؟''، ''روبی''، ''محنت''، ''ایک سوال''، ''بڑھاپے کا بچپن''، ''دولت اور علم کی تکرار''، ''مرغی''، ''مزدور''، ''15/اگست''، ''جشن بہار''، ''امتحان سے پہلے''، ''کامیابی کی آرزو''، ''سچ کی عزت''، ''بھائی چارہ''، ''میں پاس ہوگیا ہوں''، ''خدا کی دین''، ''ہم بچے ہم شہزادے'' وغیرہ اعلیٰ پایہ کی نظمیں ہیں۔

ان نظموں میں بچوں کے شعور اور اخلاق کی بیداری، عقل وفہم، دانشگی، بھائی چارگی، قومی یکجہتی، حب الوطنی، امن وآشتی، پیغامِ الٰہی، پیار ومحبت، انسانی ترقی، خودداری و ہمدردی، قوم کی خوشحالی، علم کی لگن، بزرگوں کی عزت، وغیرہ کو بہت خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔بچوں کی سطح پر اس نوعیت کے پیغامات ان کی دماغی نشوونما اور بالیدگی میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔''تحفۂ اطفال'' میں اس قسم کی نظمیں بھی ہیں جس سے کھیل کھیل میں ہی بچوں کی ذہن سازی کرنے میں مصنف کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بچوں کے نصاب کے لیے اس کتاب سے نظموں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔نظم ''آزادی کا ترانہ'' سے ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

ہم ارضِ وطن کے رکھوالے
ہم گنگ و جمن کے رکھوالے
ہم سارے چمن کے رکھوالے
ہر ایک جگہ آباد ہیں ہم
آزاد ہیں ہم آزاد ہیں ہم

نظم ''جاگو اور جگاؤ!'' سے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

دنیا میں یہ جنگ بڑی ہے
نفرت کی دیوار کھڑی ہے
کیسی مصیبت آن پڑی ہے
کتنی یہ دُشوار گھڑی ہے
دنیا کو سمجھاؤ بچو!
جاگو اور جگاؤ بچو!
جنگ نہیں ہتھیاروں کی یہ
جنگ نہیں سرداروں کی یہ
جنگ نہیں ہُشیاروں کی یہ
جنگ ہے حرص کے ماروں کی یہ
دل میں پیار بڑھاؤ بچو!
جاگو اور جگاؤ بچو!

شوکت پردیسی نے بچوں کی تعمیر و تربیت اور اصلاح کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ چونکہ انھیں نہ صرف اپنا بچپن یاد ہے بلکہ انھوں نے پوتے اور پوتیوں کا بچپن بھی دیکھا ہے۔ جن کی تربیت میں اس کتاب کی متعدد نظمیں پیش کی جا سکتی ہے جیسے روبی، رونی، روبی ہماری، سمیعہ وغیرہ۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''بچوں کے لئے انھوں نے جو نظمیں لکھیں ان میں اکثر میں مَیں نے یہ خوبی دیکھی کہ وہ بچوں سے بچوں کی سطح پر معاملہ کرتے ہیں، ان کے بزرگ بن کر نہیں، بلکہ ساتھی اور ہمجولی بن کر۔ یہ صفت اردو کے کم شعراء کو نصیب ہوئی ہے جنھوں نے کہ بچوں کے لئے نظمیں لکھی ہیں۔''

شوکت پردیسی کی کتاب ''مضرابِ سخن'' میں نظموں کی مجموعی تعداد 108، گیتوں کی تعداد 14 اور تہنیتی نغمات کی 13 اور متفرقات کی تعداد 4 ہے۔ جس نے ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کی ہے۔

''سازِ نغمہ بار'' شوکت پردیسی کی غزلیات، قطعات اور رباعیات کا مجموعہ ہے۔ ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں، قطعات ہوں یا رباعیات وغیرہ سب میں بے شمار موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ہر سطح اور ہر فکر کا موضوع ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں انسانی شعور کی بالادستی اور عظمتِ رفتہ کی بحالی، مقصدِ حیات اور حوصلوں کی بازیابی، افکار کو تابانی اور مٹتی امنگوں کی شادمانی، وفا کی جاودانی اور سکونِ قلب کی فراوانی، حسرتِ زیست کو شادابی اور اور عزم و استقلال کی اُٹھان وغیرہ کو پُر پیچ اور دشوار گزار راستوں سے نکال کر منزلِ حیات سے سرفراز کیا ہے۔ ''مضرابِ سخن'' کی نظموں میں نوحۂ غم بھی عیاں ہے اور شادو مسرت کی لذت بھی، زندگی کی حقیقت بھی پوشیدہ ہے، اس میں تلخیاں بھی ہیں اور لذت و کشا بھی ہے۔ مجموعے میں شامل نظموں میں ''بندگی''، ''شمعِ وفا''، ''آمدِ محبوب''، ''تخیلات''، ''تکمیل وفا''، ''احساسِ جدائی''، ''گردشِ حالات''، ''دعوتِ شوق''، ''متاعِ جوانی''، ''غریب الوطن کی عید''، ''بلاوا''، ''کالی صورت''، ''رازِ حیات''، ''نئی روشنی''، ''شورشِ غم''، ''نشاطِ نو''، ''یادِ شباب'' وغیرہ بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ گیتوں اور نغموں میں بھی فن کاری کا رنگ خوب جھلکتا ہے۔ ان کی شاعری میں رومانیت کا جلال اور خوبصورتی کا جمال عروج پر نظر آتا ہے۔ جو مدھم مدھم قاری کے ہوش و حواس اور تاب و تواں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ داخلیت اور خارجیت کے امتزاج کا سنگم ان کی شاعری کے بنیادی نکتے سے روشناس کراتا ہے۔ سید راشد حامدی ان کے حوالے سے بجا فرماتے ہیں:

''ان کے شعری تلازمے داخل سے خارج کی طرف سفر کرتے ہوئے داخلی اور خارجی عوامل اور شعور و لاشعور کے تعامل سے ایک بنیادی مرکزی نکتے کی طرف واضح رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں رومانیت سے بھرپور علامات، رومانی جذبات اور رومانی تشبیہات و استعارات کسی دیگر معنوی تجربے پر منتج ہوتے ہیں اور یہی وہ فن ہے جو قاری کو اول تا آخر اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔''

''سازِ نغمہ بار'' کو بھی شوکتؔ پردیسی کی اہم کتاب تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں 107 غزلیں، 87 رباعیاں اور 39 قطعات شامل ہیں۔ پرفیسر عبدالحق، ڈاکٹر تابش مہدی، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ندیم احمد وغیرہ کے تحریری مضامین اس کتاب کی زینت بڑھاتے ہیں۔ جس طرح بچوں کی شاعری میں شوکتؔ پردیسی نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح ان کی نظموں میں بھی حسن کاری کے بیش قیمت جوہر ملتے ہیں۔ نظموں سے قطع نظر ان کی غزلیات، قطعات اور رباعیات بھی اردو شاعری میں بہترین اضافہ ہے۔ ان کی غزلوں میں رنجیدگی، افسردگی، بے چینی، بے قراری، بے اطمینانی، بے وفائی، تشنگی، درد و غم، اضمحلال، فکریہ عنصر، شکستگی، گمشدگی، غریبی اور مصیبت زدگی وغیرہ کا احساس جابجا نظر آتا ہے جس کی عکاسی انھوں نے نڈر اور بے خوف وخطر کی ہے۔ غزلوں کے در پردہ شاعر کے پورے احوال روشن ہوتے ہیں۔ شوکتؔ پردیسی نے اپنے منفرد رنگ و آہنگ سے شاعری میں نشاطیہ عنصر پیدا کیا ہے۔ شمیم طارق ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شوکتؔ پردیسی کی غزلوں کے مطالعے سے زندگی کی توانائی اور ہر دور کے انسان کی اس سے بھرپور ہم رشتگی کا احساس ہوتا ہے۔ زندگی، مصنوعی اور کربناک ہونے کے باوجود کس درجہ دلکش ہے اور انسان کتنی جلدی روتا، گھبراتا یا ہنستا بہلتا ہے، اس کا احساس ان شعروں میں دلایا گیا ہے:

رات اک نادار کا گھر جل گیا تھا اور بس
لوگ تو بے وجہ سناٹے سے گھبرانے لگے

آخرش انسان تھا، مجبور ہو کر ہنس پڑا
اپنے اپنے طور پر جب لوگ سمجھانے لگے
جبہ و دستار سے شوکتؔ غلط فہمی ہوئی
ورنہ ان کے گھر کے سب کمرے صنم خانے لگے

ساتھ ہی چٹکی بھی لی گئی ہے کہ قول وفعل کے تضاد یا بت پرستی کی مذمت اور خود اپنے اندر ایک بت (شخصیت) کی پرستش کر کے انسان اس کی توانائی کو ضائع کرتا ہے۔''

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، شوکتؔ پردیسی کی شاعری کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''شوکت پردیسی کے ہاں محبت کی یاسیت، محرومیوں کا ماتم، محبوب کی سنگ دلی کا اظہار کسی حد تک ضرور ہے لیکن اپنی سیہ بختی کا گلہ نہیں ہے، نہ نعرۂ جنگ ہے اور نہ ہی بانگِ حرم ہے۔ بلکہ ان کے ہاں محسوسات اور ان کے تاثرات ہیں:

عالمِ غربت میں بھی خندہ لبی کو دیکھ کر
تم کو شوکت پیکر وصبر ورضا کہنا پڑا
دشمنی کی بھی قدر کرتا ہوں
آڑے وقتوں میں کام آئی

شوکت پردیسی کی رباعیات اور قطعات بھی ان کی شخصیت کی عکاس ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری قارئین کو ہر لحاظ سے لبھاتی ہے۔ انھوں نے چھوٹی بڑی دونوں بحروں میں شاعری کی ہے لیکن فن پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ بلکہ شگفتگی اور بے ساختگی سے ان کے اشعار میں روانی پیدا ہوتی ہے۔ انھیں الفاظ کا انتخاب، استعارات، تشبیہات اور ترکیبات میں فن کارانہ استعمال، زبان میں سلاست اور فصاحت اور زود گوئی غیر معمولی دسترس ہے۔ شوکتؔ پردیسی کی جملہ شاعری ایک بیش بہا قیمتی ادبی سرمایہ ہے۔

☆☆☆

# زبیر رضوی کی ادبی خدمات

اردو زبان و ادب کے فروغ میں شاعروں، ادیبوں ،افسانہ نگاروں ،ناقدوں، سوانح نگاروں، سفرنامہ نگاروں، ڈرامہ نگاروں اور صحافیوں وغیرہ نے ہمیشہ سے ایک اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف شعرا و ادبا حضرات کی آمد نے اردو زبان و ادب کو مالا مال کیا ہے ۔ میرؔ، دردؔ، سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ، اصغرؔ، جگرؔ، حالیؔ، اقبالؔ، مجازؔ وغیرہ کے کلام کو آج بھی اسی ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے جس طرح ان کے زمانے میں پڑھا جاتا تھا۔ اگر یوں کہیں کہ آج کے ہر قاری پر چاہے وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر چہ مذکورہ شعرا کے کلام کا خمار چڑھا ہوا ہے تاہم بیسویں صدی میں بھی ایسے مایہ ناز شاعر اور ادیب جنمے ہیں جو ادب کی دنیا میں آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ زبیرؔ رضوی جنگ آزادی کے فوراً بعد شاعری کے اُفق پر چمکنے والے ایسے تابندہ و پائندہ ستارے ہیں جو ایسے طلوع ہوئے کہ ادب کی دنیا میں روشنی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ زبیر رضوی بیک وقت شاعر، ادیب، نقاد، مترجم، مبصر، مرتب، مکتوب نگار، سوانح نگار، صحافی اور دانشور کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ غرض وہ ایک کثیر الجہات اور متنوع شخصیت کے مالک تھے۔

زبیرؔ رضوی 15 / اپریل 1935 میں امروہہ، یوپی کے ایک ممتاز علمی و ادبی اور دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مولانا سید احمد حسن محدث امروہوی ان کے دادا تھے۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی ۔ جب ان کے والد صاحب نے حیدرآباد ہجرت کی تو ان کے لڑکپن کا بقیہ حصہ حیدرآباد (دکن) میں بسر ہوا۔ اس طرح یہاں سے بھی ان کی ابتدائی تعلیم

ہوئی۔ آخر کار دلّی کی جانب رخ کیا اور تاحیات یہیں کے ہو لیے۔ مجتبیٰ حسین خاکہ ''زبیر رضوی: سریلا آدمی'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''زبیر کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ حیدر آباد والے انہیں حیدر آبادی سمجھتے ہیں اور دلّی والے انھیں دلّی کا۔ حالانکہ یہ نہ حیدر آبادی ہیں نہ دلّی کے، یہ ہیں تو امروہہ کے۔ یہ اور بات ہے کہ امروہہ والے اُن پر اپنا حق جتانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ زبیر کے مزاج میں وہ ''امروہہ پن'' نہیں ہے جیسے مصحفی کی ذات میں دیکھ کر مولانا محمد حسین آزاد کو شکایت ہوگئی تھی۔''
>
> (چہرہ در چہرہ، ص100)

دورانِ قیام حیدر آباد میں زبیر رضوی کے معتدد ہم عصر شاعروں اور ادیبوں سے دوستانہ تعلقات اور مراسم استوار ہو گئے تھے۔ جن میں مجتبیٰ حسین، مخدوم محی الدین، سلیمان ادیب، شاہد صدیقی، عزیز قیسی، حمایت علی شاعر، وحید اختر، شاذ تمکنت وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

زبیر رضوی 1952 میں دلّی آئے اور یہاں دلّی یونی ورسٹی سے بی۔ اے اور اور ایم۔ اے (اردو) کی تعلیم حاصل کی۔ آل انڈیا ریڈیو میں بطور ایک اسکرپٹ رائٹر اپنے براڈ کاسٹنگ کیریر کا آغاز کیا۔ وقفے وقفے سے UPSC سے اعلیٰ عہدوں پر منتخب ہوتے رہے۔ ریڈیو میں ایک مقبول براڈ کاسٹر کی امیج بناتے ہوئے ڈائریکٹر اسپورٹس کے منصب پر فائز ہوئے اور 1993 میں سبکدوش ہوئے۔ دو سال تک دلّی اردو اکادمی کے سکریٹری بھی رہے۔ زبیر رضوی نہ صرف رنگا رنگ تخلیقی ذہانتوں کے مالک تھے بلکہ وہ ایک خوبصورت اور خوب سیرت انسان بھی تھے۔ معجز بیانی، خوش الحانی، خوش طبعی اور خوش خلقی ان کی شخصیت کے اہم اوصاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت کے دوران انھوں نے کئی غیر معمولی شخصیات کے انٹرویو لیے، جن میں قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، امرتا پریتم، زہرہ سہگل، حبیب تنویر، دلیپ کمار، لتا منگیشکر، مہدی حسن، استاد بسم اللہ خاں، اوما شرما، آر۔ کے۔ شرما اور رگھورائے وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عالمی سطح کی شہرت یافتہ اور معتبر شخصیات ان

کو اپنا انٹرویو دے کر فخر محسوس کرتی تھیں۔ زبیر رضوی نے بعد میں یہ سبھی انٹرویوز اپنے بین الاقوامی رسالہ "ذہن جدید" میں ترتیب وار شائع کیے۔ جن کو انھوں نے ادب، تھیٹر، فلم، مصوری، سنگیت، رقص، کارٹون اور فوٹو گرافی جیسے زمروں میں رکھ کر شائع کیا۔ موصوف نے "ذہنِ جدید" نکال کر ادبی صحافت میں اپنے دیرپا نقوش مرتسم کیے۔

زبیر رضوی کو شعر و شاعری کے ساتھ بچپن ہی سے شغف تھا۔ ان کی پہلی غزل صرف آٹھ سال کی عمر میں پاکستان کے رسالہ "ماہِ نو" کراچی میں شائع ہوئی۔ موصوف کے اب تک نو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "لہر لہر ندیاں گہری"، "خشتِ دیوار"، "پرانی بات ہے"، "دھوپ کا سائباں"، "دامن"، "مسافتِ شب"، "انگلیاں فگار اپنی"، "سبزۂ ساحل" اور "سنگِ صدا" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ "پورے قد کا آئینہ" (کلیات) شائع ہوا ہے جو ان کے ابتدائی سات شعری مجموعوں پر مشتمل ہے۔ زبیر رضوی کے یہ تمام شعری مجموعے ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان مجموعوں میں ان کی نظمیں، غزلیں، گیت، حمد اور دوہے وغیرہ شامل ہیں۔ جب موصوف حیدرآباد میں قیام پذیر تھے اُس وقت تلنگانہ تحریک زوروں پر تھی۔ ترقی پسند تحریک کا بہت چرچا تھا۔ ترقی پسند ادب کی تشہیر کرنے والے وہاں کے ایک موقر اخبار "پیام" میں ان کا پہلا مضمون شائع ہوا تھا اور جب وہ دلّی آگئے تو سجاد ظہیر عرف بنے بھائی نے ان کے جوش و خروش کو دیکھ کر انھیں انجمن ترقی پسند مصنفین دلّی کی شاخ کا سکریٹری نامزد کیا۔ کہنے کا مقصد یہ کہ موصوف ترقی پسند ادب کے حامی تھے اور اس ادب کی تشہیر کرنا ان کے رگ و ریشے میں سمایا ہوا تھا۔ یہ محرک ان کی شاعری کا خمیر بھی ہے اور اس کے علاوہ ان کی زندگی کا سرمایہ حیات بھی۔

زبیر رضوی نے بطور شاعر اپنی ایک منفرد پہچان قائم کی۔ ان کی شاعری کا دائرہ تقریباً ساٹھ برسوں پر محیط ہے۔ ان کے ابتدائی شعری مجموعے پر نظر ڈالیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ زبیر رضوی کی شاعری میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے تمام عناصر موجود ہیں۔ زبیر رضوی "لہر لہر ندیاں گہری" کے دیباچے میں اپنی شاعری کے امتیازات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میری شاعری کا بیشتر حصہ میرے جوان جذبات اور احساسات کی دین ہے۔خالص جذبات اور احساسات کے سہارے کی جانے والی شاعری اپنی دوامیت اور بقا کے امکانات کو کم کر دیتی ہے لیکن اگر محسوساتی اور جذباتی شاعری میں فنکارانہ خلوص، بصیرت اور فکر شامل ہو تو یہی شاعری دل و دماغ پر پر گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔شاعری حسی چیز ہے۔حسیت ،حقیقت، حسن اور خیر کے مفہوم کو نکھارتی ہے اس لحاظ سے میری شاعری کو ''حسیاتی جدلیت'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔''

(لہر لہر ندیا گہری از زبیر رضوی، ص11)

متذکرہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زبیر رضوی نے حسیاتی شاعری کی ہے۔اس کے علاوہ آگہی اور شعور کا عکس اُن کی شاعری میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ ہو:

وہی میں ہوں میری تنہائیاں اور شب کا سناٹا
زندگی کو گود میں سوئے ہوئے ہیں دن کے ہنگامے

پڑے ہیں بند سارے مندر و مسجد کے دروازے
پرندے نیند میں کھوئے ہوئے پیڑوں پہ بیٹھے ہیں

اپنے گھر کے درودیوار کو اونچا نہ کرو
اتنا گہرا میری آواز سے پردہ نہ کرو

پتھر کی قبا پہنے ملا جو بھی ملا ہے
ہر شخص یہاں سوچ کے صحرا میں کھڑا ہے

کبھی ہوا کبھی موسم کی برہمی اچھی
کبھی شناسا رفیقوں سے بے رخی اچھی

زندگی ایسے گھروں سے تو کھنڈر اچھے تھے
جن کی دیوار ہی اچھی تھی نہ در اچھے تھے

مندرجہ بالا اشعار زبیر رضوی کے مختلف شعری مجموعوں سے لیے گئے ہیں جو کہ احساسِ فکر کو تازہ کرتے ہیں۔ شاعر کی دور اندیشی بھی ان اشعار سے واضح ہو جاتی ہے۔ زبیر رضوی کی شاعری کا بنیادی لب و لہجہ عشقیہ ہے اور ان احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے یہاں کئی اشعار ملتے ہیں۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے بقول:

"جو چیز زبیر رضوی کی عشقیہ شاعری کو ہمارے لئے قابلِ قبول بناتی ہے وہ ان کے لب و لہجے کا خلوص و انفرادیت اور ان کے مزاج عشق کی جدیدیت ہے۔"

(متاعِ سخن از ڈاکٹر اسلم پرویز، ص 12)

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب بجا فرماتے ہیں کہ موصوف کا لب و لہجہ عشقیہ ہے اور ان کے عشق و عاشقی کے حوالے سے بعض اشعار کہیں فیضؔ، کہیں فراقؔ اور کہیں کہیں اختر الایمان کی شاعری سے مماثلت اور میل کھاتے ہیں۔ غزلوں کے چند زشعار ملاحظہ ہوں:

شبنم سے پتیوں کے کٹورے بھرے ہوئے
آئے ہو تم تو دامنِ دل ہیں جلے ہوئے

دل کے تار تار میں یادوں کے اب آہو بھی نہیں
آئینہ مانگیں جو ہم سے وہ پری رو بھی نہیں

ہم بچھڑ کے تم سے بادل کی طرح روتے رہے
تھک گئے تو خواب کی دہلیز پر سوتے رہے

ٹوٹے ہوئے رشتوں کا ہر زخم ہَرا لکھنا
جب بھی اُسے خط لکھنا آداب بِرا لکھنا

نظم نگاری زبیر رضوی کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے سبھی شعری مجموعوں میں نظموں کی خاصی تعداد ہے اور جدید نظم نگاری میں زبیر رضوی کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جاتا ہے۔ زبیر رضوی کی چند مشہور نظموں میں ''بیکراں''، ''نقش فریادی''، ''تبدیلی''، ''واپسی''، ''اجنبی''، ''شریف زادہ''، ''علی بن متقی رویا''، ''بشارت پانی کی''، ''امیر شہر کی نیکی''، ''پرندے لوٹ آئے''، ''ردِ عمل''، ''موسم کی واپسی'' اور ''صادقہ'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ''دھوپ کا سائباں'' ان کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے۔ یوں تو زبیر رضوی کی ہر نظم اپنی جگہ اہم ہے لیکن اردو کے سنجیدہ قارئین کو جس نظم نے بے حد متاثر کیا ہے وہ ہے ''علی بن متقی رویا''۔ یہ علی بن متقی رویا کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ اور کیوں زبیر رضوی نے اس کردار کو اپنی نظموں کا محور بنایا؟ یہ سوالات ہر قاری کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سچ تو یہ ہے زبیر رضوی نے اپنے زمانے تک کسی کو بھی علی بن متقی کی ہوا بھی لگنے نہیں دی جب کہ علی بن متقی کا سایہ زبیر کی اپنی شخصیت سے کئی لمبا ہے۔ علی بن متقی نے جتنی جگہوں کی خاک چھانی ہے زبیر کی عمر شاید اس کا حساب نہیں کر سکتی۔''
>
> (ہم سفروں کے درمیان از شمیم حنفی، ص 177)

زبیر رضوی کی نظموں کے مجموعے ''سبزۂ ساحل'' میں اردو کی ایک اہم نظم ''صادقہ'' ہے۔ اردو میں طویل نظمیں کم کم ہی ملتی ہیں۔ لیکن بعض نظموں نے ادب کے ناقدین کو چونکا دیا ہے۔ 19 صفحات اور سترہ کینٹوز پر محیط اس نظم میں زبیر رضوی نے شر اور خیر، ظلم اور عدل، زیاں اور سود کے مابین صدیوں سے جاری جنگ کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل صادقہ شاعر کی ہم راز، تنہائیوں کی ساتھی، ایک خیالی پیکر ہے جس کے ساتھ زبیر سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ دیگر نظموں میں بھی بیکراں معنی پوشیدہ ہیں۔ زبیر کی بعض نظمیں مکالماتی انداز میں ہیں جن میں گفتگو کی تکنیک ہے۔ زبیر کا فن نظم نگاری میں خوب جھلکتا ہے۔ بیسویں صدی کی نظم اور غزل کی ہر قابلِ ذکر کتاب میں زبیر رضوی کا کلام شامل ہے۔

زبیر رضوی کی غزلوں میں ایک نوع کی تحیر خیزی نظر آتی ہے۔ بالکل سامنے کی باتوں کو غزل کا موضوع بنانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جدید شعرا میں یہ وصف محمد علوی کا اختصاص ہے۔ تاہم علوی کے شاعری میں موضوع کو برتتے ہوئے ایک طرح کی بزلہ سنجی نظر آتی ہے۔ جب کہ زبیر کے یہاں بزلہ سنجی کے بجائے باوقار سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں جدید طرز فکر و احساس، گہرا سماجی شعور، اور اچھوتا اندازِ بیان ملتا ہے۔ اس صنفِ سخن میں بھی نظم نگاری کی طرح روشنی ماضی سے ہی لی گئی ہے۔ لیکن اس میں اضافہ اپنے خونِ جگر سے کیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق کے روایتی مضامین بالکل نہیں ہے۔ صرف وہ ہیں جو انھوں نے براہِ راست زندگی سے حاصل کیے ہیں۔

نظموں اور غزلوں کے علاوہ زبیر رضوی نے گیتوں میں بھی اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ بلا شبہ زبیر کا مزاج گیتوں کی طرف مائل تھا۔ ان کے گیت ان کے فن کے شہکار ہیں۔ جس میٹھی اور رسیلی زبان میں زبیر نے گیت لکھے ہیں اردو میں اس کی مثال مشکل سے ہی ملتی ہے۔ ان کے ایک گیت ''یہ ہے میرا ہندوستان'' کو اتنی شہرت حاصل ہوئی، کہ زبیر صرف اس واحد گیت سے بھی زندہ جاوید رہیں گے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی زبیر رضوی کی گیتوں کے متعلق اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

> ''زبیر کے گیت خاص طور پر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ان گیتوں میں اس فضا اور لہجے کا خاص خیال رکھا گیا ہے جس کے بغیر گیت اپنی سرحد سے نکل کر نظم یا نظم نما گیت بن جاتا ہے۔ ان گیتوں میں خالص عشقیہ اور جمالیاتی تجربوں کا اظہار بھی ہے اور قومی اور تہذیبی مسائل کا عکس بھی۔ زبیر کے ان گیتوں میں ہندوستانی عورت کی وہ تصویر بھی ابھرتی ہے جو دراصل اس نوع کی شاعری کی محرک ہوتی ہے۔''
>
> (متاعِ سخن، مرتب از ڈاکٹر اسلم پرویز، ص 17)

زبیر رضوی کا شعری اسلوب دیگر ہم عصروں کے بہ نسبت یکسر منفرد ہے۔ انھوں نے نہ ماضی کو فراموش کیا اور نہ حال سے بغاوت کی، بلکہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا

کی ہے۔اس کے علاوہ ماضی اور حال دونوں کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔انھوں نے متقدمین کے سرمایہ اور اثاثہ کو کم تر نہیں جانا بلکہ ان کے فن کے رنگین اسلوب سے اپنے تخلیق کو مزین کیا ہے اور حقیقتاً اصل فن کار کی حقیقی فن کی صحیح پہچان اسی خوبی کا آئینہ ہوتی ہے۔زبیر رضوی کو مشاعروں کے سبب بے انتہا شہرت حاصل ہوئی۔شاید ہی اتنی شہرت کسی اور شاعر کے حصے میں آئی ہو۔

زبیر رضوی نہ صرف معروف شاعر بلکہ شگفتہ و شیریں بیاں بھی ہیں۔جس کا ثبوت ان کی تحریر کردہ کئی تنقیدی کتابیں ہیں۔جس میں ''اردو فنون اور ادب''، ''غالب اور فنونِ لطیفہ'' اور ''گردشِ پا'' قابلِ ذکر ہیں۔اول الذکر کتاب میں کل 24 مضامین ہیں جس میں اردو اور مختلف فنون نیز عہد حاضر کے نامور شعرا کی شعری خصوصیات سے متعلق مضامین قلم بند کیے گئے ہیں۔دوسری نثری کتاب غالب اور فنونِ لطیفہ میں دیباچہ اور 7 مضامین تحریر کیے ہیں جو غالب رنگ اور کینوس، غالب اور رنگ منچ، غالب اور رقص، غالب اور سنگیت وغیرہ جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں۔مذکورہ دونوں کتابوں کے مضامین موضوعات کے لحاظ سے بالکل منفرد اور بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔آخر الذکر کتاب ''گردشِ پا'' سوانحی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔بلاشبہ ''گردشِ پا'' زبیر رضوی کی دلآویز نثر کا مثالی نمونہ ہے۔گردشِ پا فارم کے اعتبار سے نہ سوانح حیات ہے اور نہ سوانحی ناول۔زبیر رضوی نے اس میں جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں جستہ جستہ اور متفرق واقعات اس طرح پروئے گئے ہیں کہ سوانحی تخلیق واقعاتی طور پر تسلسل میں نہ ہوتے ہوئے بھی نہ صرف قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتی ہے اور قرأت خیزی قائم رکھتی ہے بلکہ آگے پڑھتے ہوئے تجسس کو قائم رکھتا ہے۔بے حد مقبول ہونے والی ''گردشِ پا'' پر اُن کے معاصرین کی توصیفی تحریروں کی اشاعت نے اسے ''یادوں کی برات'' کے بعد دوسری مقبول سوانح بنا دیا ہے۔

گردشِ پا رسالہ ''نیا ورق'' میں قسط وار شائع ہوا تھا۔اس کے علاوہ انھوں نے ''عصری عالمی ادب کے ستون''، ''ہندوستانی سینما کے سو برس''، ''ترقی پسند اور ان کے معاصر پینٹر'' جیسی نثری تالیفات ان کی تخلیقی صلاحیت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔زبیر رضوی کی مرتب

کردہ کتابوں کی مجموعی تعداد گیارہ ہے۔ جس میں ڈرامے اور تھیٹر پر مرتب کی گئی کتابوں کی تعداد چار، افسانے سے متعلق کتابوں کی تعداد پانچ، نظم کے حوالے سے ایک کتاب اور انٹرویوز یا گفتگو کے حوالے ایک کتاب ہے۔ زبیر رضوی نے مترجم کی حیثیت سے بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔ اور ''وادیٔ سندھ کی تہذیب'' اور ''قلی قطب شاہ'' ان کے تراجم کی فن کاری کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتا ہے۔ مذکورہ کتابوں پر اگر تفصیل سے بات کی جائے تو اس کے لیے سینکڑوں صفحات سیاہ ہو سکتے ہیں۔ زبیر رضوی نے نہ صرف مذکورہ کتابیں لکھی ہیں بلکہ ان کے بہت سارے فکر انگیز مضامین مختلف رسائل و جرائد میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں اردو، فارسی، ہندی، انگریزی وغیرہ زبانوں پر بھرپور دسترس حاصل تھی۔

زبیر رضوی کا ناقابلِ فراموش کارنامہ یہ بھی رہا کہ انھوں نے 1990 میں ''ذہنِ جدید'' کے نام سے ایسا سہ ماہی ادبی رسالہ جاری کیا جو اپنے موضوعات کے لحاظ سے اردو کے سبھی ادبی رسائل سے منفرد رسالہ ثابت ہوا۔ نظم، غزل، افسانہ، ناول، ڈرامہ، تھیٹر، مصوری، سنگیت، عالمی ادب، کارٹون، رقص، فلم، خطوط، فوٹوگرافی وغیرہ موضوعات پر ''ذہنِ جدید'' میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ زبیر رضوی کی ادارت میں 26 برسوں تک اس رسالے نے اردو زبان وادب کی تشہیر و تبلیغ کا اہم فریضہ انجام دیا۔ ''ذہنِ جدید'' کے کل 71 شمارے شائع ہوئے۔ ''ذہنِ جدید'' کا جب اولین شمارہ شائع ہوا۔ تب اس کے سرورق کے پر ''مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب کی یاد میں'' اور ''ادب، آرٹ اور کلچر کا ترجمان'' جیسی تحریر مرقوم تھی اور یہ سلسلہ رسالے کے آخر تک برقرار رکھا گیا۔ ''ذہنِ جدید'' بین الاقوامی سطح کی ادبی نہج پر ابتدا ہی سے اپنی شناخت قائم کر چکا تھا۔ ''ذہنِ جدید'' میں ابتدا ہی سے خصوصی شمارے اور گوشے شائع کیے گئے جس میں خواتین نمبر، منٹو نمبر، اختر الایمان نمبر، گوشۂ ممتاز مفتی، گوشۂ ن۔ م۔ راشد، گوشۂ گجرات، گوشۂ پریم چند، گوشۂ علی سردار جعفری، گوشۂ مجروح سلطانپوری، گوشۂ غالب اور گوشۂ فنونِ لطیفہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ زبیر رضوی نے ادب کی وسعت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رسالے کو کسی ایک موضوع تک محدود نہیں رکھا بلکہ ہر قسم کے موضوعات کو رسالے میں جگہ دی۔ یہ ان کی وسیع النظری اور کشادہ ذہنی کا ہی نتیجہ تھا۔ ''ذہنِ جدید'' نے ادبی صحافت کی

ایک بنیاد رکھی، اپنے قاری کی تلاش کی اور اسے اپنا گرویدہ بنا ڈالا۔ ہندوستان کی تین قومی یونی ورسٹیوں نے ''ذہن جدید'' پر ایم۔فل کی ڈگریاں تفویض کی ہیں۔

زبیر رضوی نے 'ذہنِ جدید'' کو اکیسویں صدی کا ایک غیر معمولی رسالہ بناتے ہوئے فنون کی عصری سرگرمیوں اور منظر ناموں پر خود ہی مضمون لکھے جو ہر شمارے میں کبھی کبھی سو صفحات سے بھی زیادہ ہوتے۔ انھوں نے ہر ادبی امور پر خصوصاً اردو سے متعلق مسائل پر بے باک اور مخلص ہو کر لکھا۔ زبیر رضوی نے ہمیشہ نقاد کے بجائے تخلیق اور تخلیق کار کو ترجیح دی اور ان کی نئی کتابوں کی ''ذہنِ جدید'' میں باوقار انداز میں تشہیر کی۔ ہمدرد کی کلرکی سے ریڈیو اور ٹی۔وی کے اسٹیشن ڈائریکٹر و اسپورٹس ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچنے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی دنیا میں بہت کچھ کر گزرنے کے عزم کے ساتھ اپنا شعری و ادبی سفر بھی جاری رکھا۔ اس سے زبیؔر کی ہمہ جہت خوابیدہ صلاحیتوں کو جلا ملی۔ انھوں نے دیگر تخلیق کاروں کی طرح صرف شاعری اور تنقید کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا بلکہ زبیؔر جدید پینٹنگ کی نمائشوں اور پریس کلب کے تہذیبی اور ثقافتی پروگراموں اور مباحثوں میں اکثر شرکت کرتے رہے ہیں۔ زبیر رضوی نے اپنی شاعری بالخصوص نظمیہ شاعری اور ''ذہنِ جدید'' کے ذریعے اردو زبان و ادب کو بہت کچھ عطا کیا ہے۔ بیسویں صدی کا شاید ہی کوئی اہم شاعر یا ادیب ہو جس نے زبیر رضوی کو موضوعِ بحث نہ بنایا ہو۔ ان پر قلم اٹھانا ادیب اپنا اعزاز سمجھتے ہیں۔ مصنوعی نام و نمود کے وہ دلدادہ نہ تھے بلکہ اردو کے ایک ہمہ وقتی سپہ سالار کی طرح وہ ادبی محاذ پر ڈٹے رہے۔

الغرض جدید شعرا کے جھرمٹ کا ایک روشن ترین ستارہ، ڈرامہ کا ایک مستند نقاد اور محقق، اردو کی ادبی صحافت کا رجحان ساز مدیر، فائن آرٹس کا مبصر، اسپورٹس کو میٹر یٹر وغیرہ جیسی متنوع شخصیت کے مالک زبیر رضوی 20 رفروری 2016 میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ دہلی اردو اکادمی میں دیے گئے ان کے خطبے کے آخری الفاظ یوں تھے ''میں سسکیاں لے کر رونے کا قائل نہیں ہوں، درد کے حد سے گزرنے پر بھی بس آنکھوں کو نم کر لیتا ہوں''

عارفؔ حسن خاں نے ان کا قطعۂ تاریخ وفات لکھا ہے:

یہ ماہ فروری اس بار کیسا آیا ہے
کہ ہم کو چھوڑ چلے جس میں انتظار و ندا
انھیں کی راہ چلے لو زبیر رضوی بھی
ابھی تو اُن کی جدائی کا زخم بھی ہے ہرا
اداس ہو کے یہ عارف نے پھر کہی تاریخ
زبیر رہبرِ ذہنِ جدید آج گیا
(1437ھ)

(رسالہ صدف، جلد:2/شمارہ:1/مارچ 2016، ص19)

ان کی تخلیقات کو ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے اسکولی نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ کئی اردو اکادمیوں نے انھیں اعزازات وانعامات سے بھی سرفراز کیا ہے۔
ان کے ہم عصر شعرا وادبا میں وحید اختر، حرمت الاکرام، غلام ربانی تاباں، ربانی، علی سردار جعفری، اختر الایمان، شمس الرحمٰن فاروقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، محمد علوی، انتظار حسین، سریندر پرکاش، بلراج کومل، جگن ناتھ آزاد، زیب غوری، مظفر حنفی وغیرہ شامل ہیں۔

# زبیر رضوی کی شعری اور نثری کتابیں

## شعری مجموعے

| | | |
|---|---|---|
| 1 | لہر لہر ندیاں گہری | ستمبر 1964 |
| 2 | خشتِ دیوار | 1970 |
| 3 | مسافتِ شب | 1977 |
| 4 | پرانی بات ہے | دسمبر 1980 |
| 5 | دامن | 1984 |
| 6 | دھوپ کا سائباں | مارچ 1992 |
| 7 | انگلیاں فگار اپنی | 1999 |
| 8 | پورے قد کا آئینہ (کلیات) | 2004 |
| 9 | سبزۂ ساحل | 2008 |
| 10 | سنگِ صدا | 2014 |

## نثری کتابیں (تالیفات)

| | | |
|---|---|---|
| 11 | گردشِ پا (سوانحی یادداشتیں) | 2000 |
| 12 | اردو اور فنونِ ادب (تنقید) | 2004 |
| 13 | غالب اور فنونِ لطیفہ (تنقید) | 2004 |

| | | |
|---|---|---|
| 14 | ہندوستانی سنیما: سو برسوں کا سفر | نومبر 2015 |
| 15 | عصری عالمی ادب کے ستون | 2016 |
| 16 | ترقی پسند اور اُن کے معاصر پینٹر | 2016 |

## مرتب کردہ کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| 17 | ایوانِ اردو کے منتخب افسانے | 1995 |
| 18 | بہترین کہانیاں | 1996 |
| 19 | دس افسانے | 2001 |
| 20 | فسادات کے افسانے: ہندی (انتخاب) | 2005 |
| 21 | نئی نظم: تجزیہ اور انتخاب | 2007 |
| 22 | تماشا میرے آگے: غالب پر ڈرامے | 2007 |
| 23 | اردو ڈرامے کا سفر آزادی کے بعد: ایک انتخاب | 2007 |
| 24 | آزادی کے بعد اردو اسٹیج ڈرامے (انتخاب) | 2008 |
| 25 | یک بابی اردو ڈرامے (انتخاب) | 2008 |
| 26 | کالی رات: فسادات کے افسانے (انتخاب) | 2008 |
| 27 | چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو (انٹرویوز) | 2015 |

## ترجمہ کردہ کتابیں

28 قلی قطب شاہ (مصنف: نیرندر لوتھر)

29 وادیٔ سندھ کی تہذیب (سرمار ٹیمولر)

☆☆☆

# نور شاہ: فکر اور فکشن: ایک تجزیاتی مطالعہ

اردو زبان و ادب کی خدمت پُر خلوص سوچ، نیک جذبے اور دل و جان کے ساتھ کرنا، اس کے فروغ اور اس کی ترقی کے لیے نہ صرف اپنا مال و متاع لٹانا بلکہ مسلسل تخلیقی و تنقیدی اور دیگر تحریری معاونت بھی فرمانا، ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ میرے مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض لوگ اردو زبان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری پانے کے باوجود بھی نامانوس نظر آتے ہیں۔ وہ دوسروں کو بھی اس غلط فہمی کا شکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس زبان کا مستقبل تاریک ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مختلف حربے آزما کر جیسے تیسے ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب تو ہوتے ہیں لیکن پڑھنے لکھنے سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس لیے دوسروں کی تخلیقی و تنقیدی صلاحیتوں سے بھی خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف پڑھنے لکھنے سے غافل ہوتے ہیں بلکہ ان کی سوچ اور ان کا شعور تک غفلت کا شکار نظر آتا ہے۔ ان لوگوں سے اردو زبان و ادب کے فروغ کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟۔ اس کی کئی وجوہات ہیں اگر وہ سب بیان کی جائیں تو مضمون بے جا طوالت اختیار کر سکتا ہے۔ آج کے بیشتر نوجوان تعلیم کو روزگار کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ تعلیم کے فوائد اور اس کے بنیادی مقاصد سے انجان بنے بیٹھے ہیں یا وہ سمجھنے سے ہی قاصر ہوتے ہیں۔ دراصل یہاں پر ان کی کم علمی اور تاریک ذہنیت کی دلالت ہوتی ہے۔ یہی حال اردو زبان سے وابستہ بیشتر تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ہے۔ جو روزگار کے تعلق سے مستقل طور پر اردو زبان کے ساتھ جڑ جاتے ہیں لیکن بعد میں اپنے فرائض کو فراموش کر دیتے ہیں۔

ان سے یہ توقعات بھی وابستہ تھیں کہ ان کے ذریعے اردو زبان وادب کی مختلف النوع قسم کی ادبی سرگرمیاں انجام پاتیں نیز وہ زیادہ سے زیادہ طلبا کو اس کی اہمیت سے روشناس کراتے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ نہ یہاں زبان وادب کے دعوے دار متحرک ہیں اور نہ ہی طالب علم اپنی علمی وادبی پیاس بجھانے کے لیے تیار ہیں۔

اس تکلیف دہ صورتِ حال کے حوالے سے جب کشمیر کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہاں پر بھی مایوسی ہی ہاتھ آتی ہے۔ ماہ نامہ ''اردو دنیا'' میں شائع ایک انٹرویو میں محمد اقبال لون کے سوال کا جواب دیتے ہوئے نور شاہ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں ''اردو کے تعلق سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ نئی نسل سے وابستہ لوگ اردو کو روزگار کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ضروری ہے لیکن نئی نسل کا غالب رجحان مادیت کی طرف ہی ہے، اس لیے اُن سے اردو زبان وادب کے فروغ کی امید رکھنا عبث ہے۔'' اس کے برعکس جموں وکشمیر میں اردو زبان کی خدمت ان لوگوں سے کسی حد تک تسلی بخش انجام پا رہی ہے جو اس زبان سے نہ صرف لکھنے کی حد تک جڑے ہیں بلکہ اردو زبان کی بقا کے تئیں مختلف قسم کی ادبی سرگرمیوں میں بھی کوشاں نظر آتے ہیں۔ ریاست کے ان ادب نواز لوگوں کی بہ نسبت اردو کی ترقی، تابناکی اور روشن مستقبل کی کافی حد تک ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اردو زبان کی بے انتہا خدمت کرنے والے جموں وکشمیر کے ان بقیدِ حیات فکشن نگاروں میں نور شاہ، وحشی سعید، غلام نبی شاہد، دیپک کنول، دیپک بدکی، ویریندر پٹواری، اشوک پٹواری، آنند لہر، بلراج بخشی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بعض لوگوں کی قابلیت انھیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسکرین تک لے گئی جہاں انھیں اپنی ادبی صلاحیت کو آزمانے کا موقع ملا۔ بہر حال مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر صورت میں ان کی متنوع ادبی جہات ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے لیے سودمند ثابت ہوئی۔ مذکورہ ادبا میں نور شاہ ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے جن کا ادبی گراف تقریباً پون صدی کو چھونے والا ہے۔ ان کے تعلق سے بنا کسی تامل کے کہہ سکتے ہیں کہ جب کبھی مستقبل میں ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کی تاریخ، ریاست کی فکشن کے حوالے سے تحقیق یا کوئی دستاویزی کتاب مرتب کی

جائے گی تو اس میں نور شاہ کو ہمیشہ اوّلیت حاصل رہے گی۔

نور شاہ کی ادبی خدمات کا اعتراف برصغیر کے ہر بڑے قلم کار نے کیا ہے۔ بعض لوگ ان کو اپنا استاد مانتے ہیں اور بعض ان کی ادبی تحریروں سے حظ اُٹھا کر اپنی علمی استعداد میں اضافہ کرتے ہیں۔ نور شاہ کے مداحوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان کی تخلیقات ملک و بیرون ملک کے مؤقر و مقتدر رسائل و جرائد میں متواتر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ملک کی کئی اہم دانش گاہوں میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ البتہ ان کی علمی و ادبی کاوشات کے اعتراف میں ابھی تک کسی تنقیدی و تحقیقی کتاب کی اشاعت عمل میں نہیں آئی تھی۔ جس کی بہت حد تک کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ مزید اس کو کسی المیہ سے کم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمیں احسان ماننا چاہیے نوجوان اسکالر محمد اقبال لون کا جنھوں نے اس کمی کو محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اس کے لیے وہ عملی طور پر میدان میں آئے۔ ریاست جموں و کشمیر کی معتبر و معتمد ہستی، ہمہ گیر شخصیت کے مالک، اردو کے بلند پایہ ادیب، بیک وقت کئی اصناف پر عبور رکھنے والے عصرِ حاضر کے مقبول و معروف قلم کار نور شاہ کے متعلق محمد اقبال لون کی مرتب کردہ کتاب ''نور شاہ: فکر اور فکشن'' اس سلسلے میں پہلا باضابطہ کارنامہ ہے۔ فی الحال جس کی معادلت کوئی کتاب یا تنقیدی و تحقیقی مقالہ نہیں کر سکتا۔ اس کتاب میں مرتب کی محنت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جنھوں نے نور شاہ جیسی قد آور شخصیت پر ذہن کو تیار کر کے انھیں اپنی کتاب کا موضوع بنایا۔

نور شاہ جو ادب کے کئی رنگوں سے مزین ہیں، ان کا ادبی سرمایہ کافی وسیع اور وقیع ہے، جو گونا گوں صفات کے حامل ہیں، جن کا ادبی گراف کئی عشروں پر ہے، جو زمانے کی کئی تحریکات و رجحانات اور تجربوں سے گزر چکے ہیں، جن کا ذہن مسلسل نمو پذیر رہا ہے، جو اگرچہ معمر اور جسمانی اعتبار سے کمزور ہو چکے ہیں مگر ذہن آج بھی تندرست و توانا ہے۔ جن کے قلم سے افسانے، ناول، ڈرامے، تذکرے، مکالمے، خاکے، مضامین اور بے شمار صحافتی تحریریں معرض وجود میں آئی ہیں۔ انھوں نے حال تک ہزاروں صفحات کو انھوں نے اپنی ذہانت اور عقل و شعور کی روشنائی سے مالا مال کر دیا ہے۔ غرض کہ ان سے کوئی موضوع اچھوتا نہیں رہا۔ نور شاہ زندگی کی اسّی بہاریں دیکھ چکے ہیں چنانچہ تاحال ادبی محفلوں میں سرگرم نظر

آتے ہیں۔نور شاہ کی ادبی زندگی پر یہ شعر صادق آتا ہے:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پر گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

محمد اقبال لون کی کتاب ''نور شاہ فکر اور فکشن'' نور شاہ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس میں نور شاہ کے فکر و فن کا مکمل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ فاضل مرتب نے نور شاہ سے متعلق ابتدا سے لے کر عہد حاضر تک لکھے گئے تمام تنقیدی مقالات اور ان کی چند اہم تحریروں کا انتخاب کر کے مختلف عنوانات کے تحت چار ابواب میں منقسم کر دیا ہے۔

اس کتاب کے مشمولات پر نظر ڈالنے اور متن کا جائزہ لینے کے بعد ایک گوشے کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ اگر اس کتاب میں نور شاہ کی شخصیت سے متعلق چند مضامین شامل ہوتے، جس کے لیے مزید محنت درکار تھی یا دوسری صورت میں ان کے معاصرین اور جاننے والوں سے لکھنے کی فرمائش کی جاتی، جن سے کتاب کی اہمیت و افادیت بڑھ جاتی۔ اس طرح کتاب کا نام ''نور شاہ: شخصیت، فکر اور فکشن'' یا ''نور شاہ: شخصیت اور فکر و فن'' بھی ہوسکتا تھا۔ ہر چند کہ کتاب کے پہلے باب میں نور شاہ کا سوانحی خاکہ اور ان کا انٹرویو شامل کیا گیا ہے۔ شخصی یا تاثراتی مضامین کا مقصد مصنف کی کتابیں گنوانا یا خدمات کا تذکرہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد شخصیت سے جڑی کئی معمولی و غیر معمولی باتوں سے آشنا ہو کر قاری کے سامنے اس کے نت نئے پہلوؤں کو لانا ہوتا ہے۔ بہر کیف کتاب کے حصّہ اوّل ''ترتیب'' کے عنوان سے مندرج ہے جس میں پانچ مختلف قسم کی تحریروں نے جگہ پائی ہے۔ اولاً ''پیش گفتار'' کے عنوان سے مرتب کا ابتدائیہ رقم شدہ ہے جو سات صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں مرتب نے اپنی تمام تر توجہ نور شاہ کے افسانوی فکر و فن پر مرکوز کی ہے۔ انھوں نے محض نور شاہ کے افسانوں میں برتے گئے موضوعات پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ نور شاہ کی افسانوی جہات کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے۔ موصوف نے نور شاہ کی فکری، فنی اور تخلیقی ہنر مندی کی چھوٹی بڑی ہر خصوصیت کو اجاگر کیا ہے اور اپنی بات کے جواز میں دلائل بھی دیے ہیں۔ حالانکہ نور شاہ

نے جس قدر بکثرت افسانے تخلیق کیے ہیں اسی قدر ڈرامے بھی وافر تعداد میں لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ نور شاہ پانچ ناولوں کے خالق بھی ہیں۔ باوجود اس کے مرتب نے قارئین کو نور شاہ کی محض ایک مخصوص جہت سے آشنا کرایا ہے۔ اگر مرتب نے ''پیش گفتار'' میں اختصار کے ساتھ ہی سہی لیکن نور شاہ کی طبع آزما ہر صنف کو چھوا ہوتا اور اپنی عمیق تنقیدی نگاہ سے ان پر روشنی ڈالی ہوتی تو ان کی بات مزید وزن دار ہو جاتی۔ اپنی بات رکھنے کے بعد مرتب نے نور شاہ کا سوانحی خاکہ ترتیب دیا ہے جس میں ان کا اصل نام، قلمی نام، سن پیدائش، تعلیم، شادی، شریک حیات کا نام، اولادیں، ملازمت، اردو کے علمی و ادبی اداروں سے وابستگی، صحافتی خدمات، انعام واکرمات، ادبی زندگی کا آغاز، افسانوی مجموعوں، ناول وناولٹوں، مرتب کردہ کتابوں، ریڈیائی ڈراموں، ٹی۔ وی۔ سیریلز، دیگر متفرق تحریروں اور کارکردگیوں کی تفصیل کے علاوہ ان پر لکھے گئے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالوں کا مفصل ذکر آیا ہے۔ تحقیقی مقالوں کے زمرے میں اگر ایم۔فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی مقالوں کی نشاندہی کی گئی ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔

مرتب نے نور شاہ کا 39 سوالات پر مشتمل ایک طویل انٹرویو لیا تھا جو ماہ نامہ ''اردو دنیا'' کے جون 2017 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ چونکہ محمد اقبال لون نور شاہ کی شخصیت، کارہائے نمایاں، فکروخیال سے پوری طرح آگاہ تھے اس لیے انٹرویو سے اس کا پورا احساس جھلکتا ہے کہ نور شاہ کا انٹرویو لینے میں انھیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس لیے چند اہم اور فکر انگیز سوالات اجاگر ہوئے ہیں۔ جن سے نور شاہ کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ ادبی زندگی، ان کے شوقیہ مشاغل، لکھنے کے محرکات، مختلف تحریکات و رجحانات سے وابستگی، افسانوی خصوصیات اور موضوعات، تکنیکات کو برتنے کا فنی سلیقہ، قاری کی اہمیت، کشمیر کا پہلا افسانہ نگار، افسانوں میں موجودہ حالات اور مسائل کی عکاسی، ریاست کی تحقیقی وتنقیدی صورتِ حال، کچھ اہم ناقدین و محققین، اردو کی موجودہ صورت حال، نئی نسل کی خصوصیات کے علاوہ ان کے نقطۂ ہائے نظر وغیرہ کی توضیح ہوتی ہے۔ سوالنامہ مرتب کرتے وقت اور انٹرویو لیتے وقت بھی مرتب کا دھیان نور شاہ کی ناول نگاری کی طرف نہیں گیا۔ اس طرح قارئین نور شاہ کی زبانی کشمیر میں ناول نگاری کی جانب رجحان اور اس کی صورت حال جاننے

سے قاصر رہے۔ نیز اگر جموں وکشمیر میں اردو رسائل وجرائد اور اردو زبان وادب کے فروغ میں اردو اخبارات کے کردار اور سمت ورفتار سے متعلق کم از کم ایک سوال اور پوچھ لیا جاتا تو سوالنامہ اور جاندار ہو جاتا۔ حصّہ اوّل میں علیم صبا نویدی کا ایک خوبصورت سانیٹ بعنوان ''نورانی عطا۔نورشاہ'' اور نورشاہ کا ایک مضمون ''میری پہلی تحریر'' کے عنوان سے بھی شامل ہے۔ علیم صبا نویدی کا سانیٹ ان کا موصوف کے تئیں بہترین خراج تحسین ہے۔ جب کہ نور شاہ نے اپنے مضمون میں ادبی زندگی کی پہلی تحریر اور اس سے جڑی حسین یاداشت کو افسانوی رنگ وآہنگ عطا کرکے شگفتہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

''نورشاہ: فکر اور فکشن'' کے دوسرے باب ''عکس در عکس'' میں 27 مضامین شامل ہیں۔ جس میں چند اہم مشاہیرِ قلم کے مضامین بھی نظر سے گزرتے ہیں۔ اس باب کے بعض قلم کاروں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ نہ صرف اچھے افسانہ نگار ہیں بلکہ تنقید میں بھی اچھی خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ بعض قلم کار ایسے ہیں جو شاعری، افسانہ اور تنقید وغیرہ اصناف پر اچھی نگاہ رکھتے ہیں۔ ان میں بیشتر مضمون نگار نورشاہ کے معاصرین میں شمار ہوتے ہیں۔ جن میں کچھ اہلِ قلم ان کے دوست ہیں اور جن کے پیش نظر کتاب میں مضامین بھی شامل ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس فہرست میں بعض مضمون نگار حضرات داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں۔ الغرض امید رکھ سکتے ہیں کہ آئندہ وقت ریاست جموں وکشمیر میں نورشاہ کی نورشناسی کا ہوگا۔ جس کی پیشن گوئی آج ہی سے کی جا سکتی ہے۔ ''عکس در عکس'' کا پہلا تحریر کردہ مضمون اردو کے اعلیٰ پایہ کے نقاد، شاعر، فکشن رائٹر، صحافی اور استاد پروفیسر حامدی کاشمیری کا بعنوان ''نورشاہ کا افسانوی انفراد'' پر مشتمل ہے۔ انھوں نے نورشاہ کے افسانوی مجموعے ''بے ثمر سچ'' کے حوالے سے مضمون میں گفتگو کی ہے۔ جس کو پڑھنے کے بعد موصوف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نورشاہ کا تخلیقی ذہن انفرادی اظہار کا متقاضی ہے۔ جموں وکشمیر میں ابتدا سے لے آج تک افسانہ نگاروں کے موضوعات اور تجربات کی کیا نوعیت رہی ہے۔ ان کے مضمون سے اس کی بات کی آگہی حاصل ہوتی ہے۔ نورشاہ نے روایتی انداز میں بھی افسانے لکھے ہیں لیکن جوں جوں قاری ان کے افسانوں کی قرأت کرتا جائے گا وہ خود

یہ خود محسوس کرے گا کہ نورشاہ نے صرف روایتی قسم کے افسانوی اظہار پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ موضوع کے تعلق سے بات کی جائے یا ہیئت اور تکنیک کی سطح پر اس کو پرکھا جائے وہ تجربہ کاری اور جدت پسندی کو بروئے کار لاتے ہیں۔ حامدی کاشمیری نے ''بے ثمر سچ'' کے ہر افسانے کی تہہ میں جا کر حتی الامکان وضاحت فرمائی ہے۔ ان کا مندرجہ ذیل اقتباس نورشاہ کی افسانوی کائنات اور فنی اختصاص کو نمایاں کرتا ہے۔ حامدی کاشمیری کے بقول:

> ''یہ معمولی بات نہیں کہ وہ اپنے افسانوں کو روایت کی زنجیروں میں جکڑ بند ہونے نہیں دیتے بلکہ افسانے کے پہلے ہی جملے سے بیان کنندہ زندہ اور متحرک ہو جاتا ہے اور چند ہی جملوں کے بعد اپنے لکھنے والے کی تحکیم اور منشا کو مسترد کر کے خود اپنا راستہ بناتا ہے اور جو افسانہ خلق ہوتا ہے وہ زبان کی شگفتگی، جملوں کی خود تراشیدگی، شعریت آمیزی، طنز اور تضاد سے جمالیاتی تجربے میں ڈھل جاتا ہے۔ اس تجربے میں متکلم یا راوی افسانے کی رگ و پے میں لہو کی طرح رواں ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتا ہے۔''
>
> (نورشاہ.. فکر اور فکشن، ص 41)

حامدی کاشمیری نے نورشاہ کے افسانوں کا گہرائی، نکتہ سنجی اور فہم و فراست سے تجزیہ کیا ہے نیز قاری کو ان کے افسانوں میں سوز دروں کی کیفیت سے آشنا کرانے کے لیے جن اہم نکات اور جملوں کی تراش خراش سے کام لیا ہے اس سے نورشاہ کی مکمل فنی جہت سامنے آتی ہے۔ نورشاہ کی کہانیوں میں جہاں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے، وہیں ان کی سرشت میں تخلیقی انفراد کا راز مضمر ہے۔ جو دیگر ہم عصر افسانہ نگاروں سے ان کی منفرد شناخت کا ذریعہ بنتی ہے۔ رومانیت، جنسی تلذذ، نفسیاتی ہیجان، تلخ و شریں احساس اور حسین تجربات کی آمیزش سے ان کے یہاں جمالیاتی عنصر کا جنم ہوتا ہے۔ اس طرح جمالیات کے امام پروفیسر شکیل الرحمٰن اپنے مضمون ''نورشاہ کی کہانیوں کا تذکرہ'' میں اسی جمالیاتی کیفیت کو ابھارنے کی سعی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں پروفیسر موصوف نے نورشاہ کے اسلوب پر دسترس، تکنیک پر گرفت، افسانوی تجربات کی رنگا رنگی اور اجزائے افسانہ پر فوقیت کو بھی

غیر جانبداری سے بیان کیا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ کے مضمون ''ایک دلنشین کولاج'' میں جس قدر نور شاہ کے شخصی اوصاف، اسلوب، اندازِ بیان اور خاکہ نگاری کی خصوصیت کو مؤثر انداز میں رقم کیا گیا ہے اسی قدر مضمون نگار کی سحر بیانی، تحریر کی روانی، دلنشین اسلوب اور خوش گوار لفظیات کی چاشنی بھی قارئین کو اپنے جادو بیانی کی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔اس طرح کم صفحات میں کم روشنائی خرچ کرتے ہوئے ہمیں فن کار اور مضمون نگار دونوں کی قدرت بیانی اور فنی امتیازات سے روشنی حاصل ہوتی ہے۔تاہم مضمون نگار نے خاکوں پر بات تو کی ہے لیکن کتاب کا نام نہیں بتایا ہے۔صرف 'زیرِ نظر کتاب' کہنے پر ہی اکتفا کیا ہے اس کے علاوہ مضمون کے عنوان سے بھی کتاب کے نام کی جھلک نظر نہیں آتی۔وید راہی نے اپنے مضمون کے لیے ''نور شاہ کی کشمیر کہانی'' کا انتخاب کیا ہے۔جس میں انھوں نے حیرت کا اظہار بھی کیا ہے کہ جو شخص ابھی تک رومانوی کہانیاں لکھنے میں مست تھا، اس کی کہانیوں کا موضوع یکسر بدل کیسے گیا۔ وید راہی نے نور شاہ کے افسانوی مجموعے ''کشمیر کہانی'' کے افسانوں اور ڈراموں کے حوالے سے اپنی گفتگو کو مرکز و محور بنا کر ان کا تجزیہ کیا ہے۔جس میں انھیں حیرت و استعجاب ہوا ہے کہ مذکورہ مجموعے کی کہانیاں اور ڈرامے نور شاہ کی رگ و پے میں مدغم رومانیت سے عاری ہے اور جو کسی حد تک خوشی کا ضامن بھی ہے کہ جس فن کار کی کہانیاں ابھی تک رومان پروری کی دلنشینی سے معمور تھیں ان میں فکر و تخئیل اور خارجی ماحول کا ایک عنصر جذب ہو گیا جس میں اصلیت، حقیقت اور مؤثریت مضمر ہے۔یہ عنصر کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقی ہنر اور اس کی فطرت میں پیوست ہونی چاہیے جو نہ محض اس کی تخلیقی جاذبیت کا موجب بنتی ہے بلکہ قارئین کے لیے بھی باعثِ کشش بنتی ہے۔نور شاہ کی ''کشمیر کہانی'' کی کہانیاں کشمیر کے حالات اور مسائل و مصائب کا عکس کہی جا سکتی ہیں۔جو ہمارے ذہن و قلوب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں، جو احساسِ ہمدردی کو ابھارتی ہیں، جو ہمیں جذبات کے سمندر میں دھکیل دیتی ہیں، جو خون کے آنسو رُلا دیتی ہیں، جو سچائی کی علَم کو بلند کرتی ہیں، جو کشمیر کی مظلوم، بے بس و لاچار عوام کی ستم ظریفی سے شناسائی کرتی ہیں۔جو بے شمار اُجاڑ گھروں اور ان کے اسبابِ ویرانی کی

داستان سناتی ہیں۔

نورشاہ کی کہانیوں میں کشمیر کے خوں ریز حالات کی حقیقی تصویر کو دیکھا جا سکتا ہے۔صرف اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا جا سکتا اور بھی بہت کچھ ہے۔ ویدراہی کے مضمون سے ایک اقتباس کا حوالہ دیا جا رہا ہے جو نورشاہ کی کہانیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد دردانگیز انداز میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''یہ وقت کی ستم ظریفی ہے کہ نورشاہ کے تازہ افسانوی مجموعہ ''کشمیر کہانی'' میں وہ رومان کہیں نظر نہیں آتا جو جھیل ڈل کی روح پرور شاداب فضاؤں نے اُن کی سائیکی میں ڈھالا تھا۔تقریباً ان تمام افسانوں میں اُس سنگینی حالات کی عکاسی ہے جس میں سے یہ بدنصیب وادی پچھلی ایک چوتھائی سے گزر رہی ہے۔ان افسانوں میں نہ گلپوش وادیاں ہیں نہ سبزہ اور نیلی جھلیں ہیں نہ خواب بھرے غزار، نہ سرخی مائل چنار، نہ لانبے لانبے سفیدے، نہ لمحوں کو معطر بنانے والی فضائیں۔اب ان افسانوں میں وجود کی دَلدل ہے، بے پروبال بوڑھے عقاب ہیں، سڑکوں پر بہتی ہوئی خون کی لکیریں ہیں۔بے نام قبروں پر سسکتے ہوئے پتے ہیں، بکتے ہوئے خواب ہیں درد وکرب سے بوجھل فضائیں ہیں، مجروح ابابیلیں اور ہڈیوں کے سوداگر ہیں۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے نورشاہ کی ''کشمیر کہانی'' کی کہانیوں کے دروبست کا اندازہ ہوتا ہے۔حالات اور ماحول کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔نورشاہ واقعی میں ایک اہم تخلیق کار بن کر اُبھرے ہیں۔جنھیں وقت کے دھارے کے ساتھ چلنا بخوبی آتا ہے اور اس میں بھی وہ فن کو مخصوص سمت عطا کر کے اپنی منفرد شناخت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ویدراہی نے مثالوں کے ذریعے نورشاہ کی افسانوی خوبیوں کو ایمانداری کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔اپنے مضمون میں ویدراہی نے عمدہ نکات کی نشاندہی کی ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ نورشاہ کی کہانیوں میں سوال تو بہت ہیں لیکن جواب ندارد۔ان کے مطابق ادب میں سوالات قائم کرنا

ادیب کا ایک اہم فریضہ ہے۔ ''کشمیر کہانی'' میں قارئین کو عصری واقعات سے آگہی حاصل ہوسکتی ہے۔ کچھ کہانیوں میں اگرچہ پس منظر کے نا قابل فراموش حوادث کا نقش ابھرتا ہے لیکن وہ واقعات وحادثات عصری کشمیری حالات وحادثات سے مہمیز نظر آتے ہیں۔

ویدراہی کی طرح ڈاکٹر ریاض توحیدی نے بھی ''نورشاہ: کشمیر کہانی کے آئینے میں'' کو ہی اپنا موضوع بنایا ہے۔ نورشاہ نے ''کشمیر کہانی'' میں جس خوبصورتی سے کشمیر کے موجودہ حالات کی عکاسی کی ہے وہ ناقدین کے لیے محرک کا سبب بنا۔ کیونکہ جن کشیدہ حالات سے کشمیری عوام جوجھ رہی ہے اس کو زبان دینے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ جس طرح ہر تخلیق کار ایک ہی موضوع کو برتنے کا انفرادی تجربہ رکھتا ہے اسی طرح ناقدین بھی اس کی تخلیق کو الگ الگ میزان پر پرکھنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں تخلیق میں میل یا آمیختگی نظر آئے تب بھی اس کو مشابہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ اندازِ تحریر، اسلوب بیان، لفظیات کی چاشنی ورکھ رکھاؤ، فن پارے کو کسوٹی پر پرکھنے کا منفرد انداز اور نتیجہ ناقد کا انفرادی ہوسکتا ہے۔ اگر مارکیٹ میں ایک ہی موضوع پر مختلف قسم کی کتابیں آجاتی ہیں تو آنکھ بند کر کے انھیں رد نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی تک کوئی ایسا قانون لاگو نہیں ہوا ہے کہ جس کی بنیاد پر ایک ہی موضوع پر وجود میں آئی مختلف کتابوں کو رد کیا گیا ہو بلکہ وہ تو مطالعے کے لیے اکساتی ہیں تب جب جا کے فیصلہ صادر کیا جاتا ہے کہ کتاب کم پایہ کی ہے یا اعلیٰ پائے کی۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی کا مضمون بھی ان معنوں میں اپنی ایک الگ اہمیت اور حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے نورشاہ کے افسانوں کے تناظر میں کشمیر کے مسائل ومصائب اور دردناک واقعات کا جس طرح حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے وہ واقعی قابل ستائش ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید دور حاضر کے ایک معروف اور معتبر ناقد ہیں۔ جن کا زیر نظر کتاب میں ''نورشاہ: کشمیر، کرب، کہانی'' کے عنوان سے مضمون شامل ہے۔ متن، معنی، تھیوری، جمالیات، افسانے کی شعریات اور دیگر کئی اہم موضوعات پر انھیں اچھا خاصا عبور ہے۔ جس طرح موصوف اردو ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں اسی طرح انگریزی ادب یہاں تک کہ انگریزی کے عالمی ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کے اکثر و بیشتر مضامین میں

انگریزی الفاظ اور انگریزی ادبا کے اقوال کا عمل دخل رہتا ہے۔ ان کے مذکورہ مضمون میں بھی گنائے گئے خصائص کا انطباق نظر آتا ہے۔ جس میں نور شاہ کے افسانوی فکروفن سے متعلق کئی اہم پہلوؤں کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ پروفیسر موصوف نے جہاں نور شاہ کے خاص افسانوی وصف رومانیت، حسن وفطرت اور جمالیاتی حسن کی بوقلمونی کا ذکر کیا ہے وہیں ان کے یہاں جنسی موضوع کی بھی نشاندہی کی ہے۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگرچہ نور شاہ نے منٹو کی طرح شعوری طور پر جنس کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ غیر شعوری طور پر ان کے یہاں جنسی لذت کی کیفیت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سماجی شعور کی بالیدگی، تخلیقی میلانات اور نئے پن کی تلاش وجستجو کرنے والے افسانہ نگار کو بلا مبالغہ Genuine تخلیق کار کہا جاسکتا ہے وہ اپنے فن کو کئی خوبیوں کی مالا سے پروتا ہے۔ نور شاہ کے بیشتر افسانے رومانیت سے اثر انداز نظر آتے ہیں جس میں انھیں انفرادیت حاصل ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے فن کو محض رومانیت ہی تک محدود نہیں ہونے دیا۔ جیسا کہ کشمیر کے عصری حالات مذکور ہوئے ہیں جن سے نور شاہ اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکے۔ نور شاہ کے یہاں موجودہ وقت اور خاص کر ان کے مادرِ وطن کے لاتعداد مسائل اور کرب انگیز حالات منکشف ہوئے ہیں۔ ویدراہی، ریاض توحیدی اور قدوس جاوید کے مضامین میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ تینوں مضمون نگاروں نے اپنے اپنے مضامین میں نور شاہ کے افسانوں کے حوالے سے کشمیر کے موجودہ حالات کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

پروفیسر مجید مضمر ایک مقبول ناقد، تخلیق کار، مترجم اور استاد تھے۔ جو اپنے مضمون ''نور شاہ: ایک دلچسپ شخصیت'' میں نور شاہ کی ادبی صفات کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ مجید مضمر نے اس میں نور شاہ کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کاوشات کی تعریف وتوصیف بھی کی ہے۔ نور شاہ کشمیر کے ایک مقامی اخبار کے لیے مستقل کالم ''جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار'' لکھا کرتے تھے جنھیں موصوف نے بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ کتاب شائع کرنے سے پہلے ہی پروفیسر موصوف نے ان کی کالم نگاری کے تعلق سے اس مضمون میں اپنی مفید آرا پیش کی ہیں۔ اس کتاب کے اوائل میں ہی کئی جگہ اس بات کا ذکر آیا ہے کہ نور شاہ کی ابتدائی تحریر

''شاہدہ شرین'' کے قلمی نام سے چھاپی ہے۔بعد میں اس کا انکشاف ہوا اور پھر انھوں نے ''نورشاہ'' کے نام سے مستقل طور پر لکھنا شروع کیا۔آج نورشاہ کے نام سے ہی ادب کی دنیا میں مشہور و معروف ہو چکے ہیں۔ٹھاکر پونچھی کا مضمون ''شاہدہ شرین بنام نورشاہ'' بھی دلچسپی سے پُر ہے۔شاہدہ شرین کا قلمی نام اختیار کرنا نورشاہ کے قارئین کے لیے ایک عرصے تک معمہ ہی بنا رہا۔آہستہ آہستہ لوگ اس معمے سے آشنا ہونے لگے اور اپنے اپنے معنی و مطالب نکالنے لگے۔بہرحال اس کے پیچھے کیا مقصد رہا ہوگا۔اس سے قطع نظر قارئین کے لیے یہ واقعہ کافی عرصے تک دلچسپی کا باعث بنا رہا۔ٹھاکر پونچھی نے بھی اس کی وضاحت شگفتہ انداز میں کی ہے۔انھوں نے نورشاہ سے اپنے تعلقات اور ان کی ادبی صلاحیت کا اعتراف واشگاف الفاظ میں کیا ہے۔موصوف نے نورشاہ سے اپنی وابستگی کا سبب خط و کتابت کو قرار دیا ہے۔اس طرح نورشاہ کی مکتوب نگاری سے متعلق بھی کئی اہم باتیں جاننے کو ملتی ہیں۔ ٹھاکر پونچھی کے مذکورہ مضمون سے نہ صرف نورشاہ کے قلمی نام، شخصیت اور مکتوب نگاری کی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں بلکہ نورشاہ کے افسانوی مجموعے ''بے گھاٹ کی ناؤ'' کے تعلق سے بھی ان کی افسانوی جہات منظر عام پر آجاتی ہیں۔مجموعی طور پر اس مضمون سے نورشاہ کی تخلیقی ہنرمندی، موجودہ عہد کی سماجی و معاشرتی جدوجہد اور مسائل کی فن کارانہ عکاسی، زبان واسلوب بیان کی شگفتگی و شادابی، موضوعاتی تنوع، مشترکہ ماحول اور انسانی دردمندی کا جذبہ اور کشمیر کی زعفرانی دھرتی کی خوشبو وغیرہ کی بوباس کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔الغرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ ٹھاکر پونچھی نے نورشاہ کے افسانوں کو جیسا پایا۔ہوبہو، حقیقت پسند اور احسن انداز میں ویسا ہی بیان کیا۔

ایک زمانہ تھا جب ماہ نامہ ''بیسویں صدی'' میں کسی تخلیق کار کا چھپنا اعزاز سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔حالانکہ مذکورہ رسالہ آج بھی شائع ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ''ماہ نامہ'' سے ''ششماہی'' ہوگیا ہے اور اس کے ہم پلہ اب کئی رسائل بازار میں آگئے ہیں جس سے اس رسالے کی آن بان میں تھوڑا فرق آیا۔جموں و کشمیر سے نورشاہ ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو اوائل عمری سے ہی ''بیسویں صدی'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔نورشاہ کی ریاست سے

باہر ناموری اور شہرت کا یہ رسالہ ایک خاص سبب بنا ہے۔ محمد اقبال لون کی کتاب میں ''بیسویں صدی اور نور شاہ'' کے تعلق سے کئی خاص باتیں ہوئی ہیں۔اس لیے اس کا ذکر یہاں کرنا جائز معلوم ہوا کیونکہ اس کتاب کا اگلا مضمون ڈاکٹر شمع افروز زیدی کا بعنوان ''نور شاہ: ایک عہد ساز شخصیت'' پر مشتمل ہے۔جس کے ابتدائی کلمات میں ہی موصوفہ نے رسالہ بیسویں صدی کا ذکر کیا ہے۔ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے اپنے مضمون میں نور شاہ کے افسانوی محرکات اور رجحانات کے علاوہ افسانوں میں برتے گئے موضوعات اور کیفیات سے آگاہ کرنے کی سعی کی ہے۔انھوں نے کشمیر کے دلفریب مناظر اور حسن پرستی کے بے مثال سنگم کو نور شاہ کے افسانوں کا اہم جز قرار دیا ہے۔ چونکہ موصوفہ ابتدا ہی سے نور شاہ کے افسانوں کی باذوق قاری رہی ہے اس لیے انھوں نے ان کے افسانوں سے منسلک چیدہ چیدہ معلومات بہم پہنچائی ہے۔وہ سب خوبصورت عناصر جن کی وجہ سے کشمیر کو جنتِ بے نظیر سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ سب اجزا جن سے حسن اور جنس کی آمیزش ظاہر ہوتی ہے اور ساتھ ہی وہ سب حالات جن سے انسانوں کی روح بھی کانپ اُٹھے وغیرہ شمع افروز زیدی کے مضمون کا لب لباب ہے جو انھوں نے نور شاہ کے افسانوں سے اخذ کیے ہیں۔موصوفہ نے نور شاہ کے چند اہم افسانوں کا تجزیہ کرنے کے علاوہ ان کی مجموعی ادبی خدمات پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔جس میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی ہیں کیونکہ نور شاہ کی شخصیت اور ان کا فن بہت وسیع ہے جس کو ایک مختصر مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے۔اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ایک مخصوص موضوع پر خامہ فرسائی کی گئی ہوتی تو نتائج دیرپا ثابت ہو سکتے تھے۔شمع افروز زیدی نے نور شاہ کے افسانوں، خاکوں اور مرتب کردہ کتاب ''کشمیر کے اردو افسانہ نگار'' تک اپنی تحریر کو محدود رکھا ہے۔جب کہ نور شاہ کے افسانے بھی ہیں اور ڈرامے بھی، ناول بھی ہیں اور خاکے بھی وغیرہ۔میرے خیال سے اگر موصوفہ نور شاہ کے افسانوں میں کشمیریت، کشمیر کے حالات، حسن، جنس اور نفسیات کو بیان کرنے تک ہی اپنا مضمون محدود رکھتیں تو وہ اور دلچسپ ہو جاتا۔لیکن پھر بھی مضمون قابل مطالعہ ہے اور معنویت سے پُر بھی۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی کے مضمون ''نور شاہ: بعض اہم گوشے'' میں نظمیت کا رنگ پیدا ہوا ہے۔ یہ ایک تاثراتی

نوعیت کی مختصر تحریر ہے جس میں نور شاہ کی شخصیت، کارناموں اور صفات کو ایک دلنشین، شگفتہ اور سلیس پیرایہ میں تحریر کیا گیا ہے اور اس پر تظمیت کا شبہ بھی ہو سکتا ہے اور خاکے کا تاثر بھی ابھرتا ہے۔

پشکر ناتھ نے اس وقت نور شاہ پر تنقیدی مضمون تحریر کیا ہے جب ان کا تخلیقی سرمایہ دو افسانوی مجموعوں اور ایک ناول پر محیط تھا اور پشکر ناتھ نے بھی انہی کے حوالے سے اپنے مضمون کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ تمہیدی گفتگو میں انھوں نے سوالات بھی اٹھائے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف ناقدین ادب سے کافی خفا ہیں کہ ان سے جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں کے تئیں صحیح حق ادا نہ ہو پایا۔ بقول ان کے ''کشمیر کے افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی اوڑھنی میں کون کون سے ستارے ٹانکے ہیں۔ جاننا اور ان کی صحیح قدروں کو متعین کرنا نقادوں کا کام تھا، مگر بدقسمتی سے اردو زبان کے تمام نقاد اس بات پر خاموش ہیں۔ ممکن ہے اس میں بھی کوئی مصلحت ہو''۔ پشکر ناتھ نے یہ جائزہ برسوں پہلے لیا تھا۔ تب سے آج تک یہ صورتِ حال جوں کی توں بنی ہوئی ہے۔ کشمیر کے تخلیق کاروں کے تئیں مقامی تو مقامی یہاں تک کہ ملک کے بیشتر ناقدین اور محققین نے غیر مساویانہ روّیہ اختیار کیا ہوا ہے۔ ایک ایسی ریاست جہاں شاعروں اور فکشن نگاروں کی کمی نہیں۔ جن کا فن توانا اور لہجہ بلندی کو چھوتا ہے، پھر بھی ان کے تئیں بے اعتنائی برتنا ایسے سے کم نہیں ہے جس پر افسوس کرنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ اس کتاب سے قبل ایک مضمون میں پروفیسر مجید مضمر بھی کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ پشکر ناتھ اور پروفیسر موصوف کی باتیں آپس میں کتنی مشابہت رکھتی ہیں آپ کو آگے اس کا اندازہ خود بہ خود ہو جائے گا۔ پروفیسر مجید مضمر کے بقول

> ''شاعر یا ادیب کو اپنی تخلیق بڑی عزیز ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی یہ تمنا کسی تعجب کا باعث نہیں کہ ہر کوئی اس کے بلکہ اس کے بارے میں لکھے۔ تعجب تو جب ہوتا ہے جب وہ خود دوسروں کے خصوصاً اپنے معاصرین کے بارے میں لکھے اور ان کی سراہنا بھی کرے۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب تخلیق کاروں کے تئیں ادبی مورخین و ناقدین

قارئین کا رڈیہ اس قدر خاموشی ہو کہ تخلیق کار کو خود ہی تنقید و تحقیق کا بار بھی اٹھانے کی غیرت دلائے۔ کشمیر میں اردو شعر و ادب کے ساتھ کچھ ایسی ہی وارادات گزری ہے۔"

یہ بات ذہن نشین کرانے کے لائق ہے کہ پشکر ناتھ خود ایک تخلیق کار ہیں۔ انھوں نے بڑے تیکھے اور طنزیہ لہجے میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ جو حق ناقدین کا بنتا تھا وہ آج ایک تخلیق کار ادا کر رہا ہے۔ ان کے مطابق اس مضمون میں وہ ناقدانہ قسم کی صلاحیت اور تشبیہیں ڈھونڈھنے کی کوشش نہ کی جائے جن کی ضربیں اور چوٹیں سہتے سہتے بائرن اور شیلے جواں مرگ ہوئے تھے۔ پشکر ناتھ نے برسوں پہلے نور شاہ کے لکھے ہوئے افسانوں کو دو ادوار میں تقسیم کیا تھا۔ انھیں مضمون نگار کو پرکھنا اور اچھے برے کی تمیز کرنا خوب آتا ہے جس کی جھلک ان کے مضمون "نور شاہ اور اردو افسانہ" میں نظر آتی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے نور شاہ کے افسانے "لمحے اور زنجیریں" اور "ایک رات کی ملکہ" کے علاوہ ان کے فن اور فکر کے کئی گوشوں کو روشن کیا ہے۔

عصرِ حاضر کے اہم نقاد، مبصر اور تخلیق کار دیپک بدکی کا تحریر کردہ مضمون "نور شاہ کا تخلیقی سفر: رومانیت سے حقیقت تک" نور شاہ کی لکھی گئی تحریروں میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ نور شاہ کے رومان سے حقیقت تک کے سفر کا کئی جگہ حوالہ آیا ہے۔ قدوس جاوید، مجید مضمر اور کئی اہم ناقدین نے اس نکتے کو ذریعہ بنا کر اپنے مضامین کو آگے بڑھایا ہے۔ تاہم دیپک بدکی نے اپنے مضمون کی بنیاد ہی اس عنوان سے رکھی ہے اور شروع سے آخر تک رومانیت اور حقیقت کے امتزاج کے بیان میں تسلسل برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے نور شاہ کی تخلیقات میں علامتوں اور استعاروں کے استعمال، بیانہ اور مکالمہ کی خوبی، کرداروں کی نفسیات، معصوم کشمیری اور مظلوم عوام کے غم انگیز اور دکھ بھری زندگی کا نوحہ، ماحول بیدار ذہنیت کی عکاسی وغیرہ کو لفظوں کا خوبصورت جامہ پہنایا ہے۔ دیپک بدکی کے مضمون میں مزید کچھ ہے جس کا مطالعہ کرنا لازم ہے۔ وحشی سعید رسالہ "نگینہ" کے مدیر ہیں اور نور شاہ کے ہم عصر افسانہ و ناول نگار اور دوست بھی۔ انھوں نے نور شاہ کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا

ہے۔جس کی وجہ سے نور شاہ سے وابستہ بہت سی خصوصیات سے انھیں آگہی حاصل ہے۔
وحشی سعید نے اپنے مضمون میں رسالہ ''نگینہ'' میں نور شاہ کے حوالے سے بہت کم مگر اہم باتیں لکھی ہیں۔وحشی سعید''نگینہ'' کے لیے نور شاہ سے قلمی تعاون کے ساتھ ساتھ اس کی ترتیب وتہذیب میں بھی مدد لیتے ہیں۔اس طرح دو مایہ ناز تخلیق کاروں کے باہمی اشتراک سے رسالہ''نگینہ'' نگینے کی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

''نور شاہ ایک منفرد افسانہ نگار'' عبدالغنی شیخ کا رقم کردہ مضمون ہے جس میں موصوف نے نور شاہ کے افسانوں میں حقیقت بیانی سے آشنا کرایا ہے۔جہاں نور شاہ کو تحریروں کے آئینے میں دیکھا ہے، وہیں ان سے جڑی کچھ یادیں ملاقاتوں اور خط و کتابت کی رہینِ منت ہیں۔مزید کچھ معاصر ہونے کا فائدہ حاصل ہوا ہے۔شارق عدیل نے اپنے مضمون ''ایک نبض شناس کہانی کار: نور شاہ'' میں ان کی کچھ کہانیوں کے متوازن انداز میں تجزیے کیے ہیں۔رفیق شاہین''نور شاہ: طرب و کرب کے ترجمان'' میں کچھ ایسی کہانیوں کا حوالہ دے کر اپنے مضمون کو آگے بڑھاتے ہیں۔جس میں طرب بھی ہے اور کرب بھی۔اس کے علاوہ جس میں طرب اور کرب کہیں کہیں ہم آہنگ بھی ہوتا نظر آتا ہے۔ایسی کہانیوں میں '' کیسا ہے یہ جنون''،''درندے''،''لکیر''،''روشنی اور سائے''،''یہ خلش اگر نہ ہوتی'' قابل ذکر ہیں۔
ڈاکٹر مجیب شہزر نے بھی ''عہد آشنا فکشن نگار'' میں رفیق شاہین کی طرح نور شاہ کے افسانوی مجموعے ''کیسا ہے یہ جنون'' کے افسانوں اور افسانچوں کو اپنے مضمون کا موضوع بنایا ہے۔
انھوں نے لکھا ہے کہ ''ان کے افسانے ایڈگر ایلین پو کے نظریے کے مطابق قرأت میں نصف گھنٹے سے زیادہ وقت کا تقاضا نہیں کرتے''۔نور شاہ کی تخلیق کو جو افسانوی اجزا بلند و اعلیٰ ارفع تک پہنچاتے ہیں اُن کو ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے ''نور شاہ: اردو افسانے کے سرخیل'' میں دیانت دارانہ طریقے سے اجاگر کیا ہے۔انھوں نے نور شاہ کی تخلیقی زبان و بیان کی سحر انگیزی، موضوعاتی تنوع، فنی لوازمات کی آشنائی، عملی مشق، ذہنی بالیدگی، فنی و فکری، شعوری و بالیدگی، تخلیقی اُپج، سماجی شعور، زندگی آمیز اور حقیقت پسند رنگا رنگی کو ان کی میابی کی دلیل تصور کیا ہے۔افسانہ ''خوشبو کا سفر''،''اس کی گلی کا باپ''،''لکیریں''،''زمین کھولے گی زبان اپنی''،

''ایک لمحے کی جنت''، ''ہیلنگ ٹچ''، ''بے ثمر سچ'' وغیرہ کے تجزیے میں مضمون نگار نے اپنی تخلیقی وتنقیدی صلاحیت کا بھرپور استعمال کیا ہے۔مشتاق احمد وانی نے ان افسانوں میں نور شاہ کی پوشیدہ بیشتر افسانوی خوبیوں کو اقتباسات کا سہارا لے کر نمایاں کرنے کی ازحد سعی کی ہے۔کہیں کسی افسانے میں کشمیر کے حسین اور دلکش مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے تو کہیں کشمیری عوام کی بے بسی اور لاچاری کو ظاہر کیا گیا ہے۔کہیں حسن اور جنس سے پردہ اٹھایا گیا ہے تو کہیں ماحول ومعاشرے کی حقیقت بیانی سے متعارف کرایا گیا ہے۔مزید برآں اس میں نور شاہ کی افسانوی تکنیک پر بھی سرسری گفتگو ملتی ہے۔اس کتاب میں نور شاہ کی افسانہ نگاری کی ترجمانی میں ڈاکٹر اشرف آثاری کا مضمون ''نور شاہ کی تخلیقی انفرادیت'' کے علاوہ ''نور شاہ کے افسانوں کی حقیقت'' از محمد یوسف مشہور ''نور شاہ: فکشن کی عہد آفریں شخصیت'' از شرافت حسین ''نور شاہ: اردو افسانے کا ایک درخشندہ ستارہ'' از سعید خورشید کاظمی اور ''نور شاہ: تحریکات اور رجحانات کے تناظر میں'' جیسے مضامین ملتے ہیں۔آخر الذکر مضمون میں نور شاہ کو بیسویں صدی میں منظر عام پر آئی مختلف تحریکات اور رجحانات سے متاثر ہونے کا ذکر ملتا ہے۔جس میں رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے رجحانات قابل ذکر ہیں اور جن قارئین کو اس کی وضاحت مطلوب ہوگی وہ اس مضمون کا مطالعہ کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

''نور شاہ: فکر اور فکشن'' کے کچھ مضامین اگرچہ نور شاہ کی ناول نگاری پر مرقوم ہوئے ہیں۔تاہم ان میں نور شاہ کی ناول نگاری کی تمام جہتیں روشن نہیں ہوتیں۔اس لیے ڈاکٹر عارفہ بشریٰ کا مضمون ''نور شاہ بحیثیت ناول نگار'' کو اس کتاب کا ایک اہم مضمون قرار دیا جا سکتا تھا۔مگر یہاں پر بھی قارئین کو تھوڑی تشنگی ہی محسوس ہو سکتی ہے کیونکہ پروفیسر عارفہ بشریٰ نے مضمون کے آغاز میں نور شاہ کے ناول و ناولٹوں کے نام اور چند خصوصیات کو گنایا ہے۔اس کے بعد نور شاہ کی ناولٹ نگاری پر گفتگو کی گئی ہے اور اگر متن کا بغور جائزہ لیں تو ناولٹ نگاری کو بھی مختصر کرتے ہوئے صرف کرداروں کے تعلق تک بات محدود رکھی گئی ہے۔نور شاہ کی ناول نگاری کا جائزہ لینے کے بعد موصوفہ کہتی ہیں کہ نور شاہ اردو کے ممتاز

افسانہ نگاروں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، بیدی اور قرۃ العین حیدر اور بعد کی نسل کے فکشن نگاروں غیاث احمد گدی، رام لعل، جوگندر پال اور اقبال مجید کے پائے کے ناول نگار اور افسانہ نگار ثابت ہوتے ہیں۔ نور شاہ کی ناول نگاری پر کتاب کا اگلا مضمون ڈاکٹر نزاکت حسین کا ''نور شاہ کی ناول نگاری'' کے بعنوان شامل ہے۔ جس میں مضمون نگار نے ان کے تین ناولٹ ''آدھی رات کا سورج''، ''آؤ سو جائیں'' اور ''لمحے اور زنجیریں'' کا مختصر تجزیہ اور ماحاصل ناولٹ سے آگہی فراہم کی گئی ہے۔ ناولٹوں کے موضوعات اور دیگر اوصاف سے روشناس کرانے کے علاوہ انھوں نے ان میں قصہ، پلاٹ نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، واقعات نگاری، منظر کشی، زبان و بیان وغیرہ پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

کتاب کے اس دوسرے حصے میں شامل مضامین میں سلیم سالک کا مضمون بالکل انفرادی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں انھوں نے نور شاہ کی ادبی ڈائری کے محاسن بیان کیے ہیں۔ تمہیدی گفتگو میں سلیم سالک نے ادبی ڈائری کے فوائد اور اہمیت سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ ڈائری کو پہلے پہل بیاض کہا جاتا تھا، بدلتے وقت کے ساتھ اس کو ڈائری کا نام بھی دیا گیا۔ حالانکہ بیاض کے نام میں جدت پیدا نہیں کی گئی ہے بلکہ بیاض نام آج بھی رائج ہے۔ تاہم اضافی طور پر ڈائری نام انگریزی زبان سے مستعار لیا گیا ہے۔ اردو کے ابتدائی ادیب اپنی یاداشتوں کو بیاض میں محفوظ کیا کرتے تھے۔ چاہے وہ تذکرے ہوں یا روزنامچے۔ لیکن جوں جوں وقت آگے بڑھتا گیا بیاض کے نام سے موافقت رکھنے والے لفظ ڈائری کہنے کا رواج عمل میں آگیا۔ سلیم سالک لکھتے ہیں کہ اردو میں ادبی ڈائری لکھنے کا سہرا مولوی مظہر علی سندیلوی کے سر ہے۔ جنھوں نے ڈائری لکھنے کا باقاعدہ آغاز کیا۔ رفتہ رفتہ یہ چلن عام ہو گیا اور اردو کے کئی ادیب ادبی ڈائری لکھنے پر مائل ہو گئے۔ اختر انصاری، ابن انشاء، مجنوں گورکھپوری وغیرہ کی ڈائریاں اردو میں کافی مقبول ہوئی ہیں۔ اس قسم کی گفتگو کے بعد سلیم سالک نور شاہ کی ادبی ڈائری پر ذکر کرتے ہیں۔ نور شاہ کی یہ ڈائری ہفت روزہ اخبار ''کشمیر عظمیٰ'' (جو بعد میں روزنامہ ہو گیا) میں باون اقساط میں سلسلہ وار شائع ہوئی۔ نور شاہ کی ادبی ڈائری یادِ رفتگاں پر مشتمل ہے۔ سلیم سالک نے بڑی عرق ریزی سے اس

ڈائری کا جائزہ لیا ہے جس سے نور شاہ کی ڈائری کی تمام خوبیاں سامنے آ گئی ہیں۔ ''نور شاہ کی اردو شناسی'' ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کا مضمون ہے۔ جس میں موصوف نے نور شاہ کی ادب شناسی اور اردو ادب کے تئیں بے لوث خدمات کی خوبصورت الفاظ میں ستائش کی ہے۔ محی الدین زور نے مذکورہ مضمون میں نور شاہ کی مرتب کردہ کتاب ''انتخاب اُردو ادب (وادیٔ کشمیر) 1947 تا 1971 ''جس میں انھوں نے بڑی بے باکی سے کتاب کی سب خوبیوں اور خامیوں کو نمایاں کیا ہے اور کچھ تجاویز بھی پیش کی ہیں جن سے کتاب پائیدار ثابت ہو سکتی تھی۔

نور شاہ: فکر اور فکشن'' کے تیسرے حصے ''نقد و نظر'' میں سات مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ اس باب میں نور شاہ کے افسانوں، افسانچوں اور ناولٹ کو نقد و نظر سے گزرنا پڑا ہے۔ جنھیں عہد حاضر کے اہم اور اُبھرتے ناقدین نے تنقیدی تجزیے کا موضوع بنایا ہے۔ ابتدائی مضمون میں ڈاکٹر سیفی سرونجی نے ''کیسا ہے یہ جنون: ایک جائزہ'' کا تجزیہ کیا ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں مذکور ہو چکا ہے کہ اس عنوان سے نور شاہ کا افسانوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جس میں افسانے اور افسانچے دونوں شامل ہیں۔ سیفی سرونجی نے افسانہ ''کیسا ہے یہ جنون'' کا گہرائی سے تجزیہ کیا ہے اور پھر مختصر انداز میں ان کے دو افسانچوں ''کیا روپ کیا سروپ'' اور ''نصیحت'' کی خوبیوں پر بھی اپنی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر مشتاق حیدر نے ''قفس اداس ہے: ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔ مشتاق حیدر نے اس ناولٹ کے مرکزی کردار کے حوالے سے جس طرح بات کی ہے۔ اس سے پورے ناولٹ کی کہانی ذہن نشین ہو جاتی ہے اور مرکزی کردار کے افعال و افکار اور سیرت سے بھی قاری آشکارا ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ناولٹ کے کرداروں پر کھل کر اپنی تنقیدی آرا کا اظہار کیا ہے اور جو نکات ابھارے ہیں، ان سے ان کی تنقیدی بصیرت اور فنی آگہی کا پتہ چلتا ہے۔ مشتاق حیدر نے ناولٹ ''قفس اداس ہے'' کو طویل افسانہ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ جب وہ عناصر ترکیبی کی کسوٹی پر ناولٹ کو پرکھتے ہیں تو انھیں اس میں وحدتِ تاثر کے ساتھ ساتھ دیگر کئی ایسے فنی عوامل نظر آتے ہیں جو اِسے افسانے کی ذیل میں لا کھڑا کرتے

ہیں۔اس طرح موصوف کا مذکورہ مضمون قارئین کے لیے بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہوگیا ہے۔

''کشمیر کہانی: ایک جائزہ'' اس کتاب میں شامل راجہ نذر بونیاری کا تحریر کردہ دوسرا مضمون ہے۔اس سے پہلے بھی اس کتاب میں ''کشمیر کہانی'' کی کہانیوں پر بعض مضامین میں گفتگو ہوئی ہے اور یہاں بھی وادیٔ کشمیر کے تعلق سے وہی سچائیاں عیاں ہوتی ہیں جو سابقہ مضامین میں نمایاں ہوئی ہیں ۔البتہ یہاں پر افسانوں کے تجزیے میں زبان و بیان اور بوقلمونی احساسات اپنا ایک الگ تاثر جگانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔راجہ نذر بونیاری کے مطابق ''کشمیر کہانی بھی ہماری کہانی ہے اور جوں جوں آپ یہ کہانی پڑھتے جائیں گے آپ کو کسی جگہ یہ محسوس نہیں ہوگا کہ یہ بیس کہانیاں ہیں بلکہ صرف ایک کہانی کا گمان ہوگا۔ایک المناک داستان جس کے صرف چند کردار ہیں۔'' روف راحت کا مضمون ''نور شاہ کے ناولٹ: ایک سرسری جائزہ'' بھی کارآمد ہے۔جس میں انھوں نے نور شاہ کی تخلیقی حسیت، ناولٹ میں اختیار کیے گئے رومانی اور شاعرانہ اسلوب اور نفسیاتی پہلوؤں کا اچھا محاکمہ پیش کیا ہے۔

''کیسا ہے یہ جنون: تبصرہ'' سعید خورشید کاظمی کا تحریر کیا ہوا ہے۔تبصرہ کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار نے نور شاہ کے ادبی سفر اور تخلیقی انفرادیت کے علاوہ ان کے افسانوں پر مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔اب اس کتاب کے باب کا آخری تنقیدی و تجزیاتی مضمون مرتب کتاب محمد اقبال لون کا بعنوان ''تجزیہ افسانچے: چوکیدار، عینک والا آدمی، بہاؤ'' ہے۔اس سے پہلے مرتب نے ان افسانچوں کو ''نقد و نظر'' کے مشمولات میں نور شاہ کے نام کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید ان افسانچوں کا نور شاہ نے تجزیہ کیا ہے۔جب کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ان افسانچوں کو مرتب اپنے مضمون میں سمیٹ لیتے اور پھر بالترتیب افسانچہ اور اس کا تجزیہ پیش کرتے۔بہر کیف مرتب کو تنقیدی اعتبار و اعتماد کے ساتھ ساتھ ماحول و معاشرے کا بھی اچھا خاصا ادراک حاصل ہے۔ان کی وسعت ذہنی اور وسیع النظری تنقیدی تحریر کو وقار عطا کرتی ہے جس کا ثبوت مذکورہ افسانچوں کے تجزیے ہیں۔جن میں زیر تجزیہ افسانچے تمام ترفنی خوبیوں کے ساتھ اسم بامسمّٰی ہوگئے۔کہنا پڑتا ہے کہ محمد اقبال لون کے ان تجزیوں سے

افسانچہ نگار کے افسانچوں کا پورا پورا حق ادا ہو گیا ہے۔

''نورشاہ: فکر اور فکشن'' کا چوتھا باب نورشاہ کی تخلیقات کے لیے مختص رکھا گیا ہے۔ جس میں ان کے دس افسانے ''گلاب کا پھول''، ''کیسا ہے یہ جنون''، ''ایک لمحے کی جنت''، ''کنواں''، ''ایک لمبی عمر کی تنہائی''، ''کرب ریزے''، ''ہیلنگ ٹچ''، ''مجروح قافلے کی داستان''، ''خواب بھی بکتے ہیں'' اور ''درد آتا ہے دبے پاؤں'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈرامہ ''زندگی کا سفر''، ''دس افسانچے'' اور ''دیگر منتخب تحریریں'' کے عنوان کے تحت پانچ مختلف لوگوں پر لکھے گئے خاکوں کا انتخاب بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ آخر میں ''نورشاہ کی تخلیقات کے حوالے سے'' چند مشاہیر ادب کے ''فلک رنگ تاثرات'' کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ نورشاہ کے فکر و فن کو اس سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے اور اردو ادب میں ان کے قابل قدر کارناموں سے شناسائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ جن مشاہیر کی اس کتاب میں آرا شامل ہیں ان میں پروفیسر عبدالقادر سروری، علی جواد زیدی، اعجاز صدیقی، راما نند ساگر، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر برج پریمی، کیول سوری، علی محمد لون، رام لعل، عمر مجید، فرید پربتی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

محمد اقبال لون نے ''نورشاہ: فکر اور فکشن'' کو خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے اور قارئین اردو خصوصاً کشمیر کی نوجوان نسل کے لیے جو مستقبل میں کشمیر میں فکشن کے موضوع یا نورشاہ پر تحقیق کرنے کے خواہش مند ہوں گے، ان کے لیے یہ کتاب راہ راست کا باعث بنے گی۔ کیونکہ مرتب نے اپنے تحقیقی و تنقیدی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے نورشاہ پر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد کو دستیاب کرانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ کتاب محققین اور علم و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے دلچسپی کا محرک ثابت ہو گی۔

پوری کتاب کے مضامین کا بالاستیعاب جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب نورشاہ کے فکر اور فن کا مکمل احاطہ نہیں کرتی۔ کیونکہ جیسا کی پہلے بھی مذکور ہوا ہے کہ اس میں نورشاہ کے لکھے گئے ناولوں پر بھی الگ سے مضامین نہیں ملتے۔ تاہم نورشاہ کی افسانہ نگاری کا پورا جائزہ لیا گیا ہے۔ اگرچہ ناولٹ نگاری پر ایک دو مضامین لکھے گئے ہیں تاہم

ان کے ناول ''نیلی جھیل کالے سائے'' اور ''پائل کے زخم'' پر کوئی مضمون نہیں ملتا۔ مزید نور شاہ کے لکھے گئے ریڈیائی ڈراموں پر کوئی مضمون قلم بند کروایا گیا ہوتا تو کتاب اور زیادہ دلچسپ ہو جاتی۔ اس کے علاوہ نور شاہ کے کچھ افسانوی مجموعے بھی رہ گئے ہیں جن پر بات نہیں کی گئی ہے۔ وجوہات جو کچھ بھی رہے ہوں، نور شاہ کے ابھی بھی بہت سے پہلو تشنہ رہے ہیں۔ اس کی بہت حد تک بھرپائی ہو سکتی تھی اگر مرتب نے اُن ریسرچ اسکالرس سے رجوع کیا ہوتا جنھوں نور شاہ کی شخصیت اور فکر و فن پر تحقیق کی ہے۔ جن سے مضامین لے کر اس کتاب میں شامل کیے جا سکتے تھے۔ کتاب کی ضخامت بڑھنے کی صورت میں کچھ مضامین کو ہٹایا بھی جا سکتا تھا۔ چونکہ نور شاہ پر یہ اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے جو باقاعدہ طور پر زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت سے قطعی انکار کی گنجائش نہیں۔

# 1960 کے بعد اردو نظم میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب

اردو زبان اپنے تشکیلی دور سے لے کر عروج تک اور عروج سے لے کر موجودہ دور کسی بھی سطح پر ہندوستانی ماحول، معاشرے اور مشترک مزاج اور سماج سے بے نیاز نہیں ہوئی ہے۔ اردو ابتدا ہی سے سب کے ساتھ مل کر اور سب کو ساتھ لے کر چلتی رہی ہے۔ اس کے مزاج اور خمیر ہی میں یہ بات شامل ہے۔ اس کے تشکیلی عناصر ہندو مسلم، ہندی اور ہندوستانی ہیں۔ یہ اخوت و محبت کی زبان ہے اور اتحاد و اتفاق کی علامت بھی۔ اردو زبان وطن دوستی، وطن پرستی، مساوات، رواداری اور قومی یکجہتی کی ضامن بھی ہے۔ اردو زبان کی تشکیل اور ارتقا میں ہند المانی کلچر ہے جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ، عیسائی اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی بہت فعال رہے ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ لسانی تشدد میں سب سے زیادہ زد میں آنے والی زبان اردو ہی ہے۔ ''کدم راؤ پدم راؤ'' سے لے کر آج تک کتنی ہی ممتاز کتابیں، ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں یہاں تک کہ انگریزوں کے قلم سے نکلی ہیں اور شہکار کا درجہ اختیار کر گئیں۔ ماضی کو فراموش کر دیجیے تو ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو مسلمان نہ ہوتے ہوئے آج کی مروّجہ صنفوں میں نہ صرف قابلِ احترام ہیں بلکہ بہت حد تک اس زمانے کے ارتقائی سفر میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ داستان ہو کہ ناول، افسانہ ہو کہ انشائیہ، طنز و مزاح ہو کہ سفرنامہ، مرثیہ ہو کہ قصیدہ، غزل ہو کہ نظم سبھی مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔ یہ سب اصناف ادب اردو زبان کو تقویت پہنچانے کا باعث بن رہی ہیں۔

سطور بالا میں اردو ادب کی جتنی اقسام کا تذکرہ کیا گیا ہے ان سب میں ہندوستان

کی علمی وادبی، سیاسی وسماجی، تہذیبی وتمدنی، معاشی ومعاشرتی، اخلاقی واقداری، اقتصادی و ثقافتی، مذہبی وملّی، قومی ووطنی وغیرہ جیسے عناصر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اردو زبان میں ہندوستانی سماج کی کامیابی اور ترقی کا راز مضمر ہے۔ اردو زبان کی مختلف اصنافِ سخن میں شاعری ایک اہم وسیلہ قرار پائی ہے جس نے مشترکہ تہذیب کی علامت کو اجاگر کرنے میں اہم اور قابلِ اعتنا کردار نبھایا ہے۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ شاعری میں بھی صنفِ نظم ہی نے سب سے زیادہ ہندو مسلم میں اتحاد، بھائی چارگی، باہمی اختلاط، اخوت، ہمدردی، یگانگت، مساویانہ حقوق، میل جول اور اپنائیت کے احساس کو نمایاں کرنے میں معاون کردار ادا کیا ہے۔ اردو صنف نظم میں ایسے شعرا کی کمی نہیں ہے جنھوں نے ان موضوعات کو اپنی شاعری کا اہم وسیلہ بنا کر عوام کے دلوں پر راج کیا۔ مختلف ادوار میں مختلف شعرا حضرات کی آمد نے صنف نظم کے دامن کو مالا مال کیا۔ اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کے آب وگل کی خوشبو ابتدا سے ہی ادبی فضا کو معطر ومعنبر کیے ہوئے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی نظموں پر نظر ڈالیں۔ حالی، آزاد، سرسید کی نیچرل نظم ونثر کو دیکھیں جن میں ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی حقیقت کے نادر ونایاب جھلکیاں نمایاں نظر آئیں گی۔ ہندوستان میں حب وطنیت اور قومیت کا سیاسی تصور پیدا ہوا تو شعرائے کرام کے لب ولہجے میں خود بہ خود تبدیلی آئی۔ شروع شروع میں اکبر الہ آبادی، برج نرائن چکبست، ظفر علی خاں، درگا سہائے سرور، علامہ اقبال، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، ساغر نظامی اور دوسرے شعرائے کرام کے نام اس سلسلے میں لیے جا سکتے ہیں جن میں علامہ اقبال کے ''نظریہ وطنیت'' نے جس کی اساس وطنِ عزیز کی وابستگی پر تھی اپنا ''ترانہ ہند'' پیش کیا اور نونہالانِ وطن اور بلبلانِ چمن جھوم جھوم کر۔۔۔۔۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' گانے لگے۔ شاعر مشرق کی یہ مقبول نظم آج بھی ہر اسکول میں ہندوستانی طلبا ترنم سے پڑھتے ہیں۔

حب الوطنی، قومی، مذہبی، تہذیبی، ملّی، تعمیری اور سماجی نظمیں وغیرہ کہنے کا یہ رواج آزادی کے بعد بھی جاری وساری رہا۔ 1960 کے بعد کے نظم نگار شاعروں کی ایک طویل فہرست پیش کی جا سکتی ہے جنھوں نے اس نوعیت کے موضوعات کو شاعری میں برت کر اپنی

شہرت کا ضامن بنایا۔ ضیاہانی، کمار پاشی، نازش پرتاپ گڑھی، نیاز حیدر، مظہر امام، مخمور سعیدی، زبیر رضوی، بلراج کومل، چندر بھان خیال، عنبر بہرائچی، گوپال متل، علی جواد زیدی، اجمل اجملی، سلام مچھلی شہری، معین احسن جذبی، جگن ناتھ آزاد، پریم وار برٹنی، انور جلالپوری، ریاضت علی شائق اور مظفر حنفی، فرحت حسین خوشدل، سید احمد سحر، وغیرہ وہ شعرا ہیں جنھوں نے 1960 کے بعد ہندوستان کی قومی یکجہتی، حب الوطنی، مذہبی رواداری اور قومی میراث جیسے موضوعات پر نظمیں لکھ کر اردو شعر و ادب کی دنیا میں اپنی شناخت اور پہچان بنا کر اپنا نام روشن کیا۔

ضیاہانی کے شعری مجموعہ ''آئینہ وطن'' میں وہ نظمیں ملتی ہیں جن سے شاعر موصوف کی ''وطنیت اور قومیت'' کے بارے میں افکار و خیالات کی نشاندہی ہوتی ہے اس مجموعۂ کلام میں موصوف نے ان معروف ہستیوں کے بارے میں نظمیں قلم بند کی ہیں جو دانشور بھی ہیں اور سیاسی رہنما بھی۔ جو صوفی بھی ہیں اور ادیب بھی۔ عالم بھی ہیں اور شاعر بھی۔ شخصیات پر لکھی گئی ان کی نظموں میں گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار انصاری، ٹیپو سلطان شہید، علامہ اقبال، گرونانک، چکبست لکھنوی، کیفی دہلوی، اکبر الہ آبادی، غالب، سرشار، مہاراشٹر کے صوفی، مہاراشٹر کے سنت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بہرکیف اپنی بساط کے مطابق موصوف نے ہر اس عظمت انسان کے بارے میں لکھا ہے جس نے سیاست میں، ادب میں، تصوف میں یا فنِ شعر میں کمال دکھایا ہے۔ ان کی دیگر نظموں کے بارے میں پروفیسر یونس اگاسکر کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> ''ایک محبِ وطن سے ان کی نظمیں ان کے جذبات و احساسات کا پر کشش آئینہ ہیں۔ جس میں تہذیبی روایات ''قدیم و جدید'' نشانات کے نادر و نایاب نمونے نظر آتے ہیں۔ ساحلِ مہاراشٹر، تاج محل، میرا وطن ہے، تعمیرِ وطن، ڈل، کملا نہرو پارک، وغیرہ ملاحظہ فرمایئے اور حظ اُٹھایئے''۔

کمار پاشی نے اپنی نظموں ''ایودھیا میں آرہا ہوں''، ''کرشن''، ''گمشدہ لفظ''، ''پشاچ نگری''، ''ولاس یاترا'' وغیرہ میں جہاں اپنے وطن کی مٹی سے پیار اور لگاؤ کا اظہار کیا ہے، وہیں اپنی قوم کی دبتی اور کھوئی ہوئی قدروں کے افسوس کا اظہار بھی ملتا ہے۔ دیوی

دیوتاؤں کے تئیں عقیدت، احترام اور ان کی عظمت کا بیان کمار پاشی کی نظم ''کرشن'' میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی تصور و تہذیب کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ان نظموں کا گہرا تعلق ہندوستان کی مٹی کی بو باس، فضا، اساطیر اور دیو مالاؤں سے ہے۔ ان کا رنگ و آہنگ ہندوستان سے ہی مستعار ہے۔ ان نظموں میں مفاہمت کا جو انداز ہے، جو فکر ہے وہ گنگا جمنی تہذیب ہی کے تحت پیدا ہو سکتی ہے۔

نازش پرتاپ گڑھی نے بھی ایسی بہت سی نظمیں کہی ہیں جو مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں ۔ان کی نظموں میں ''اے نغمہ گرو''، ''اے ہم سخنو''، جشنِ جمہور''، ''اے زبان''، ''اے میرے وطن''، ''اپنی دھرتی اپنا دیش''، ''موسمِ گل کے سفیر''، ''باپو کی آواز''، ''دیش کے نوجوانو''، ''جاگ اے میرے وطن'' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نازش کی نظم ''زبان سے نفرت کیوں'' سے چند اشعار ملاحظہ ہو:

جہاں بھی چھاؤں گھنی ہو قیام کرتے چلو
ادب جہاں بھی ملے، احترام کرتے چلو

زبان تسلسل تاریخِ زندگانی ہے
زبان منازلِ تہذیب کی کہانی ہے

زبان مچلتی ہے مٹی پہ چیچھوں کی طرح
زبان نکلتی ہے چلمن سے زمزموں کی طرح

زبان قوم کی عزت بھی ہے، غرور بھی ہے
زبان عوام کی محنت بھی ہے، شعور بھی ہے

چونکہ ہندوستان نہ صرف رقبے کے لحاظ سے ایک بہت بڑا اور وسیع و عریض ملک ہے ۔ بلکہ آبادی کے لحاظ سے بھی ہندوستان دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ یہاں جتنے مذاہب، طبقوں اور قوموں کے لوگ رہتے ہیں، مشکل سے ہی دنیا کے کسی ملک میں مذاہب

اور قوموں کی اتنی تعداد پائی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کثیر تعداد میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔اس وجہ سے نازش پرتاپ گڑھی کی مذکورہ بالا نظم ایک قوم کی تہذیبی وراثت کی علمبردار نظم کہی جاسکتی ہے۔جس میں زبان کی خصوصیت کو مؤثر طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔غرض نازش کی نظمیں وطن دوستی،امن وآشتی،تہذیب کی رکھوالی،امن کی پاکبازی کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

نئی نظم کے معماروں میں نیاز حیدر بھی ایک اہم نام ہے۔ان کے شعری مجموعے ''شعلہ آوارگی''میں ''گنگو کا ترانہ''،تہذیب کے معمار''،اور''سے بڑا گمبھیر''جیسی نظموں میں ان کی عوام دوستی کا پہلو روشن نظر آتا ہے۔نیاز حیدر نے ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن کا آہنگ اور علامتی اسلوب عوامی زندگی اور ہندوستانی تہذیب کے نئے رخ کو پیش کرتا ہے۔نیاز حیدر بقول قمر رئیس ''ہندوستانی سنگیت اور لوک ساہتیہ کی ان روایات سے گہری واقفیت رکھتے تھے جن کا تعلق عوام کے رہن سہن،ان کی سوچ اور تہذیب سے تھا۔''تانڈو''،''نٹ راج''، ''مانجھی''اور''وندنا''جیسی نظمیں نظیر اکبرآبادی کی روایت کی توسیع کہی جائیں گی''۔

نیاز حیدر کے یہاں وطن پرستی کا تصور بھی ہے اور وہ ہندوستان کے حسین مظاہر کو عوام کی تخلیقی محنت اور اتحاد واخوت کا ثمرہ سمجھتے ہیں۔ان کی نظموں میں ایسی تصویر کا ایک نکھرا ہوا رنگ وروپ نظر آتا ہے۔جن سے ہندوستان کے قدرتی مناظر اور رسیلی رتوں سے توازن اور وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔لیکن جب ان کی نگاہِ تخیل،تہذیب کے رنگ وروپ کو متحرک پیکروں میں دیکھتی ہے تو ان کا وجود جھوم اٹھتا ہے اور ان کی تخلیقی فکر میں روانی پیدا ہوتی ہے۔ نظم''امن کی راہ پر''سے چند اشعار ملاحظہ ہو:

اُٹھاؤ بیڑا کہ ایشاء میں کبھی غلامی نہیں رہے گی
پنپ سکے گا نہ کوئی فتنہ نظر میں خامی نہیں رہے گی
یہ ٹوٹی گاڑھی نہیں چلے گی یہ بد انتظامی نہیں رہے گی
ہم اُس کو باقی نہ رہنے دیں گے جو عوامی نہیں رہے گی

مخمور سعیدی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کے متعدد مجموعۂ کلام میں ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں انھوں نے مناظرِ حسن وفطرت، سیاسی وسماجی ہیجان، معاشی زبوں حالی، انسانیت کی ناقدری، اقدار کی شکست وریخت، اور سماجی ابتری جیسے موضوعات کو اپنی نظموں کا خاصہ بنایا ہے۔ اتنا ہی نہیں ہندوستان شناسی، اور اس کی اقداری اور تہذیبی روایات کی پاسداری بھی انھوں نے خوب کی ہے۔ ان کی نظم ''اے ارضِ وطن'' اس کا عمدہ نمونہ ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

صحرا بھی ترے گلشن گلشن سایے بھی ترے روشن روشن
اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن
مندر کے کلس کیا ہیں ترے خوابوں کی سنہری تعبیریں
مسجد کے مناروں میں تیری بیداریٔ جاں کی تنویریں
اک تیری کتابِ عظمت کی محفل سو تفسیریں
چشتی کی دعا، نانک کی نوا، غالبؔ کی غزل، میراؔ کے بھجن
اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن

متذکرہ بالا نظم ''اے ارضِ وطن'' پندرہ بند پر مشتمل ہے جس کی بیانی اور زود گوئی میں انھوں نے اپنے قلم کو جان بخشی ہے۔ ہندوستان اور مشترکہ تہذیبی وراثت کا بانکپن بند کے لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے۔ تہذیبی لفظوں سے پروئی گئی یہ نظم مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ مخمور سعیدی کے اس موضوع سے مطابقت رکھنے والی دیگر نظموں میں ''ہندوستان''، ''وہ شہر بھی اسی جگہ ہے''، ''ترکمان گیٹ دہلی''، ''سلام عقیدت''، ''شگون''، ''موسم بہار کی ایک نظم'' وغیرہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔

چندر بھان خیال اردو کے ایک حساس شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کی نظم ''ہاں! وے مسلمان'' اس عہد کی تہذیبی کشمکش کی آئینہ دار ہے۔ دراصل یہ نظم ہندی شاعر دیوی پرشاد مشرا کی نظم ''مسلمان'' کے شائع ہونے کے بعد ردِ عمل کے طور پر منظرِ عام پر آئی تھی۔ چندر

بھان خیال جو کہ ہندوستان کے مشترکہ کلچر کے پروردہ، سیکولر ذہن کے مالک، قدروں کے رمز شناس ہیں۔انھوں نے اپنی مذکورہ نظم میں حب الوطنی کے خود ساختہ ٹھیکیداروں کو منہ توڑ جواب دیا ہے نظم کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے:

''مسلمان نہ ہوتے تو/قبیلوں، ورنوں، طبقوں،
اور جاتیوں کے جنگل میں/تنفر کی آگ لگی ہوتی/
جنگل جل چکا ہوتا/ پھر آرکشن کی دھوپ میں کسے
سینکتے/آرکشن کا ورودھ کون کرتا/ جمہوریت کی مینا
کہاں چہچہاتی/سمتا، سنتولن، سماج سدھار شبد کوش
ہیں/دھر رہتے ۔۔۔ وہ مسلمان ہیں/ وہ رتھ یا
گھوڑے پر سوار آتنک نہیں، وے رام سے نہیں
ڈرتے/لیکن ڈرتے ہیں تو رام نام کے سوداگروں
سے/ وے مارکس سے نہیں ڈرتے/لیکن ڈرتے
ہیں مارکس کے نافہم پرستاروں سے/ وے کسی سے
نہیں ڈرتے/ لیکن ڈرتے ہیں/حکمِ الٰہی میں
ملاوٹ کرنے والوں سے۔''

ہندوستانی تہذیب وثقافت کا ایک اہم نکتہ سیکولرزم اور رواداری ہے۔ہمارے عہد کے شاعر نے اسے بڑی خوبصورتی اور برجستگی سے پیش کیا ہے۔

عنبر بہرائچی کے یہاں موجودہ عہد میں گاؤں کی مٹی سے حد درجہ لگاؤ ہے بقول فضیل جعفری ''عنبر ہمارے پہلے جدید دیہی شاعر (Rural Poet) ہیں اور یہی ان کا قلعہ ہے۔دیہی شاعری کے جیسے اعلیٰ نمونے ان کے یہاں ملتے ہیں کہیں اور دکھائی نہیں دیتے۔'' اس کی عمدہ مثال عنبر بہرائچی کی نظم ''تنہائی ہوئی ہے پسینے میں لیکن'' ہے۔

ریاضت علی شائق کا شمار دورِ حاضر کے چند اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کا

مجموعۂ کلام "نذرِ وطن" انھیں وطنی اور قومی شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ جس کی ہر ایک نظم وطنیت کے جذبات سے سرشار ہے۔ ان میں ہندوستان کے نوع بہ نوع فطری مناظر سے، ہندوستانی تہذیب کی بوقلمونی سے، رنگا رنگ عوامی تہواروں سے، ہندوستان کے عظیم فرزندوں سے، اور اس کی تعمیر و ترقی کے مظاہر سے گہری وابستگی جھلکتی ہے۔ اس سلسلے میں "صدائے فرض"، "جشنِ زرین"، "ہولی"، اور "دیوالی" جیسی نظمیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں میں سیدھی سادی زبان شاعر کے سچے اور پر خلوص جذبات کا اظہار ہوا ہے۔ اس لیے یہ قاری کو اپیل کرتی ہیں۔ وطن کے برگزیدہ اور عظیم شخصیات میں "سبھاش چندبوس"، "گرونانک" اور "تلسی داس" جیسی نظمیں گہری تاثیر اور شاعرانہ حسن کی آئینہ دار ہیں۔ چند اشعار آپ کی بصارتوں کی نذر:

ہم اس کے پاسباں ہیں یہ پاسباں ہمارا
ہندوستان کے ہم ہیں ہندوستان ہمارا
(یہ گلستاں ہمارا، از شائق)

یہ حسین جگمگاتے نگر، گاؤں ہیں جس کے رشکِ قمر
آج شائق کے ہیں دیش پر، یہ فدا جان و تن زندہ باد
(سرزمینِ وطن زندہ باد، از شائق)

ان کی دیگر نظمیں "ایکتا"، "عید کی شوبھا"، "باپو"، "امن ہند کی بیٹی اردو"، "چراغِ اردو"، "گنگا جمنی تہذیب"، "جوشؔ و کبیرؔ"، "ندائے اتحاد"، "تہذیب کا گہوارہ" وغیرہ ان کی وطن پرستی کی سچی اور جیتی جاگتی مثال پیش کرتی ہیں۔

زبیر رضوی بنیادی طور پر نظم کے ہی شاعر ہیں اور ان کا شمار جدید نظم نگاروں کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔ اگر چہ ناقدین نے ابھی تک ان کی نظموں میں مشترکہ ہندوستانی تہذیبی عناصر کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ تاہم ان کی چند ایک نظموں میں اس کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں میں وطن کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی ہے اور یہاں کی گلیوں،

میلوں، ٹھیلوں، بازاروں، بستیوں اور موسموں کا ذکر بھی ہے۔ زبیرؔ امن مخالفوں سے خفا بھی ہے اور انھیں شہر کی گم شدہ رونق کا ماتم بھی ہے۔ انھوں نے بدلتے موسموں کا ذکر بھی چھیڑا ہے اور ہندوستانی روایات، کلچر اور تہذیبی ثقافت کے گیت بھی گایے ہیں۔ انھیں رشتوں کا احساس بھی ہے اور اس کے فاصلے کی چبھن بھی ہے۔ انھوں نے بچوں کی پسند کا لحاظ بھی رکھا ہے اور وطن کا گیت بھی گایا ہے۔

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہاں
اس سے پیار ہے مجھ کو
(یہ ہے میرا ہندوستان، از زبیر رضوی)

ان کی نظمیں جو مشترکہ تہذیبی علامت کی پاسدار ہیں، میں ''زمین تقسیم ہو چکی ہے''، ''مٹی کی خوشبو''، ''امن سے دشمنی''، ''گم ہوتا شہر''، ''کبیر رنگ'' اور ''صادقہ'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

انور جلالپوری بھی اردو شعر و ادب کے گیسو سنوارنے میں پیش پیش ہیں۔ انھوں نے بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ کر کے نہ صرف اردو جاننے والوں بلکہ غیر ہندی والوں پر بھی احسان کیا ہے۔ بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کر کے انھوں نے اتحاد و اتفاق اور بھائی چارگی کی ایک عظیم مثال قائم کی ہے۔ بھگوت گیتا کے ابھی تک 82 تراجم ہو چکے ہیں جن میں 15 منظوم ہیں۔ انور جلالپوری نے اپنے منظوم ترجمے کے لیے بحرِ متقارب کا انتخاب کیا ہے جو ثقیل، دقیق اور بھاری بھرکم الفاظ کی متحمل نہیں ہے۔ اس ترجمے کے لیے موصوف اردو اور ہندی سے تعلق رکھنے والے ادبا سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ چند شلوک ملاحظہ فرمایئے:

اُدھر کرشن و ارجن بھی بیتاب ہیں
یہ دونوں ہی خورشید و مہتاب ہیں

وہ رتھ جس کے گھوڑوں کی شان ہے
سفیدی ہی گھوڑوں کی پہچان ہے

متذکرہ بالا شلوک سے قارئین موصوف کے ترجمے میں برتی گئی زبان کی سلاست، فصاحت، شستگی، پاکیزگی اور روانی سے ضرور محظوظ ہوں گے۔

سید احمد سحر بھی بطور ایک وطنی شاعر کے اپنی منفرد پہچان بنا چکے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام ''گدازِ سحر'' میں ایسی متعدد نظمیں ملتی ہیں جن میں ہندوستانیت کی بوباس صاف نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں میں ''یوم آزادی جشنِ سیمیں''، جشنِ جمہوریت''، ''بھارت تو ہے بڑا مہان''، ''عید قرباں'' وغیرہ نمایاں ہیں۔ انھوں نے 1995 میں کشمیر کے عظیم الشان مقام پر پیش آئے سانحہ کو ''چرار شریف'' کے عنوان سے نظم قلم بند کی ہے۔ پروفیسر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

> ''ہم سحر صاحب کو پڑھتے ہیں تو ان کے نغمۂ حُبِ وطن میں کہیں ہمیں اقبال کا اپنا قومی شعور جھلکتا نظر آتا ہے کہیں جوش کی پر جوش شاعری کی جھلک اُس میں ملتی ہیں اور کہیں حفیظ کی نغمگی، اور سچ تو یہ ہے کہ یہ اُن کے اپنے دل کی دھڑکن ہے۔ جس میں قوم کے لئے گائے گئے نغموں کا عکس بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور ان کی اپنی منفرد آواز بھی الگ سنائی دیتی ہے اور ہم اُسے ایک ایسی زندگی کی صدائے نغمہ طراز کہہ سکتے ہیں جو خاموشی سے بلکہ خود فراموشی کے ساتھ خدمتِ شعروادب میں گزر گئی۔''

مظفر حنفی نمائندہ شاعروں میں سر فہرست نظر آتے ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ کافی وسیع ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی روح ان کی شاعری میں بھی سموئی ہوئی ہے۔ ان کی جن نظموں میں مشترکہ تہذیب کا عکس نظر آتا ہے۔ ان میں ''میرے ہندوستان'' اور ''خاکِ ہند کو سلام'' خاص قابلِ ذکر ہیں۔ معین احسن جذبی کی نظم ''نیا سورج'' مظہر امام کی نظم ''اشتراک'' اور ''اشعار''، اجمل اجملی کی نظم ''کرشنا ولی'' اور ''پھول زخمی ہے'' سلام مچھلی شہری کی نظم ''یہ

دھرتی خوبصورت ہے'' اور ''میں اس طرح یہ مسئلے دیکھتا ہوں'' برج موہن کی نظم'' مندر بھی لے لو'' حرمت الاکرام کی نظم'' ہمالہ کی جانب چلو'' اور ''مُر ور گلشن آرائی'' بھی بہت خوبصورت اور دلآویز نظمیں ہیں۔ مظہر امام کی نظم'' اشتراک'' کا ایک بند پیش خدمت ہے:

خیر اچھا ہوا، تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
اس قبیلے میں کوئی کسی کا نہیں
ایک تم کے سوا
چہرا اُترا ہوا
بال بکھرے ہوئے
نیند اُچٹی ہوئی
خیر، اچھا ہوا، تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
آؤ ہم لوگ جینے کی کوشش کریں

مذکورہ بالا مظہر امام کی ایک بہت ہی دلنشین نظم ہے۔ جس میں آپسی میل جول اور ہم آہنگی کے نقطہ نظر کو اجاگر کیا گیا ہے اور مل جل کر رہنے کی دعوت دی گئی ہے۔

ہندوستان کی تہذیبی، سماجی اور ثقافتی میراث کے ورثۂ خاص سمجھے جانے والے تاج محل سے مختلف مما لک اور مذاہب سے وابستہ لوگوں کی عقیدت وابستہ ہے۔ جہاں بلا تفریقِ مذہب و ملت اور نسلی بھید بھاؤ کے لوگ جگہ جمع ہو کر بھائی چارگی اور انسانی یکجہتی کی ایک عظیم مثال قائم کرتے ہیں۔ گویا تاج محل ان کے لیے یگانگت کی علامت بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاج محل کو بیشتر شعرا نے اپنی شاعری میں ایک خاص مقام دیا ہے۔ جن شعرا حضرات نے 1960 کے بعد تاج محل کو موضوع سخن بنا کر اپنی شاعری کو جاودانی بخشی ہے۔ ان میں، جگن ناتھ آزاد، حرمت الاکرام، سلام مچھلی شہری، مخمور سعیدی، پریم پال اشک، ضیاء ہانی، کلیم بدایونی، عارف بیابانی، شجاع خاور، محمد عسکری، فرحت حسین خوشدل وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پریم وار برٹنی کی نظم'' تاج محل میں آ جانا'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

جب رات کا آنچل لہرائے
اور سارا عالم سو جائے
تم مجھ سے ملنے شمع جلا کر تاج محل میں آ جانا

ہندوؤں اور مسلمانوں کی یہ مشترکہ تہذیب اور میل جول اس زمانے کی معاشرتی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ہولی، دیوالی، سلوتو، دسہرہ، شوراتری، وغیرہ ہندوؤں کے تہوار ہیں اور اسی طرح، شب برات، شب قدر، عید، عید قرباں، نوروز، محرم وغیرہ مسلمانوں کے تہوار ہیں۔ جنھیں شاعروں نے شاعری کے سانچے میں ڈھال کر زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ مندروں، مسجدوں، خانقاہوں، گرجوں، تیرتھ استھانوں، مقبروں اور قدرتی مناظر والی جگہوں کو بھی نئے شعرا نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ غرض مشترکہ ہندوستانی تہذیبی عناصر کی روایت جس کی ابتدا شعرائے متقدمین نے ڈالی تھی۔ اُس روایت کو برقرار رکھنے اور آگے بڑھانے میں نئے شعرا حضرات نے بھی ایک اہم اور قابل فخر ثبوت پیش کیا ہے۔

☆☆☆

# کتابیات

1۔ اردو شاعری میں تاج محل شجاع خاور اردو پبلی کیشنز، نئی دہلی 1968

2۔ آئینۂ وطن ضیا ہانی نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ، بمبئی 1977

3۔ اِک موسم میرے دل کے اندر، اِک موسم میرے دل کے باہر (شعری مجموعہ)
کمار پاشی سطور پرکاشن، نئی دہلی 1979

4۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم ڈاکٹر عتیق اللہ اردو اکادمی، دہلی 1990

5۔ شعلۂ آوارگی نیاز حیدر/مرتب ناشر/مرتضائی بیگم 1992

6۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب گوپی چند نارنگ
این۔سی۔پی۔یو۔ایل نئی دہلی 2002

7۔ نذرِ وطن ریاضت علی شائق
ناشر/رضیہ بیگم، اردو مرکز، دہلی 2003

8۔ راستا اور میں مخمور سعیدی ناشر/مصنف 2003

9۔ اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات عطاء الرحمٰن صدیقی
عالمی رابطہ ادب اسلامی، لکھنؤ 2004

10۔ آزادی کے بعد اردو نظم (ایک انتخاب) شمیم حنفی، مظہر مہدی
این۔سی۔پی۔یو۔ایل، نئی دہلی 2005

11۔ گدازِ سحر سید احمد سحر ناشر/مصنف 2005

12 ہندوستان شناسی (انتخاب) پروفیسر محمد حسن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2006

13۔ کچھ اور چاہیے وسعت اختر الواسع البلاغ پبلی کیشنز، نئی دہلی جون 2009

14۔ ہندوستانی اساطیر اور فکر و فلسفہ کا اثر ہندوستانی زبان و ادب پر

پروفیسر قمر رئیس اردو اکادمی، نئی دہلی 2009

15۔ تنقیدی جہات ڈاکٹر شہزاد انجم ناشر/مصنف 2011

16۔ اردو کہانی میں وطنیت اور اتحاد ڈاکٹر عبدالرشید خان

ایجوکیشنل، پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2011

17۔ اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت ڈاکٹر ندیم احمد 2011

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 2012

18۔ اردو شاعری میں گیتا (نغمۂ علم و عمل) انور جلالپوری ناشر/مصنف جولائی 2013

☆☆☆

# رسائل و جرائد

19۔ رسائل و جرائد میں ماہنامہ ''شاعر'' کا قومی یکجہتی نمبر 1974

☆☆☆

# دبستانِ دہلی کے چند اہم غزل گو شعرا: اکیسویں صدی میں

دہلی کو ابتدا سے ہی ہندوستان کا مرکزی شہر تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ ملک کی دیگر ریاستوں اور شہروں کے مقابلے میں دہلی کو ہمیشہ اوّلیت حاصل رہی ہے۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اب دہلی ایک بین الاقوامی شہر کی حیثیت اختیار کر رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اس شہر کا سیاسی، سماجی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی تحریکوں کا سرچشمہ ہونا اور مختلف النوع سرگرمیوں کی سطح پر اس کا اُبھرنا۔ مغل حکمراں ہو یا آج کا سیاست داں، شاعر ہو یا تاجر، سماج کا ذی اثر شخص ہو یا صاحبِ ثروت آدمی، مورّخ ہو یا سیّاح، روزگار کا متلاشی ایک عام انسان ہو یا تعمیری کام کرنے والا معمار، استاد ہو یا طالب علم، ماڈل ہو یا ایکٹر، صحافی ہو یا سماجی کارکن، مہاجر ہو یا کوئی اور غرض ہر ایک کی دہلی تک رسائی رہی ہے۔

اردو زبان وشعروادب کے حوالے سے دہلی کا ذکر کیا جائے تو یہاں بھی دہلی ہی بازی مارتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اردو زبان کا ارتقا دہلی اور نواحِ دہلی میں بولی جانے والی بولیوں کو ہی قرار دیا ہے جس کا سبھی اہل دانش وبینش نے اعتراف بھی کیا ہے۔ اوائل زمانے ہی سے دہلی کئی مشہور ومعروف شاعروں کا مسکن رہا ہے۔ جو یہیں پیدا ہوئے اور یہیں زندگی کی آخری سانس لی اور جنھیں یہاں کی ہی مٹی نصیب ہوئی۔ لیکن کچھ شعرا وادبا ایسے گزرے ہیں جن کی بود وباش دہلی میں تھی مگر زندگی کے آخری ایام میں زمانے نے ایسا رُخ بدلا کہ مجبور ہو کر انھیں ہجرت کا المناک منظر جھیلنا پڑا۔ بعض شعرا ایسے ہوئے جو تلاشِ معاش اور حصولِ تعلیم کی غرض سے یہاں آئے اور پھر زندگی بھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس

طرح شعرائے دہلی زندگی کی منفی اور مثبت دونوں قسم کی قدروں سے شناسا نظر آتے ہیں۔ جس کی عکاسی ان کی شاعری جابجا ملتی ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ دہلی کے اکثر افراد خاص کر شعرا حضرات عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ حساس اور باشعور واقع ہوئے ہیں۔ انھیں اپنے ماضی سے روشنی لے کر، حال کو سمجھنے اور مستقبل پر نگاہ رکھنے کے مواقع زیادہ حاصل ہوئے ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی دہلی کی اردو شاعری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''دہلی کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے ذہن و دل کے دریچے تازہ ہواؤں کے لیے کھلے رکھے ہیں۔ انھوں نے اپنی جڑوں پر استوار رہ کر ہر تازہ جھونکے کا خیر مقدم کیا ہے، ہر نئی روشنی کو دیدہ و دل میں بسایا ہے اور ہر نئے تجربے کا اپنی زندہ و تابندہ روایات کے تناظر میں خیر مقدم کیا ہے۔ دہلی کی اردو شاعری نے ایک طرف ان رجحانات کو قبول کیا ہے، جو ہماری سماجی اور تہذیبی تاریخ سے وابستہ ہیں۔ دوسری طرف ان تحریکوں کے اثرات کو اپنایا ہے، جو دوسری زبانوں اور ادبوں سے مخصوص ہیں۔ اس ضمن میں اردو زبان عام طور پر، اردو شاعری خاص طور پر خوش نصیب ہے کہ اس نے قومی زبانوں کے ادبی رجحانوں کے ساتھ بین الاقوامی ادبی تحریکوں اور میلانوں کے اثرات کو قبول کیا ہے۔''

(تنقید نامہ، از پروفیسر عنوان چشتی، ص72)

اس اقتباس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دہلی کی اردو شاعری کتنے متنوع خصوصی عناصر سے مزین ہے۔ یہاں کے شعرا نے زندگی کے ہر تجربے سے فیض پایا ہے۔ انھوں نے اپنے ذہن و دل کو کھلا رکھا اور اپنی چاروں سمت سے آنے والی تحریکات اور رجحانات کا خیر مقدم کیا اور اس کو اپنی فکری و فنی اور تخلیقی ہنر مندی اور اختراعی سوچ سے شعری پیکر میں ڈھال کر زندگی عطا کر دی۔

دہلی کی اردو شاعری کو مختلف ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اصل موضوع

چونکہ دہلی کے اکیسویں صدی عیسویں کے غزل گوشعرا ہیں لیکن راقم یہاں پر اُن اہم اور بنیادی غزل گوشعرا کے نام لینا ضروری سمجھتا ہے جن سے دہلی میں اردو غزل یا اردو شاعری کی جڑیں مضبوط ہوئیں نیز جن کے باعث یہاں انیسویں صدی میں ایک اسکول ''دبستان دہلی'' کے نام سے وجود میں آیا۔ ولی دکنی کے دہلی کے دورے سے اردو شاعری کا پہلا دور اختتام کو پہنچتا ہے اوراس کے بعد دوسرے دور کا جنم ہوتا ہے۔ جس میں ولؔی کی پیروی اوران کی طرز کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ خان آرزو، شاہ حاتؔم اور شاہ مبارک آبرؔو اس دور کے اہم اور نمایاں شاعر ہیں۔ ان کی شاعری پر کس طرح کے اثرات اور رجحانات غالب رہے اس کا ذکر مقصود نہیں ہے۔ تاہم یہ قدیم عہد کے شاعر ہیں، اس لیے ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ یکسر مختلف تھا۔ ان کی زبان گرچہ اردو تھی لیکن اس میں ابتذال کا عنصر نمایاں تھا۔ مضمون قدیمی تھا لیکن ان کی سادگی، صفائی، بے تکلفی اور قدرتی پن نے کلام کو خوبصورت بنا دیا۔

دوسرے دور میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر تقی میرؔ، میر دردؔ اور میر اثرؔ جیسے شعرا منظر عام پر آئے۔ یہ دہلی میں اردو شاعری کے بہت بڑے نام ہیں جن کے کلام کو آج یعنی دو سو برس سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی بڑی شدومد کے ساتھ پڑھا اور پسند کیا جاتا ہے۔ اس دور میں غزل کے موضوعات میں کافی حد تک وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ غزل کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی جارہی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان پر انگریزی حکومت مسلط تھی۔ چاروں طرف سیاسی افراتفری اور انتشار کا ماحول برپا تھا۔ جس کا اثر اس دور کے شعرا کی شاعری پر بھی پڑا، خصوصاً میر تقی میرؔ کی شاعری پر۔ اس کے بعد کا دور دہلی میں اردو شاعری کا تاریخ ساز اور زریں دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں مرزا غالبؔ، محمد ابراہیم ذوقؔ، مومن خان مومنؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ وغیرہ خاص ہیں۔ سیاسی انتشار اور مذہبی خلفشار کے جو مصائب و آلام میر کو جھیلنے پڑے تھے۔ غالبؔ کے دور میں وہ اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ غالبؔ بھی اس کرب ناک ماحول اور حالات سے نہیں بچ پائے جس میں اُن کا سب کچھ اثاثہ لٹ گیا اور اگر کچھ بچ بھی گیا تو وہ اردو و فارسی کلام اور نثری سرمایہ جو ہمارے سامنے اس وقت ''دیوان غالب'' اور ''خطوط غالب'' وغیرہ کی شکل میں موجود ہے۔ غالبؔ کی

شاعری میں اس عہد کی حقیقی جلوہ گری صاف نظر آتی ہے۔

ایک اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام شعرا کی محبوب صنفِ سخن غزل رہی ہے اور ان کا اکثر و بیشتر کلام بھی اسی صنف میں ملتا ہے۔ گویا انھوں نے اپنی پوری توانائی اسی صنف کی آبیاری میں صرف کر دی تھی۔ انھوں نے صنفِ غزل کو کمال تک پہنچایا اور باعثِ غزل ہی انھیں شہرتِ عام و بقائے دام حاصل ہوئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان شعرا کی بہ نسبت غالبؔ کو جتنی شہرت ملی، آج تک دہلی کیا اردو کے کسی غزل گو شاعر ما سوائے اقبالؔ کے حاصل ہوئی ہو۔ لیکن آج ان تمام شعرا کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، ان سبھی نے غزل کے دامن کو اپنے تخلیقی و فنی رچاؤ سے مالا مال کیا ہے۔ جو شعری خصوصیات انھیں ما بہ الا امتیاز عطا کرتی ہے۔ ان میں فارسیت کا غلبہ، عشق کے جذبات کا اظہار، عشقِ مجازی کا ذکر، حزن و یاس اور دل گدازی کے عناصر، تصوف، رمز و اشاریت، داخلیت، واقعیت و صداقت، سادگی اور اختصار جیسی خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد بھی دہلی میں اردو کے مقبول غزل گو شعرا کی ایک اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے جن میں پنڈت ہری چند اختر، جگن ناتھ آزاد، انور صابری، امیر قزلباش، بسمل سعیدی، کمار پاشی، بیخود دہلوی، غلام ربانی تاباں، شجاع خاور، صادق، راج نرائن راز، رفعت سروش، مغیث الدین فریدی، زبیر رضوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ساغر نظامی، عتیق اللہ، خالد محمود، سیفی پریمی، یعقوب عامر، عزیز وارثی، عنوان چشتی، گلزار دہلوی، گوپال متل، مغیث الدین فریدی، کمال احمد صدیقی، تنویر احمد علوی، عرش ملسیانی، مخمور سعیدی، تلوک چند محروم، مظفر حنفی، سلام مچھلی شہری، شمیم حنفی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ فہرست خاصی طویل ہو سکتی ہے لیکن طوالت کے خوف سے چند شعرا کے نام ہی گنائے گئے ہیں۔

آزادی کے بعد دہلی میں اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کا بہترین اور سنہرا دور اکیسویں صدی عیسوی کا ہے جو کہ اس مقالے کا بنیادی موضوع بھی ہے۔ ابھی اکیسویں صدی میں صرف اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔ بیسویں صدی کے بعض غزل گو شعرا بقیدِ حیات ہیں اور ملک کی آزادی سے کر آج تک مسلسل اپنی غزلیات سے دہلی کی ادبی سرزمین کو

شاداب و سیراب کر رہے ہیں۔اس طرح بعض شعرا ایسے ہیں جو بیسویں صدی کی آخری دو تین دہائیوں میں شعری افق پر نمودار ہوئے ہیں اور تا حال اپنی شعری تخلیقات سے قارئین کو نواز رہے ہیں۔ کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جو بیسویں صدی کے بالکل اواخر میں منظر عام پر آئے اور چند ایسے ہیں جن کی شعری تخلیقات صرف اکیسویں صدی ہی میں منظر پر آنے لگیں۔ بہر حال دہلی میں صنفِ غزل میں طبع آزمائی کرنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے جنھوں نے نہ صرف غزل بلکہ اردو کی دیگر اصناف میں بھی قلم آزمائی کی لیکن غزل میں ان سب شعرا کو اختصاصی اہمیت حاصل ہوئی۔ اپنی اسی انفرادیت کے سبب انھیں نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ عالمی پیمانے پر شہرت حاصل ہوئی ہے۔اس مقالے میں دہلی کے جن اہم اور معروف و مقبول شعرا کی غزل گوئی پر گفتگو کی جائے گی ان میں زبیر رضوی، مخمور سعیدی، مظفر حنفی، عتیق اللہ، صادق، شجاع خاور، شاہد ماہلی، شہپر رسول، خالد محمود، ابوالفیض عزم سہریاوی، فرحت احساس، شہباز ندیم ضیائی، رؤف رضا، کوثر مظہری، احمد محفوظ قابلِ ذکر ہیں۔

زبیر رضوی آزادی کے بعد شاعری کرنے والوں میں اپنی ایک خاص شناخت قائم کر چکے ہیں۔ لیکن آتے آتے انھوں نے اکیسویں صدی میں بھی بڑھ چڑھ کر شاعری کی۔ ان کی کلیات ''پورے قد کا آئینہ'' (2004) میں شائع ہوئی۔ جس میں ان کے سات شعری مجموعے شامل ہیں۔اس کے بعد بھی زبیر رضوی تواتر کے ساتھ شاعری کرتے رہے اور شائع بھی ہوتے رہے۔ کلیات ترتیب دینے کے بعد زبیر رضوی کے دو اور شعری مجموعے ''سبزۂ ساحل'' (2008) اور ''سنگِ صدا'' (2014) شائع ہوئے۔ جس کو اکیسویں صدی میں ان کا کُل شعری سرمایہ کہا جا سکتا ہے۔ ''سبزۂ ساحل'' ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جب کہ ''سنگِ صدا'' ان کی منتخب نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ''سنگِ صدا'' سے ان کے کچھ غزلیہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

وہ موسم جا چکا جس میں پرندے چہچہاتے تھے
اب اِن پیڑوں کی شاخوں پر سکوتِ شام لکھ دینا

یہ دلّی ہے یہاں آساں نہیں آباد ہو جانا
یہاں اینٹیں تو مل جاتی ہیں لیکن گھر نہیں ملتے

ہماری گرشِ پا راستوں کے کام آئی
کہیں پہ صبح ہوئی اور کہیں پہ شام آئی

وہ خوشبو کی طرح ہر سُو بکھر جاتے تو اچھا تھا
مجھے آئینہ کرتے اور سنور جاتے تو اچھا تھا

ﷺ

زبیر رضوی کی غزلوں میں رومان پروری، طبیعت کی شوخی، رفاقت پسندی، حقیقت اور صداقت کا امتزاج، فطری اور سادہ وضع داری، ذہنی آزادروی، جذبات واحساسات کی پاسداری، تجربہ سازی، وسعتِ وبلند خیالی، مثبت فکری، زندہ دلی اور تخلیقی فن کاری کا دلکش احساس ہوتا ہے۔ان کی غزلوں میں وہ ہنگامہ خیزی، نعرہ بازی، شوروشر کا کھوکھلا انقلابی نعرہ نظر نہیں آتا جو ترقی پسندوں کی پہچان ہے۔وہ سادگی و بے تکلفی اور سیدھے سادے انداز میں اپنے شعری خیالات کی ترسیل کرتے ہیں۔زبیر رضوی کی غزل گوئی سے ان کی شخصیت کے متنوع پہلو ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔وہ ماضی کی یادوں کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں لیکن ان کے اسیر ہوکے نہیں رہتے۔زبیر رضوی کے یہاں عصری حسیات وکیفیات وسیع پیمانے پر ان کی تخلیقی وجدان کا حصہ بنتی ہیں جن میں اشتراکیت کی مثبت قدریں بھی کارفرما ہیں۔مزید وجودیت اور مابعد جدیدیت کے تخیلی رجحان کا عمل دخل بھی ہے۔

زبیر رضوی کی غزلوں میں انفرادی تجربات کی آئینہ داری تو ہوئی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تجربات میں کسی حد تک حقیقت پسندی بھی ہے اور ذاتی احساس کی عکاسی بھی، ساتھ ہی ساتھ ذہن کو سرشار اور مست کردینے والی تغزل کی کیفیت بھی ان کی شاعری میں بخوبی موجود ہے۔زبیر رضوی کا لب ولہجہ احساس کی نزاکت، جذبے کی صداقت اور اظہار کی سلاست سے قریب تر نظر آتا ہے۔جدّت طرازی زبیر رضوی کی غزل گوئی کا

انوکھا پہلو ہے۔ موصوف تغزل کی عشقیہ کیفیت کے ترجمان ہیں۔ جس نے ان کی غزل گوئی کو کلاسیکی وقار، سنجیدگی، عصری حسیت اور آگہی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ زبیر رضوی کی غزلیہ شاعری ہر جگہ فکر و شعور اور زاویہ نظر کا مخلصانہ اظہار کرتی رہی ہے۔ جس نے انھیں اپنے ہم عصروں میں ایک امتیازی فن کارانہ منصب عطا کیا ہے۔

نئی غزل کے حوالے سے دبستانِ دہلی میں مخمور سعیدی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو کے مقبولِ عام شعرا اور دہلی کے بیشتر معروف شعرا ان کے معاصرین رہے ہیں۔ جس دور میں مخمور سعیدی نے شاعری کرنا شروع کی وہ دور دہلی کا اردو شاعری میں عہد زرّیں کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں دہلی میں اردو شعر و شاعری کے افق پر چمکنے اور دمکنے والے شعرا کی اچھی تعداد تھی۔ کتنوں کے نام گنوائے جائیں ایک سے بڑھ کر ایک نام اور سب اردو کے تابندہ ستارے۔ ان میں کچھ ستارے ایسے ہوئے جو اکیسویں صدی میں بھی گردش کرتے رہے اور جاتے جاتے اپنی روشن اور پُر نور کرنوں سے دبستانِ دہلی کی اس زرخیز ادبی سرزمین کو نئی صدی میں بھی رونق بخش گئے۔ مخمور سعیدی بھی انھی میں ایک ستارے کا نام ہے۔

مخمور سعیدی کا شمار جدید غزل کے بنیاد گزار شعرا کی نسل میں ہوتا ہے۔ جب ان کا جنم ہوا اُس وقت ترقی پسند تحریک کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس تحریک کے لائحۂ عمل اور اغراض و مقاصد کا فریم ورک تک متعین ہو چکا تھا۔ اردو کے بڑے بڑے قلم کاروں کی ترقی پسند تحریک میں شمولیت ہو رہی تھی۔ گو کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے اس کی حمایت میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مخمور سعیدی کے خیالات پروان چڑھ رہے تھے۔ مخمور سعیدی کی شاعری کا آغاز 1949 سے ہوتا ہے۔ ان کی نسل کے بیشتر شعرا ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے اور کچھ نے اس سے اجتناب برتتے ہوئے سلامت روی کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا۔ 1960 میں ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل میں "جدیدیت" کی تحریک شروع ہوئی۔ اسی سال مخمور سعیدی کا پہلا شعری مجموعہ "گفتنی" شائع ہوا۔ ان کی تخلیق نئی اور اس وقت کی ابھرتی ہوئی تحریک "جدیدیت" اور دم توڑتی "ترقی پسند تحریک" کے عناصر سے پاک نظر آئی۔ مخمور سعیدی اپنی شاعری کو ان دونوں تحریکات سے بچانے میں

کامیاب ہوئے۔مگر ان کے یہاں کلاسیکیت اور رومانیت نے جگہ بنالی۔دراصل جو شاعر یا ادیب مقتدیوں کی طرح ناقدین کے مقرر کردہ اصولوں کے کاربند و تابع دار رہتے ہیں وہ شعر و ادب میں یکسانیت اور ادعائیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔وہ حیات و کائنات کے متنوع اور گونا گوں پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر پاتے بلکہ اس سے وہ زندگی کے صرف چند زاویوں پر ہی اپنی نگاہ مرکوز کر کے رہ جاتے ہیں۔مخمور سعیدی کسی فکر کے پابند نہیں رہے بلکہ انھوں نے اپنے کھلے اور وسیع ذہن سے شعر وادب کی پرورش کی اور پھر لالہ وگل کی اس سیج پر نئے نئے اور رنگ برنگ گل بوٹے کھلانے شروع کیے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان تحریکات اور رجحانات کا ان کی شاعری میں اثر و نفوذ نہیں رہا۔براہِ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر ان کی شاعری میں کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔نثار احمد فاروقی ان کے آخری شعری مجموعہ ''راستہ اور میں'' کے پیش لفظ میں ان کی برگ و بار شخصیت اور متنوع شعری جہات کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ کہا جاتا ہے کہ ادب فنکار کی سیرت و شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور یہ صحیح بھی ہے، اس لیے کہ ادب میں فنکار کے جذبات و محسوسات، یا مدرکات و مشاہدات ہی کا انعکاس ہوتا ہے۔مخمور سعیدی کے ادبی اسلوب و انداز میں ان کی شخصیت کے سارے رنگ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کی آمیزش سے ایک منفرد رنگ و آہنگ اُبھر آیا ہے۔اُن کے مزاج میں جو لطافت اور نفاست، ضبط اور خودداری ہے وہی اُن کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔''
>
> (راستا اور میں، از مخمور سعیدی، ص9)

مخمور سعیدی کی شاعری یقیناً ان کے فن کارانہ افکار و خیالات اور شخصیت کے متنوع پہلوؤں کی آئینہ دار ہے اور ان سب باتوں کو نثار احمد فاروقی کے درج بالا اقتباس سے تقویت ملتی ہے۔بیسویں صدی کے آخر تک مخمور سعیدی کے جو آٹھ شعری مجموعے شائع ہوئے ان میں ''گفتنی''، ''سیہ بر سفید''، ''آواز کا جسم''، ''سب رنگ''، ''واحد متکلم''، ''آتے جاتے لمحوں

کی صدا''، ''بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا'' اور ''دیوار و در کے درمیاں'' قابل ذکر ہیں۔ حالیہ صدی میں ان کا ایک شعری مجموعہ ''راستا اور میں'' 2003 میں شائع ہوا ہے۔ اس شعری مجموعے سے ان کے چند شعر پیش کیے جا رہے ہیں جن سے ان کے شعری سیاق و سباق کے معنی و مفہوم کسی حد تک واضح ہو جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

تیز بارش ، گھر کی دیواروں کو ننگا کر گئی
رنگ سارے دھو گئی ہے ، کیا کہیں کس سے کہیں

بجھا دیے ہیں اگر ہم نے خود ہی گھر کے چراغ
نہ دیں گے گھر کو اُجالا اِدھر اُدھر کے چراغ

ہے اگر اس کا سنگِ در چُپ چاپ
ہم نہ پھوڑیں گے اپنا سر چُپ چاپ

اپنی زمین کو چھوڑ کے جانے والو اتنا دھیان میں رکھنا
آوازیں دیتی آئے گی پیچھے پیچھے یہاں کی مٹی

راہ کا پیڑ کہیں ابر کا ٹکڑا ہو جاؤں
ہو جہاں دُھوپ بہت تیز، میں سایا ہو جاؤں

اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ درج بالا میں دیے گئے صرف چند اشعار ہی کو زیرِ نظر رکھتے ہوئے ان کے فکر و فن پر بات کی جائے گی بلکہ یہاں مجموعی طور پر اکیسویں صدی میں ان کی شعری جہات بالخصوص غزل گوئی میں ان کی انفرادیت کو بیان کرنا مقصود ہے۔ بصورت دیگر اس میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

مخمور سعیدی فنِ شعر کے روایتی اصول و ضوابط پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ غیر ضروری طور پر یا محض نیا کہنے کی ہوس میں ان سے انحراف نہیں کرتے۔ مخمور سعیدی کی

جائے پیدائش ٹونک ہے اور جائے وفات بھی ٹونک ہی ہے۔ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ٹونک ہی میں ہوئی۔ان کے والد ماجد احمد خاں نازش خود بھی اردو کے قادرالکلام شاعر تھے۔ مخمور سعیدی نے شاعری میں سب سے پہلے انھی سے اصلاح لی۔ چونکہ ٹونک کی سرزمین سے کئی بلند اور اعلیٰ پایہ کے شعرا کا سروکار رہا ہے اس لیے ان سے بھی متاثر ہونا فطری بات تھی۔سب سے اہم بات کہ وہ مشہور زمانہ اور شہرت یافتہ شاعر بسمل سعیدی کے شاگرد رہے ہیں۔مخمور سعیدی 1956 میں دہلی آ گئے اور پھر عمر بھر دہلی کی شعری و ادبی محفلوں کا حصہ بنتے رہے۔یہاں مختلف ادبی رسالوں اور اردو اداروں سے ان کی وابستگی رہی۔اس طرح ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا،لیکن زندگی کے آخری دنوں میں واپس اپنے ٹونک چلے گئے، وہیں زندگی کی آخری سانس لی اور وہیں مدفون بھی ہوئے۔اس طرح ''اپنی زمین کو چھوڑ کے جانے والو اتنا دھیان میں رکھنا'' والے شعر سے ان کی طبیعت بحال ہوتی ہے اور آخر کار ان کی مراد بھی برآتی ہے۔

مخمور سعیدی ہمارے عہد کے معتبر اور ممتاز شاعر ہیں۔ان کی شاعری گذشتہ نصف صدی پر محیط ہے۔ناقدین نے ان کی شاعری میں کلاسیکی روایات کی نشاندہی کی ہے جو بالکل صحیح بھی ہے۔انھوں نے کلاسیکی اقدار کو کبھی اپنے دامن سے چھوٹنے نہیں دیا۔ان کی شاعری میں ابہام کے نہ پائے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔یہ شعری خصوصیت ان کے یہاں ابتدا سے تا حال برقرار رہی۔ان کی شاعری میں فکر، خیال، جذبہ اور احساس کی سطح پر ہم آہنگی، توازن اور وضع داری پائی جاتی ہے۔انھوں نے اس دور کی حقیقتوں اور سچائیوں سے منہ نہیں موڑا بلکہ اس کی خوب تخلیقی پیروی کی۔مخمور سعیدی کی شاعری کا شعری ڈکشن جدید اور کلاسکیت کے زندہ اور تخلیقی رموز و عناصر سے متصف ہے۔چنانچہ ان کی شاعری میں اکہرا پن نہیں، بلکہ وہ اپنے اندر تہذیبی و ثقافتی ابعاد رکھتے ہیں۔ان کے یہاں بھی کلاسیکی شعرا کی طرح عشق و محبت کے جلوے دکھائے دیتے ہیں لیکن یہ فن میں عیب پیدا نہیں کرتا۔اگر کلاسیکی شاعری میں عاشقانہ پن نہ ہوتا تو شاعری بے مزہ ثابت ہوتی۔لیکن وقت وقت کی بات ہے، ایسا بھی نہیں کہ انھوں نے موجودہ دور کی ترجمانی شاعری میں نہیں کی۔ان کی فکر میں جو گہرائی

اور گیرائی ہے وہی ان کی موجودہ صدی کی شاعری کی جان وشان ہے۔

نثار احمد فاروقی نے مخمور سعیدی کی عصر حاضر میں جو شعری خصوصیات گنائی ہیں، وہ ہے فارسی زبان کے ساتھ ان کا مانوس ہونا۔ کیونکہ یہ خصوصیت آج کے شعرا میں معدوم ہوتی جارہی ہے۔ ان کے ذہن وفکر کی جس ماحول میں نشو ونما ہوئی اس میں فارسی زبان کا جاننا ضروری تھا۔ فارسی کے اساتذۂ کرام کے کلام پر ان کی نظر ہے اس لیے وہ اس زبان کے امتیازات اور محاسن کو سمجھتے ہیں۔ اس وصف کا عکس ان کی شاعری میں کہیں کہیں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سادگی، سلاست، فصاحت، بلاغت، تازگی، ندرت، متانت، جدت کا امتزاج ان کی شاعری کو خوبصورتی سے مزین کرتا ہے۔ ان کی غزلوں کا مرکزی محور ایک موضوع ہوتا ہے جو خیال کے اردگرد گردش کرتا ہے۔ استعاروں اور علامتوں کی سطح پر انھوں نے نئی نئی راہیں ہموار کی ہیں۔ وہ دوسروں سے انھیں مستعار نہیں لیتے بلکہ خود وضع کرتے ہیں۔ عہد حاضر میں انسان کے دکھ، درد، کرب، مسائل ومصائب، تنگ دستی، ناداری، مظلومی، ظلم وجبر، محرومی، مجبوری، لاچاری کا بیان ان کی دلنشین غزلیں ہیں۔ اس میں انھوں نے دردمندی، اخلاص، احساس، متانت اور دل سوزی سے کام لیا ہے۔ بالغ نظری، وسعتِ خیالی اور شعور کی سطح پر بھی آنکا جائے تو مخمور سعیدی ایک اعلیٰ فن کار ثابت ہوتے ہیں۔ مخمور سعیدی کی شاعری پر اظہار ِخیال کرتے ہوئے پروفیسر زاہدہ زیدی نے لکھا ہے:

> ''مجموعی طور پر مخمور سعیدی کی غزل اردو کی شعری روایت اور جدید طرزِ فکر کا ایک متوازن امتزاج ہے۔ زبان وبیان پر قابل لحاظ دسترس، سادگی، بے ساختگی اور سوز وگداز، ان کی اچھی غزلوں کی کچھ قابل قدر خصوصیات ہیں........ لیکن جہاں جہاں بھی مخمور سعیدی نے زیادہ جدید بننے کی کوشش کی ہے وہ اکثر ناکامیاب رہے ہیں۔''

(بحوالہ زرنقد، از محمد شاہد پٹھان، مارچ 2009، ص 93)

زاہدہ زیدی کے اس اقتباس سے ایک تو مخمور سعیدی کی غزل گوئی کی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں دوسری یہ کہ جدیدیت کے عنصر کا ذائقہ ان کی شاعری میں نہ آپایا۔ مخمور سعیدی

کی غزلیہ شاعری میں جو حسن اور چاشنی پیدا ہوئی ہے وہ درحقیقت ان کا تحریکوں اور رجحانوں کو نہ اپنا پانا یا اس رنگ کا مزاج پیدا نہ کر پانا۔ اگر ان کی غزلوں میں کہیں کہیں جدید مزاج و منہاج کی آمیزش نظر آتی ہے یا اس کا احساس ہوتا ہے تو اس رنگ آمیزی کی جھلک ان کے یہاں فطری طور پر منعکس ہوئی ہے۔ اگر اس میں ان کی بلا واسطہ یا شعوری کوشش ہوتی تو شعری اسلوب اور زبان و بیان شاید غیر ذائقہ اور خشک محسوس ہوتی۔ مخمور سعیدی کے ہاں لفظ کی بڑی اہمیت ہے وہ لفظوں کے جادوگر بھی ہیں اور مصور بھی۔ الفاظ کی اس جادوگری نے ان کی غزلوں میں تحیر و استعجاب پُر اسراریت، تنوع، رنگا رنگی، تہہ داری اور جامعیت پیدا کی ہے۔ مخمور سعیدی کی شاعری میں موجودہ صدی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری نصف صدی کا قصہ ہے اس کے ساتھ ہی عہدِ حاضر کا مرثیہ بھی۔ نصف صدی کا یہ پورا شاعر ہم سب کے لیے لائقِ احترام ہے۔

دہلی کے غزل گو شعرا میں مظفر حنفی ایک ایسا نام ہے جن کا ادبی و شعری سفر کئی دہائیوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے آزادی سے قبل ہی لکھنا شروع کیا، لیکن پھر آزادی کے بعد سے با قاعدہ طور اردو غزل لکھتے آرہے ہیں اور آج یعنی اکیسویں صدی میں بھی بڑی برق رفتاری کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ ان کی غزلیں متواتر ملک و بیرون ملک کے مقتدر جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں جو ہماری نظروں سے آئے دن گزرتی رہتی ہیں۔ نئی صدی میں مظفر حنفی کی جو شعری تخلیقات منظر عام پر آئیں۔ ان میں ''آگ مصروف ہیں''، ''چنیدہ''، ''کمان'' (کلیات جلد اوّل)، ''تیزاب میں تیرتے پھول'' (کلیات جلد دوم)، ''ہاتھ اوپر کیے'' وغیرہ شامل ہیں۔ جب کہ ''ہیرے ایک ڈال کے'' چنندہ اشعار کا انتخاب ہے اور دیگر صرف غزلیات پر مشتمل مجموعے ہیں۔

مظفر حنفی اردو غزل کے ایک ایسے تابندہ ستارے کا نام ہے جن کی غزلوں میں نہ صرف موضوعات کا تنوع ہے بلکہ وہ زندگی اور سماجی حقیقت نگاری کی سچی تصویر کشی بھی کرتی ہیں۔ انھوں نے استاد شاد عارفی کے طرزِ شاعری کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنے ایک مخصوص آہنگ کی بنیاد پر خود کی ایک منفرد شناخت قائم کی۔ مظفر حنفی اپنے عہد کے ساتھ

چلتے ہیں، جس عہد میں جیتے ، سانس لیتے ہیں۔ اسی دور کی منظر کشی اپنی غزلیہ شاعری کے ذریعے کرتے ہیں۔ اختر سعید خاں مظفر حنفی کی عصری شاعری کے حوالے سے مضمون ''مظفر حنفی سخن کے آئینے میں'' اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چنانچہ پچھلے 40 برسوں سے ایوان شاعری میں مظفر حنفی کا اپنا آہنگ غزل گونج رہا ہے۔ یہ آہنگ اس وقت بھی منفرد تھا جب نئے لب ولہجہ کے ذوق وشوق میں پوری نسل ایک ہی لئے میں ایک ہی نوع کے الفاظ و معنی کا ورد کر رہی تھی اور ایک آواز کو دوسری آواز سے ممیز کرنا محال تھا اور آج بھی منفرد ہے جب سینکڑوں آوازوں میں سے چند ایک اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ مظفر کی ابتدائی شاعری کا مطالعہ کیجیے یا آج کی شاعری کا، قاری کو محسوس ہوگا کہ جو شخص اس سے خطاب کر رہا ہے وہ مکمل اکائی ہے۔ لہجہ، لفظیات، اظہار کے وسیلے، خیالات کی رو، ندرت بیان، جذبات طرازی، نئی زمینیں، نئے گوشے، غرض جو کچھ ہے اور جیسا ہے اس کا اپنا ہے۔ اگر کسی دوسرے کا خیال اسے اظہار کے لیے اکساتا بھی ہے تو وہ اس پر اختلافی نوٹ لگا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔''
>
> (آگ مصروف ہے از مظفر حنفی، ص 11)

مظفر حنفی کی غزلیں معنی و مفاہیم، شگفتگی و بے ساختگی، فصاحت وسلاست، شعوری پختگی، اظہار واسلوب، تشبیہ واستعاروں اور پیکروں وعلامتوں کی سطح پر خوب نکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ جو نشاط و انبساط کا پہلو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ انھوں نے سیاسیات و سماجیات، طنزیات وکلاسیکی شاعری کی صحت مند قدروں، عہد حاضر کے غالب رجحانات، عصریت کے فکری تناظرات، انسان کے داخلی جذبات واحساسات، دلی کیفیات وقلبی واردات کو اپنی شاعری کے توسط سے نمایاں کیا ہے۔ مظفر حنفی کی عصری شاعری دل کو قرار، ذہن کو تازگی اور جذبات کو سرشار کرتی ہے۔ ان کے یہاں سطحی شاعری نہیں ملتی بلکہ متانت، سنجیدگی اور غور وفکر کی کافرمائیوں سے ان کی شاعری ممیز ہے۔ مندرجہ ذیل میں مظفر حنفی کے

چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جن سے ان کی شاعری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

خبر ہے آج وہاں زندہ گڑ گیا کوئی
دکان اپنی جہاں میں لگانے والا تھا

قدر فردا کی کم ہو گئی حال میں
حال ماضی بنا تو سنہرا ہوا

مظفر کیا ہوئے وہ لوگ دنیا اُن کے دم سے تھی
جنھیں حاصل نہ تھی قدرت مگر ایثار کرتے تھے

خاک سے رابطہ رکھنا تمہیں منظور نہیں
میں تو مٹی میں بھی رَل جاؤں لیکن تم لوگ

مندرجہ بالا نمونہ کلام سے مظفر حنفی کے شعری منظر و پسِ منظر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مظفر حنفی دور جدید کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ یہ کچھ اشعار ان کی پوری شعری کائنات کی دلالت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کا نظریہ بہت وسیع ہے، خیالات میں پختگی ہے اور دائرہ کار بھی متنوع ہے۔ انھوں نے ادب کو شاعری کے ذریعے جو جہتیں بخشی ہیں ان کا احاطہ کرنا یہاں پر ممکن نہیں ہے۔ مظفر حنفی ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ شاعر ہیں جو برسوں سے ادب کی بے لوث خدمت کرتے آ رہے ہیں۔ ان کا مقابلہ کسی سے نہیں۔ ان کو شاعری میں ایک اہم مقام اور خاص حیثیت حاصل ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ دبستانِ دہلی میں جدید شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ جس طرح انھوں نے اردو ادب کو اپنے گرانقدر تنقیدی سرمایے سے وسعت بخشی، اسی طرح صنفِ غزل کو بھی تنگ دامانی سے باہر نکال لائے۔ جہاں معنیٔ غزل کے حدود غیر معنی ہو جاتے ہیں اور معنیٔ لامحدود کے امکانات اور دریچے منتظر رہتے ہیں وہاں تک ان کی شعری دسترس ہے۔ ستّر

کی دہائی میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''سوغزلیں'' شائع ہوا تھا۔ پھر نوے کی دہائی میں ''بین کرتا ہوا شہر'' منظر عام پر آیا۔ اس طرح ان کی شعری کائنات غزلیہ شاعری سے پوری طرح لبریز اور سرشار دکھائی دیتی ہے۔ غزل سے ان کے گہرے لگاؤ کا ثبوت شعری مجموعہ ''عبارت'' ہے جو 2012 میں شائع ہوا ہے۔ یہ صرف غزلیات پر مشتمل مجموعہ ہے۔ اس مجموعے سے ان کی شعری جہات کا اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں۔ عتیق اللہ کی جس قدر تنقید پر سخت گرفت ہے اسی قدر شاعری پر ان کی پکڑ بہت مضبوط ہے۔ بقولِ معید رشیدی ''کچھ لوگوں کے نزدیک وہ ناقد اچھے ہیں۔ کچھ انھیں شاعر کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔'' جب کہ عتیق اللہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ لیکن ماننا پڑے گا کہ انھوں نے دونوں حیثیتوں سے اپنا لوہا منوایا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ایک حساس شاعری کی پہچان عتیق اللہ کی شاعری ہے۔ انھوں نے عہد حاضر میں بھی غزل کو اپنے سخن کا وسیلۂ اظہار اور فن کا اعتبار سمجھا۔ عتیق اللہ کی غزل معنویت کی بے انتہا وسعتوں کو چھوتی ہے۔ وہ کائنات اور کائنات میں خدا کی مخلوقات کو وسیع تر تناظر میں دیکھتے ہیں، ساتھ ہی اپنی فکر اور ادراکی و حسی قوت کو غیر جانبدارانہ طور پر بروئے کار لاتے ہیں۔ ''عبارت'' کے کچھ شعر ذہن نشین کیجیے:

اُس دشت نوردی میں جینا بہت آسان تھا
ہم چاک گریباں تھے، سر پر کوئی داماں تھا

بہت دنوں میں کہیں راستے بدلتے تھے
وہ لوگ کیسے تھے جو ساتھ ساتھ چلتے تھے

تیرے قریب آیا تو ہر شئے سے کٹ گیا
چھوٹے سے ایک نقطے میں دنیا سمٹ گئی

جب بھی تنہائی کے احساس سے گھبراتا ہوں
میں ہر اک چیز میں تحلیل سا ہو جاتا ہوں

عتیق اللہ کی غزلیں جہاں انسان کے تمام حسی عناصر کو بیدار کرتی ہیں، وہیں ذہنوں کو جھنجھوڑ کر بھی رکھ دیتی ہیں۔ ان کی شاعری قاری کو خیالوں میں گم نہیں ہونے دیتی بلکہ ان کو دنیاوی آگہی اور دردانگیز سچائی سے آشنا کراتی ہے۔ جو اُن کی متحرک اور فعال ذہنیت کی علامت کو بیان کرتے ہیں۔ آسمان، افق، افق تا افق، فلک، چاند، ستارے، زمین، زندگی، شہر، روشنی، پہاڑ، ستارے، شب، رات، زمان و مکاں، نقش، نقشِ پا، موت، ظلمتوں، دشمنی، اینٹیں، حیات، سنگ، سنگ و خشت، دیوار، پیڑ، پودے، ٹکڑے، زخم، شور و شر، چیخیں، اندیشہ، چراغ، آنسو، بچھڑا وغیرہ الفاظ ان کی غزلوں میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ لفظیات اور استعارات و تراکیب کو دیکھ کر بھی ان کی شاعری سمجھنا زیادہ دِقت طلب نہیں ہے۔ عتیق اللہ کی شاعری میں ذات و کائنات کے گہرے تصورات، احساسِ فکر کی جدّت، جذبے کی متانت اور تخئیل کی پرواز، ذہنی اور تخلیقی مضمرات، داخلی اور خارجی واردات، معنی کی تہہ داری، معاشرے کی حقیقت سے خود شناسی اور قدرت کے کرشاتی حسن کے کئی پہلو پوشیدہ ہیں۔ عتیق اللہ نئی غزل کا تابندہ نام ہے جن کے کام کو ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

دہلی میں اردو زبان و شعر و ادب کے معماروں میں ایک جانا مانا نام صادق کا ہے۔ جو شاعری اور نثر دونوں میں صادقؔ کے نام سے لکھتے ہیں اور اسی نام سے مقبول بھی ہوئے ہیں۔ ان کا شمار دبستانِ دہلی کے بزرگ شعرا میں ہوتا ہے۔ اردو شاعری کو ان کی بہت دین ہے۔ صادق کی پیدائش اجین میں ہوئی۔ لیکن انھیں دہلی کی آب و ہوا کافی راس آئی۔ تحقیق، تنقید، طنز و مزاح، افسانہ، ترجمہ، نظم، غزل گوئی موضوع ان سے اچھوتا نہیں ہے۔ مصوری بھی ان کے بہترین مشاغل میں شامل ہے۔ شاعری میں جن خیالات کی عکاسی کرتے ہیں، بعض اوقات اس کی تصویر کشی فنِ مصوری سے بھی کر دیتے ہیں۔ ہندی زبان کے نامور شعرا میں صادق کی گنتی ہوتی ہے۔ ادب کے گروہ بندیوں سے ان کا دامن صاف ہے۔ ناموری کے لیے نہیں لکھتے بلکہ ایمانداری، جذبۂ خلوص اور بے لوثی سے اردو زبان اور شعر و ادب کی خدمت گزاری میں لگے ہوئے ہیں۔ ادب میں ان کی تحریروں کو اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔

صادقؔ کے اب تک کل پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جس میں ''دستخط''، ''سلسلہ''، ''کشاد''، ''غزلیں، نظمیں، گرد آلود'' اور ''خواب کے جلنے کا منظر'' قابل ذکر ہیں۔ لیکن آخر الذکر مجموعے سے قطع نظر سب بیسویں صدی ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ صادقؔ کی غزلوں کا کوئی مجموعہ اس صدی میں ابھی تک منظر عام پر نہیں آ سکا ہے۔ غزل کی بہ نسبت نظم پر ان کی توجہ زیادہ رہی ہے۔ در حقیقت غزل کہنے اور لکھنے کا سلسلہ ہنوز جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی غزل گوئی واقعی قابلِ داد ہے۔ صادقؔ کی شاعری کا سفر جاری ہے۔ نمونے کے طور پر ان کی حالیہ برسوں میں لکھی گئی چند غزلوں کے اشعار قارئین کی ذوق نذر:

کوئی انجام کہانی کا نظر میں رکھ کر
وہ اگر چاہیں تو آغاز بدل سکتے ہیں

نیام سے کھینچتے ہی یہ کیا ہوا بتلائے کوئی
خون یہ کس کا ٹپکنے لگا تلوار سے پھر

جو رشتہ پانچ عناصر کا تھا نبھاتے رہے
انہی کے بل پہ چلی جب تلک چلاتے رہے

جب بھی سچ کے حق میں کوئی فیصلہ ہو جائے گا
اک نیا ہنگامہ پھر اس پر کھڑا ہو جائے گا

صادقؔ کی شاعری اپنا ایک آزاد وجود اور شناخت رکھتی ہے۔ جس نے اس رنگ بدلتی دنیا سے اپنے موضوعات اخذ کیے ہیں۔ ان کا ایک ایک شعر ایک مفکر، جہاں دیدہ اور تجربہ ساز شاعر کی داخلی کیفیت، وجدانی محرک اور تخلیقی بصیرت کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ صادقؔ کی شاعری اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کی وجہ زندگی میں ایک ہی قسم کی ڈگر بار بار اختیار کرنا۔ زندگی آنکھ بند کر کے فیصلہ کرنے کا نام نہیں۔ انسان اگر چاہے تو اپنی زندگی، سوچ اور کام کو بہتر سمت عطا کر سکتا ہے۔ اگر اس کی نظر ماضی پر

بھی رہے۔ ماضی کے خوش گوار حالات و واقعات وحادثات اور تجربات سے فیض یاب ہونا جب کہ ناخوش گوار تجربات سے سبق لینا۔اس سے انسان اپنی زندگی کو ایک نیا رُخ، اور بہتر سمت کی طرف گامزن کرسکتا ہے۔صادقؔ کی شاعری میں انسانی زندگی کا ایک گہرا فلسفہ نظر آتا ہے اور اس فلسفے نے زندگی کے تجربات سے ذائقہ حاصل کیا ہے۔ان کی غزلوں میں اس بھیڑ بھاڑ والی دنیا میں جہاں انسان کی پہچان گم ہے، انسانیت بس نام کی چیز رہ گئی ہے، جہاں ہر گھر میں بٹوارہ ہورہا ہے، بھائی چارگی، سالمیت اور یکجہتی کا نام نہیں، چھوٹے چھوٹے معاملات پر خون ریزی پر اتر آنا،صبر واستقلال اور جذبات کو قابو کرنے کی سکت میں کمیابی، جہاں ہر شخص کو جان کا خطرہ لاحق محسوس ہو، زمانے کی آب وہوا ہی انجان محسوس ہورہی ہو،تو بھلا شہر میں امن وامان کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔اب تو ہمدردی کی آس رکھنا محال ہے کیونکہ اب زبان نہیں تیر ونشتر بولتے ہیں۔غرض فطرت انسانی کا مطالعہ اور مشاہداتِ زندگی کا گہرا ادراک صادقؔ کی شاعری میں ضم ہوکر رہ گیا ہے۔

صادقؔ کی غزل گوئی میں قدروں کی پامالی،تہذیب وثقافت کے مٹتے دھارے، انسانی بقا کے زوال کا اندیشہ،خون ریزی اور قتل وغارت گری کی چیخ و پکار، اپنائیت اور وقت کی قدر وقیمت کا احساس،ظالم اور بدخواہ عناصر سے بچنے کی تلقین،خودغرضی اور لاچاری کی جھلکیاں، جاں نثاری اور حوصلوں میں ولولہ پیدا کرنے کی مثالیں، سچائی اور انصاف پرستی کی ناقدرشناسی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔صادق کی غزلیں اس عہد کی حقیقی آئینہ دار ہیں۔

شجاع خاور بیسویں صدی کے اردو کے ایک باکمال اور جیالے شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔صرف ایک نظر میں ہی اُن کے کلام کی پہچان ہوجاتی ہے۔اردو میں ایسے بہت کم شاعر گزرے ہیں جن میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، اکبرؔ الہ آبادی، اقبالؔ، فیضؔ، پروین شاکر وغیرہ شامل ہیں۔شجاع خاور کی زندگی کے آخری چند سال بڑی مشکل سے گزرے۔وہ جسمانی طور معذور ہوگئے تھے۔لیکن ایسا نہیں کہ ان کا کلام اکیسویں صدی میں شائع نہ ہوا ہو۔نئی صدی میں بھی ان کا کلام رسائل وجرائد کی زینت بنتا رہا ہے۔ان کے شعری مجموعوں میں ''اللہ ہو''، ''دوسرا شجر''، ''رشکِ فارسی''، ''غزلیہ''، ''مصروع ثانی'' اور ''وادین'' خاص ہیں۔شجاع خاور

نے شاعری کی الگ راہ نکالی اور زندگی بھر اسی ڈگر پہ چلتے رہے۔ انھوں نے دہلی کی ٹکسالی زبان کو اچھا خاصا برتا ہے۔

شجاع خاور کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی کلاسیکی اور نو کلاسیکی غزل میں مانوس الفاظ کو جوں کا توں استعمال نہیں کیا بلکہ ان لفظیات کو اس ڈھنگ سے برتا ہے کہ یہ جانے پہچانے الفاظ نامانوس لگنے لگے۔ ان میں ایک اجنبیت محسوس ہوتی ہے اور ان کی غزل میں تازگی اور نیا پن جھلکنے لگتا ہے۔ ان کی غزلیں ہر کس و ناکس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں کیونکہ ان کی شاعری اپنے خالق کا اظہار کرتی ہے۔ شجاع خاور کی شاعری میں ایسے اشعار کی بہتات ہے جو ان کی زندگی کے تجربات، ذہن، روّیہ، جذبہ اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ سنجیدہ روّیہ، شوخ مزاجی اور طنز میں ڈوبا ہوا لہجہ ان کی شخصیت کو بیان کرتے ہیں۔ ان چیزوں کو انھوں نے اس طرح فن کارانہ اور آزادروی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جس کے مطالعے سے ایک خوش گوار ذائقہ اور مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ شجاع خاور کی شاعری کو سمجھنے کے لیے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

لوگ بدلیں تو بدل جاتے ہیں سب پانی ہوا
شہر اپنا بھی ہو تو لگتی ہے بیگانی ہوا

تنہائی ایک اور مزہ لوٹ رہا ہوں
مہمان میرے گھر بہت آئے ہوئے ہیں

تھوڑا سا بدل جائے تو تاج ہو اور تخت
اس دل کو مگر کیا کریں سنتا نہیں کمبخت

مزے کی بات ہے دنیا مجھے مردہ سمجھتی ہے
اور مجھے اپنے سوا کوئی بھی زندہ نہیں لگتا

اب تو خیر اپنی طبیعت کا بھی معلوم نہیں
پہلے ہم سارے زمانے کی خبر رکھتے تھے

اردو شاعری کے محبوں اور عاشقوں میں شجاع خاور اپنے طنزیہ و تیکھے لہجے، بے باک و بے خوف انداز، چٹیلے و تمسخرے پن، بے محابہ پیرایۂ اظہار و بے لاگ اندازِ فکر، خوش مزاجی و بے ساختگی کے احساس، اسلوب کی شگفتگی و اظہار کی برجستگی، بحور و اوزان کے برتنے کے غیر معمولی عمل، انقلابی و باغیانہ جہت اور عشق و عاشقی کے متقی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اردو فکشن کی عہد ساز ادیبہ قرۃ العین حیدر شجاع خاور کی شاعری پر بات کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"شجاع خاور کا کمال یہ ہے کہ ان کے کتنے ہی اشعار حوالے کے طور پہ کوٹ کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے اشعار کبھی بے جان نہیں ہوتے، ان میں فکر، برجستگی اور ذات بیانی کے عناصر بیک وقت ملتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔"

(رشکِ فارسی از شجاع خاور، 1993، ص186)

قرۃ العین نے شجاع خاور کو قلندر شاعر بھی کہا تھا کہ شجاع خاور کی شاعری میں قلندروں کی سی گونج سنائی دیتی ہے۔ شجاع خاور کی شاعری میں ان کے قلندرانہ شخصیت کا احساس جگہ جگہ ہوتا ہے۔ جب کہ قرۃ العین حیدر کے اس نظریے سے شجاع خاور کے شعری وقار کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں کا اسلوب جدا، لب و لہجہ جدا، معنویت جدا، احساسِ فکر جدا، پیرایہ اظہار جدا، مزاجِ سخن جدا اور ساتھ ہی طرز شوخ بیانی تک جداگانہ اہمیت کی حامل ہے جس میں ان کی پیروی کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا نظر آتا ہے۔ ایسے لوگ آج کے زمانے میں بہت کم ملتے ہیں جو دوٹوک اور کھرے لفظوں میں سچائی بیان کرتے ہیں۔ دراصل طنز ہی شجاع خاور کی شاعری کی بنیادی پہچان ہے، سماجی شعور سے انھیں خدا واسطے کا بیر ہے جس کا انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم اپنے ایک مضمون "معاصر اردو غزل: منظر اور پس منظر" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سہل ممتنع کی پیش کش اردو غزل کے لئے نئی نہیں ہے۔اس سلسلے میں چند شعرا نے اپنی فنی مہارت کا پورا پورا ثبوت فراہم کیا ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سہل کہنا اور شعریت پیدا کرنا بڑا دشوار عمل ہے۔ذرا سی لغزش اچھے خاصے شعر کو نثر بنا دیتی ہے۔شجاع خاور کی شاعری کا ایک اہم وصف عصرِ حاضر کا منظر نامہ ہے۔ان کی گرفت عروض پر بھی بڑی مضبوط ہے،وہ عام اوزان سے ہٹ کر بحور و اوزان کا بھی خوب استعمال کرتے ہیں۔اُن کے لہجے میں قلندرانہ بے نیازی نمایاں ہے۔زبان و بیان کی سادگی اور روانی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔اعلا و ارفع خیالات کو بھی وہ عام فہم الفاظ میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔''

(کتاب نما،جلد،56/شمارہ،6/جون2016،ص16)

پروفیسر صغیر افراہیم کے درج بالا تنقیدی اقتباس سے شجاع خاور کی شاعری کا ایک مخصوص پہلو بہت حد تک واضح ہو گیا ہے۔اس میں کم لفظوں میں شجاع خاور کی شاعری پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔شجاع خاور جدیدیت کے قائل بھی ہیں اور بے معنی جدیدیت کی فیشن پرستی کے مخالف بھی۔سیدھے سادے متین الفاظ ان کے یہاں نہیں ملتے ہیں۔لفظوں کی تکرار اور غیر معنوی عناصر کی بھرمار بھی ان کے یہاں نہیں۔شجاع خاور صاف دل کے مالک تھے،بغض و کینہ پروری سے پاک تھے۔شجاع خاور کی شاعری ان کی ذات بیانی کا بہترین نمونہ ہے۔

شاہد ماہلی دبستانِ دہلی کے ایک ممتاز اور نامور شاعر ہیں۔جنھوں نے 1960 کے آس پاس اردو شاعری میں طبع آزمائی کی۔اس صدی میں ان کے دو شعری مجموعے ''کہیں کچھ نہیں ہوتا'' اور ''شہر خاموش ہے'' شائع ہو چکے ہیں۔اس سے پہلے ''منظر پس منظر'' اور ''سنہری اداسیاں'' شائع ہو کر قارئین سے بے انتہا داد وصول کر چکے ہیں۔ان شعری مجموعوں میں غزلیں اور نظمیں ہیں اور دونوں اصناف پر ان کو بھرپور مہارت حاصل ہے۔لیکن شاہد ماہلی غزلیہ شاعری ہی کو اپنے افکار و خیالات، اظہار اور دربست کا وسیلہ تصور کرتے ہیں۔جس

میں انھیں بڑی حد تک فنی اختصاص بھی حاصل ہے۔ اردو کے مشہور شاعر ندا فاضلی کے بقول ''انھوں نے کسی عصری فیشن یا اشتہاری روّیے کو نہیں اپنایا، اپنا موضوع خود اپنی ذات کو بنایا اور جو، جس طرح محسوس کیا، اسی کو اپنے الفاظ میں دکھایا۔'' شاہد ماہلی بڑی سادگی کے ساتھ غزلوں کے ذریعے اپنی دل کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ دل کی کیفیت ان کے ظاہر و باطن کے امتزاج سے منعکس ہوئی ہے۔ جس کا ان کی زندگی میں بڑا اہم رول رہا ہے اور اسی حقیقت کو شائستگی اور سچائی کے ساتھ تخلیقی انفرادیت کا وصف عطا کر کے شاعری کے پیکر میں ڈھال کر جاوداں بنا دیتے ہیں۔ شاہد ماہلی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

حاشیے پر کچھ حقیقت کچھ فسانہ خواب کا
اِک ادھورا سا ہے خاکہ زندگی کے باب کا

مطمئن کوئی نہیں نامۂ اعمال سے آج
مُسکراتا ہے خدا سارے پیمبر چُپ ہیں

غم کی تہذیب، اذیت کا قرینہ سیکھیں
آؤ اس شہر میں جینا ہے تو جینا سیکھیں

بچھڑ گیا تھا تپتی دھوپ کے سہرا میں
اک برگد کی چھاؤں سے نکلا سناٹا

مندرجہ بالا شعر صرف نمونے کے طور پر دیے گئے ہیں تا کہ شاہد ماہلی کی عصری شاعری کی معنوی جہت سے ایک قاری آشنا ہو سکے۔ اس طرح کے یا دیگر موضوعی نوعیت کے کئی اشعار سے شاہد ماہلی کی شعری جہات و شخصیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مظہر امام شاہد ماہلی کی شاعری پر اپنے ایک تبصرے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاہد ماہلی کا سماجی اور ثقافتی شعور حیات و کائنات کے سفید و سیاہ کی

ماہیت کو شعری لباس عطا کرنے کا ہنر جانتا ہے۔اُن کی غزلوں میں اُن کی شعری شخصیت کا بے محابا اظہار ہوا ہے۔وہ کسی پسندیدہ شاعر یا معروف رجحان کا اتباع نہیں کرتے بلکہ روشِ عام سے الگ ہو کر اپنی غزلوں کو ایک انفرادی جہت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔''

(نگاہِ طائرانہ از مظہر امام،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی،2007،ص197)

شاہد ماہلی کے شعری مجموعے''کہیں کچھ نہیں ہوتا''میں شامل ندا فاضلی کا مضمون ''شاہد ماہلی:اپنی مہابھارت کا شاعر''اور''شہر خاموش ہے''میں شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچہ اور شمیم حنفی کے مضمون''ایک شخصی رزمیے کا بیانیہ''سے شاہد ماہلی کی شاعری کا اچھا خاصا ادراک ہوتا ہے۔شاہد ماہلی کی شاعری میں نہ صرف تجربے کی تازگی پائی جاتی ہے بلکہ اس میں تخلیقی حسن بھی موجود ہے۔ان کی شاعری میں مختلف النوع عصری موضوعات ان کی وسیع النظری کے عکاس ہیں۔شاہد ماہلی سہم سہم یا ڈر ڈر کے شعر نہیں کہتے بلکہ منفرج ذہن سے داخلی جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔انھوں نے عصری ماحول اور تہذیب سے متاثر ہو کر جو کچھ بھی لکھا وہ ان کے کشادہ ذہن کے آئینہ دار ہے۔ان کے عصری شعور نے حقیقت اور داخلیت کو دبانے کا کام نہیں کیا، بلکہ ان کے اندر اضطراب اور تلاطم کے مادّے کو جنم دیا۔

غزل میں شاہد ماہلی تجربات کا بیان براہِ راست کرتے ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی کے یہ الفاظ شاہد ماہلی کی غزل گوئی پہ صادق آتے ہیں کہ''اپنی مایوسیوں،شکستوں اور فریب خوردگیوں کا ذکر ان کے یہاں ایک عجیب تلخی اور ایک غمگین بیچارگی کے ساتھ ہوا ہے۔زندگی اور محبت اور موت ان کے لئے کسی لطف یا کامیابی کا امکان نہیں رکھتیں۔شاہد ماہلی کی غزلوں میں انسان سب کچھ دیکھ کر اب چپ چاپ بیٹھا ہوا گذشتہ اور حال یکجا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''فاروقی صاحب کے مذکورہ الفاظ شاہد ماہلی کی شاعری کو سمجھنے میں ہماری کافی حد تک رہنمائی فرماتے ہیں۔ہمیں یہ ماننے میں کوئی تامل نہیں کہ شاہد ماہلی دورِ حاضر کے اہم شاعر ہیں جو مختلف النوع موضوعات کو اپنی غزل گوئی میں برتنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

چودھری وجیہ الدین جو ادبی دنیا میں شہپر رسول کے قلمی نام سے مشہور ہیں۔پچھلی

پانچ دہائیوں سے اردو کے شعری اُفق پر اپنی تخلیقی شفق سے سحر انگیزی پیدا کر رہے ہیں۔ پیشے سے مدرس ہیں اور پروفیسر شہپر رسول کے نام سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ تنقید کے علاوہ شعری تخلیقات سے اردو ادب کو وسعت بخش رہے ہیں۔ آٹھویں دہائی کے اخیر اور اکیسویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائی میں ان کے دو شعری مجموعے بالترتیب ''صدف سمندر'' اور ''سخن سراب'' شائع ہوئے جو ان کی شہرت کا سبب بھی بنے ہیں۔ ان دونوں مجموعوں میں غزلیں ہیں۔ شہپر رسول غزل کے شاعر ہیں۔ غزلیں لکھنے اور کہنے کا یہ مشغلہ آج بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ شہپر رسول شعر و سخن کی محفلوں، ادبی پروگراموں، مشاعروں اور سیمیناروں میں اپنے کلام سے قارئین کے دِلوں میں اس قدر گرماہٹ اور حرارتِ ذوق وشوق پیدا کرتے ہیں کہ سب کی زبان سے واہ واہ نکلنے لگتی ہے۔ اس طرح قارئین شاعری کی مالا جھپنے لگنے لگتے ہیں اور اردو زبان کی شیرینی کی داد دینے لگتے ہیں۔ جی ہاں! یہ شہپر رسول کے کلام کا ہی وصف ہے جو ہمیں مسرت و شادمانی، حسرت و زیست کا سبق اور زندگی و کائنات کے اسرار رموز سے آگہی دلاتا ہے۔ ان کی شاعری پر بات کرنے سے پہلے ان کے نمونہ کلام سے لطف اندوز ہوتے ہیں:

ایک ہی انداز میں لکھی کتابِ زیست کیوں
ہر کہانی عہدِ نو کی کیوں بلا عنوان ہے

نہ کوئی خواب، نہ ماضی، ہی مرے حال کے پاس
کوئی کمال نہ ٹھہرا مرے زوال کے پاس

پرچھائیاں تھیں شہر میں لیکن صدا نہ تھی
شاید فضا میں مٹی برابر ہوا نہ تھی

مجھے بھی لمحۂ ہجرت نے کر دیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے قدم سفر کی طرف

شہپر رسول شہرِ غزل کے نمائندہ شعرا میں ایک اہم نام ہے۔ان کا شعری لب و لہجہ بھی دیگر شعرا کی بہ نسبت جداگانہ ہے۔اوپر جو اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ان سے شہپر رسول کے شعری اظہارِ بیان کا مدعا و مقصد اور معنی و مفہوم بہت آسانی سے واضح ہو جاتا ہے۔ان کی شاعری میں اکثر اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جہاں وہ اپنی بات اشاروں اور کنایوں میں رکھتے ہیں۔ان کے یہاں بعض اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں وہ عصری حسیت کو ملحوظ رکھ کر نئے نئے استعاروں، علامتوں، تلمیحوں اور پیکروں کی جہاں آباد کرتے ہیں۔لیکن معنیاتی نظام سے چشم پوشی ہر گز نہیں کرتے۔قاری ان کی شاعری کی قرأت اور معنی و مطلب کی جستجو میں مبتلائے سوچ میں پڑ جاتا ہے،فکر کی گہرائی میں جاتا ہے اور بالآخر معنی کی تہہ تک پہنچنے کے بعد حقیقت سے آشنائی حاصل کرتا ہے۔دراصل شہپر رسول کا انداز شاعری فلسفیانہ ہے۔کسی کو اس بات کا اعتراف ہو نہ ہو مگر ہمیں ہے۔

شہپر رسول کی شاعری میں معنی اور فکر کی بلندی، زبان و بیان کی ندرت اور فکر و خیال کی وسعت اپنی انفرادیت کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔ان کی شاعری مشکل پسند، پُر پیچ، نامانوس اور دِقت آمیز معلوم نہیں ہوتی۔کیونکہ وہ غیر ضروری لفاظی اور شعری کرتب بازیوں سے اپنا دامن صاف و پاک رکھتے ہیں۔سلاست، فصاحت، شستگی اور روانی ان کی شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔جیسا کہ مذکور ہوا ہے کہ ان کی غزل گوئی بظاہر سادہ اور آسان معلوم ہوتی ہے لیکن جب تک ان کی معنی کی تہہ تک نہ پہنچا جائے،شعر کے مطلب تک آسانی سے رسائی نہیں ہو سکتی۔تخلیقی اور تجرباتی ،فکر مندی، احساساتی طور پر ان کے یہاں معنویت کے نئے راز افشاں ہوئے ہیں۔ان کے شعر کا مرکزی حوالہ ان کی شخصی واردات ہے۔شاعری کے لیے سخت لہجہ استعمال نہیں کرتے ، بلکہ شائستگی کے ساتھ اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔طنز اور ملال کی کھنک بھی ان کے شعری لہجہ میں بخوبی ملتی ہے۔بقول شمیم حنفی "طنز اور ملال حتیٰ کہ انسانی تجربوں کی طرف Irony کا ایک گہرا تاثر قائم کرنے کے باوجود اُن کے اشعار میں غنائیت کی دھیمی لہر اور شائستگی کی قدر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔" عہدِ نو کے حالات و واقعات کی انھوں نے بھر پور ترجمانی کی ہے۔ان کی شاعری میں جو بیشتر الفاظ جلوہ گر ہوئے ہیں ان

میں ہجر، وصل، وحشت، زخم، سمندر، خون، سفر، مفر، اضطراب، امکاں، انا، صحرا، خوشبو، ہوا، چراغ، وغیرہ استعمال ہوئے ہیں جن سے ان کے شعری رنگ وآہنگ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

شہپر رسول کی شاعری سوچ میں ڈوبی ہوئی اور غور وفکر میں محو ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ آج کے زمانے میں ہر انسان حالات کا مارا ہوا ہے۔ حالات خراب سے خراب تر ہوتے جارہے ہیں۔ زندگی کا ہر موڑ دشوار کن ثابت ہورہا ہے۔ بے ایمانی، بدعنوانی، جبر واستحصال، دہشت زدگی، وحشت ناکی اور لاتعداد مسائل ومصائب وغیرہ عروج پر ہے۔ تغیر کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ انھوں نے ہجرت کو ایک المیہ قرار دیا ہے۔ یہاں تقسیم آزادی کی ہجرت سے مراد نہیں ہے بلکہ تلاشِ معاش کے سبب کی جانے والی ہجرت ہے۔ شہپر رسول کی شاعری میں ناصحانہ رنگ بھی ہے، کسی کی کڑوی اور تلخ باتوں پر نہیں جانا چاہیے اس میں ہماری بھلائی بھی مخفی ہوسکتی ہے۔ انسان کی زبان کو نہیں چہرے کو پڑھنا ہنر ہے کیونکہ زبان کے معنی و مفاہیم بدلتے رہتے ہیں۔ موجودہ عہد میں انسان لاتعداد مسائل سے دوچار ہے۔ اس طرح شاعر کے لیے بے شمار موضوعات ہیں۔ یہ عہد رسمی وروایتی طرز سخن کا نہیں بلکہ ایک نئے اندازِ سخن کا متقاضی ہے۔

شہپر رسول نے اپنی شاعری میں ظالم وجابر طاقت کی شناخت، شہر کی مشینی زندگی، اقدار کی پامالی اور شکست خوردگی، ذرائع بلاغ نیز باہمی انسانی ترسیل کے فقدان، ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے رشتوں کی شیرازہ بندی وغیرہ کا احساس دلایا ہے۔ شہپر رسول نے اپنے عہد کو ہر پہلو سے دیکھا ہے، ہر زاویۂ نظر سے پرکھا ہے۔ انھوں نے اس کا نہ صرف مطالعہ ومشاہدہ کیا بلکہ تجربے کی بنیاد پر کئی نئے تاثران کے ذہن پر مرتسم ہوئے ہیں۔ انھی خیالات کو انھوں نے تخلیقی زبان دے دی اور معانی کی نئی نئی جہتیں روشن کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح شہپر رسول اس صدی کے ایک کامیاب شاعر قرار دیے جاسکتے ہیں جنھوں نے اس عہد کی اپنی غزل گوئی کے ذریعے مکمل ترجمانی کی۔

خالد محمود دبستانِ دہلی کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ انھیں بیک وقت ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کا شرف حاصل ہے جس میں تحقیق، تنقید، انشائیہ، سفرنامہ، ترجمہ،

شاعری شامل ہیں۔خالد محمود عرصۂ دراز سے شاعری کے میدان میں غوطہ زن ہیں۔اتنا ہی نہیں تحقیق و تنقید کی طرح شاعری کی کئی اصناف کے بھی شہسوار ہیں اور ان کا یہ شعری سفر آج بھی رواں دواں ہے جس میں وہ اپنی طرز کے خود مالکِ حقیقی ہیں۔ان کے اب تک دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جس میں ''سمندر آشنا'' اور ''شعر چراغ'' قابل ذکر ہیں۔اکیسویں صدی میں ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہو سکا ہے لیکن اب ایک شعری مجموعہ زیر اشاعت ہے۔انھوں نے نظمیں بھی بڑی تعداد میں کہی ہیں لیکن غزل گوئی میں انھیں ایک خاص اختصاص اور وقار حاصل ہے۔عصری سچائیوں اور جمالیاتی محسوسات کو اپنی غزلیہ شاعری میں برتتے ہوئے موصوف زبان کے تخلیقی امکانات اور گہرے ادراک و شعوری بصیرت کو بروئے کار لاتے ہیں جو ان کے لہجے میں انفرادیت کے نقوش بھی روشن کرتا ہے، ساتھ ہی ساتھ حواسِ خمسہ کے بیدار و فعال ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔عصر حاضر میں کہے گئے ان کے کچھ غزلیہ اشعار قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی نذر ہیں:

کل کیوں گرتا ہے آج گر جائے
کون سا اِس مکاں میں رہنا ہے

کتنی آسانیاں میسر ہیں
کتنا مشکل جہاں میں رہنا ہے

موت کا ایک دن معین ہے
زندگی دسترس سے باہر ہے

میں گنجان شہروں کا مارا ہوا
نوازش نوازش نوازش ہَوا

سورج، ستارے، کوہ و سمندر، فلک، زمین
سب ایک کر چکا ہے یہ گز بھر کا آدمی

خالد محمود نے عہد حاضر کی انسانی زندگی اور اس کی تہذیبی شناخت کی عکاسی نہایت شستہ زبان اور اپنی نوعیت کے ایک منفرد اسلوب میں کی ہے۔ جس میں معنی کی جلوہ آفرینی، جمالیاتی تجربات و مشاہدات اور رومانیت کی فکری رنگارنگی اپنا سحر دکھاتی ہے۔ عصری تقاضوں کے مطابق ان کے یہاں جذبہ پیکر تراشی کے نمونے بھی ملتے ہیں اور کلاسیکیت کی زندہ تعبیرات کو بھی نئے مفاہیم کا جامہ پہنا لیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبے کی آنچ اور فکر کی گہرائی نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ روانی اور تازگی بھی برقرار رہتی ہے۔ خالد محمود کی سادہ لوحی، جذبے کی شدت، خیالات کی پاکیزگی، کردار کی سچائی اور رنگارنگ طبیعت کا میلان ان کی شاعری کی جان ہے جو صاحبِ ذوق کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور اچھے شاعر کی دنیائے اردو میں آمد آمد کی بشارت دیتے ہیں۔

خالد محمود ایک خوش گو شاعر ہونے کے علاوہ ایک باصلاحیت اور تجربہ کار مدرس بھی ہیں، اس لیے انھیں الفاظ و معنی کی مزاج شناسی اور فکر و فن کی غواصی بھی حاصل ہے۔ وہ اپنے منتخب الفاظ و تراکیب سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اشعار میں ایسی نغمگی اور موسیقیت پیدا کرتے ہیں جو دِلوں کو مسحور اور دماغ کو معطر کر دیتے ہیں۔ ان کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ سماج اور انسان کی زندگی اس دور میں ان کے موضوعات رہے ہیں۔ بقولِ شہپر رسول:

> ''خالد محمود کی غزل میں نئی زندگی کے آلام و مصائب، حادثوں، واقعوں، شکستوں اور خواب شکن کیفیات کا اظہار تو ملتا ہے لیکن مایوسی کی فضا کے لیے ان کے شعری روّیے میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ انھوں نے مذکورہ حالات و کیفیات سے صبر و شکر اور قناعت کشید کرنے کا فن سیکھا ہے۔''
>
> (خالد محمود نمبر، سہ ماہی انتساب، ستمبر 1998، ص 163)

خالد محمود ایک بلند آہنگ اور بے باک لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ انھوں نے رنگِ تغزل کو بھی اپنے اشعار میں جدید علامتی انداز میں سمویا ہے۔ دورِ حاضر میں موجود رشتوں اور رابطوں میں خلوص و محبت کا فقدان، دم توڑتی اپنائیت اور منافقت کا جو اندازِ یار، رجحان منعکس

ہوا ہے وہ بھی خالد محمود کی غزلیہ شاعری پر غالب ہوا ہے۔ ان کی غزل گوئی دوربینی اور خوش فکری کے علاوہ عصرِ حاضر کے حقائق کا پتہ دیتی ہے۔ خالد محمود اس عہد کے ایک البیلے شاعر ہیں جو اپنے اندر قارئین کے ایک بڑے حلقے کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ابوالفیض عزم سہریاوی دہلی میں اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ لیکن افسوس کہ لوگ ابھی ان کے نام سے زیادہ واقف نہیں ہے کیونکہ وہ بے نام و نمود اردو شعر و ادب کو اپنی تخلیقات سے وسعت بخشنے میں مصروف ہیں۔ درس و تدریس کے پیشے سے تو ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن شعر و ادب کے تئیں ان کی دلچسپی جس قدر پہلے تھی۔ اس سے کئی گنا زیادہ شدت اس مشغلے میں ان کے اندر آج بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ زودِ گوئی اور یاداشت کا یہ عالم ہے کہ ایک شعر سننے کی فرمائش کریں تو یکا یک الگ الگ موضوعات سے متعلق مختلف النوع شعر ان کی زبان سے نکلتے ہیں۔ زبان میں کوئی جنبش نہیں، گویا کاغذ یا ڈائری پر پہلے سے لکھے ہوئے اشعار پڑھ رہے ہوں۔ معاصرین شعرا اور شاگردوں کی قدر کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ مخلصی، دردمندی، ہوش مندی سے بھی اللہ نے انھیں خوب نوازا ہے۔

عزم سہریاوی چھپن سال سے دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کا تخلیق کیا ہوا پورا کلام اکیسویں صدی کی اِن دو دہائیوں کے اندر ہی شائع ہوا ہے۔ جو چار مجموعۂ کلام ''سحابِ رحمت''، ''طلوعِ سحر''، ''مشعلِ راہ'' اور ''سدرۃ المنتہیٰ'' پر مشتمل ہے۔ مزید ایک شعری مجموعہ زیرِ طبع ہے جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شاعری ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہی ہے اور شاعری کی جتنی بھی اصناف دعا، حمد، نعت، منقبت، مناجات، قطعات، نظم، غزل، گیت دوہے، متفرقات وغیرہ ہیں۔ ان سب میں انھوں نے اپنے قلمی جوہر دکھائے ہیں اور تا حال مشقِ سخن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ 1973 کے بعد نظموں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہنی شروع کیں جو بڑی آب و تاب کے ساتھ آج بھی جاری و ساری ہے۔ ان کی غزلیں رسائل و جرائد اور اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔

عزم سہریاوی غزل گوئی میں اپنا ایک منفرد لہجہ رکھتے ہیں۔ ان کا لہجہ کھردرا اور غیر مانوس نہیں۔ انھوں نے غزل کی نزاکت اور نفاست کو ملحوظ رکھا ہے اور کسی بھی جگہ یہ محسوس

نہیں ہوتا ہے کہ مصنوعی لہجہ اختیار کر کے قاری پر رعب ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ بالکل مانوس اور پاکیزہ خیالات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ عزم سہریاوی حسّیاتی پیکر تراشتے ہیں، الفاظ میں نئی لوچ اور دل کی دھڑکن سموتے ہیں اور اظہارِ ذات کے لیے تحیر آمیز، استعارے، تشبیہیں اور تلازمے وضع کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات طے شدہ نہیں ہے بلکہ زندگی اور حالات کا عکس ان کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس طرح ان کی غزلوں میں زندگی اپنے بھرپور حسن، مسائل، آرزو اور جستجو کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔ عزم سہریاوی کی غزلوں میں ایک پیغام، بدلتی ہوئی قدروں کا نوحہ، تہذیب و تمدن کی کھوئی ہوئی شناخت، شکست و ریخت کا احساس، اقتصادی و معاشرتی بحران کا غم، عدل و انصاف کی پیروکاری، سیاسی حکمرانوں کی چالبازی، جعل سازی اور بازی گری، شر پسند اور فتنہ پرور لوگوں کو تہِ تلوار کر دینے کا عزم، انا پرستی اور خودغرضی سے باز رہنے کی تلقین، حق گوئی، صداقت شعاری اور ایمانداری میں پختگی پیدا کرنا وغیرہ موضوعات پنہاں ہیں۔ ان کے یہاں انسان کے تمام جذباتی رشتوں کے علاوہ حیات و کائنات کے متنوع مضامین ملتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بعض اشعار ایسے ملتے ہیں جو دل و دماغ کو معطر اور روح کو سکون عطا کرتے ہیں جو حوصلہ، جوش اور امنگ میں ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ جو دنیا میں رہنے کے آداب، تہذیب اور سلیقہ مندی سکھاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نئی زندگی کے نت نئے پہلوؤں، اہم اور پیچیدہ میلانات اور مطالبات سے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ انسانی زندگی کے مسائل، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تجربات سے روشناس کراتے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

وہی دراصل روزی ہے ملے جو جانفشانی سے
مشقت کے پسینے کا مزہ کچھ اور ہے ساقی

سیاست کی ابھی بازی گری آئی نہیں مجھ کو
وگرنہ میں بدل دیتا تیری سرکار چٹکی میں

بڑے تنگ دل ہیں بہت تنگ دامن
جو کرتے ہیں کم اور جتاتے بہت ہیں

سنا ہے آپ کی محفل میں کچھ اپنے بھی رہتے ہیں
ادھر سے جب بھی آتی ہے ہوا کچھ اور کہتی ہے

عزم سہریاوی کے سب کے سب اشعار زندگی کو اپنے وسیع مفہوم میں اور معنی کی نئی جہتوں سے شرابور کر گئے ہیں۔ان کے یہاں کہیں کہیں دھیما لہجہ ملتا ہے اور کہیں کہیں لہجے میں بڑی گھن گرج سنائی دیتی ہے۔لیکن کہیں بھی غور وفکر، تدبر اور متجسس ذہن سے پنپنے والے تاثرات کو زائل نہیں ہونے دیتے اور نہ ان پر آنچ آنے دیتے ہیں۔الغرض ابوالفیض عزم سہریاوی کو اپنی انفرادی اور دلنشین غزل گوئی کے باعث کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔وہ ابھی بھی غزل گوئی کے اس صحرا میں سرگرم وکوشاں ہیں اور نئی غزل کو ایک نئی جہت وسمت عطا کرنے میں حسب معمول مشغول ہیں۔

فرحت اللہ خاں فرحت احساس پچھلی پانچ دہائیوں سے شاعری کی دنیا میں جلوہ افروز ہیں۔1970 کی دہائی کے بعد سے جن شعرا نے اپنے مخصوص شعری لب و لہجے،لسانی برتاؤ اور منفرد تخلیقی اظہار کی بنیاد پر اپنی ایک خاص پہچان اور ایک مستحکم شناخت بنائی ان میں فرحت احساس بھی ایک اہم اور قابلِ ذکر نام ہے۔صحافت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔باایں ہمہ شاعری کا گریباں نہیں چھوڑا۔شاعری ان کا ذوق ہے اور صحافت ان کا شوقیہ مشغلہ۔لیکن شاعری میں ان کو ایک خاص مقام حاصل ہوگیا ہے۔ان کے کل دو شعری مجموعے''میں رونا چاہتا ہوں''اور''شاعری نہیں ہے یہ''اب تک شائع ہوئے ہیں۔یہ دونوں مجموعے اکیسویں صدی میں منظر عام پر آئے ہیں۔

فرحت احساس اردو شاعری کی مضبوط و مستحکم روایت پر اپنی شعری اساس رکھتے ہیں۔ان کی شاعری سوچ اور فکر کو تخلیقی تجربہ کے بطور شعر میں پیش کرنے کی ہنرمندی کے سبب جدید ترین لسانی برتاؤ، معنوی پہلوداری اور فنی و جمالیاتی روّیوں کا جواز پیش کرنے والی

شاعری ہے۔فرحت کی شاعری بیک وقت زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہے اور اپنی تہذیبی جڑوں سے پیوست بھی۔ یہ شاعری اپنے معاشرے سے گلوخلاصی چاہتی ہے نہ اس سے بے زاری کا درس دیتی ہے۔ اس قسم کی شاعری سے تہذیبی تشخص کی جستجو ملتی ہے۔فرحت کی شاعری کسی نہ کسی سطح پر کلاسیکی غزل کی روایات کا پتہ دیتی ہے۔ روح عصر سے ہم آہنگ ہونے کے سبب فرحت کی شاعری ایک طرح کی تازگی رکھتی ہے۔ دوسرے معنوں میں کہہ سکتے ہیں کہ فرحت کا شعری عمل غزل کے نئے مزاج کی تشکیل کے ساتھ ساتھ روایت سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھتا ہے اور یوں فرحت کی شاعری روایت سے شعوری انحراف کے بجائے اس کی توسیع کا سبب بن جاتی ہے۔

فرحت احساس کی شاعری عہدِ حاضر کے حالات و واقعات اور رونما ہو رہے حادثات کا اچھا خاصا پتہ دیتی ہے۔انھوں نے انسان کی بے حِسی، حرص و آز، جہالت، گمراہی، لاعلمی، دہشت زدگی و بزدلی، زندگی کی بے قدری، تہذیب سے نارسائی، زمانے کی سرد و گرم ہوا وغیرہ کو شاعری کے توسط سے زبان دی ہے۔ان کے مندرجہ ذیل اشعار کی قرأت کر کے حظ اٹھائیں:

وہی ہوا جو میری زندگی چلاتی ہے
چراغ میرا خدا جانے کیوں بجھاتی ہے

جو لوگ جو حادثات کے ڈر سے گھروں میں بیٹھے ہیں
انھیں خبر ہو کہ گھر میں بھی موت آتی ہے

کرسی پہ بیٹھا آدمی اچھا نہیں لگتا مجھے
کیا جانے کیوں کچھ آدمی جیسا نہیں لگتا مجھے

اندر کے حادثوں پہ کسی کی نظر نہیں
ہم مر چکے ہیں اور ہمیں اس کی خبر نہیں

☙❧

فرحت احساس انسانی مسائل کو شدت کے ساتھ داخلی طور پر محسوس کرتے ہوئے انھیں ذات کے حوالے سے نئی زبان، نئے استعاروں اور نئی نئی علامتوں کے ذریعے اپنے شعری اظہار کا وسیلہ اور وطیرہ بناتے ہیں۔ ان کی شاعری میں طنز بھی ہے، تلخی بھی ہے، احتجاج بھی ہے اور حرکت بھی۔ لیکن مایوسی، محرومی اور نااُمیدی تک کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔ اس میں رنگارنگی اور تنوع ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری فرحت احساس کی شاعری کے حوالے سے یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''فرحت احساس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے معاشرے کی لسانی تصویر ہے اور اس کا اپنا منطقی جواز ہے اور اپنی طرح کی حسرتیں اور آرزوئیں۔ نہ مستعار حسن ہے نہ مستعار خیالات ہیں۔ سیدھے سچے اور کھرے تجربے پر مبنی اشعار ہیں''

(جواز و انتخاب: 80ء اور بعد کی غزلیں از کوثر مظہری، 2001، ص 98)

فرحت احساس کی شاعری میں ایک صحافی کی جھلک بھی کہیں کہیں نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے اشعار میں بعض جگہ صحافت میں استعمال ہونے والے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جنھیں بڑی خوبی اور سلیقے سے برتا گیا ہے۔ فرحت احساس نے حتی الامکان غزل کے رمزیہ انداز، اس کی نغمگی، نرم اور ملایم الفاظ، بحور کی نزاکت اور خیال کی صفائی کا خیال رکھا ہے۔ فرحت احساس کی غزل گوئی برسوں تک قارئین کے ذہنوں کو معطر کرتی رہے گی اور للچاتے دلوں کو دھڑکاتی اور زبان پر گنگناتی رہے گی۔ اس کے علاوہ ان کے شعوری و حسی عناصر کو متحرک کرتی رہے گی۔

محمد فاروق انصاری المعروف شہباز ندیم ضیائی نے پچھلے چالیس پینتالیس برسوں سے دہلی کے شعری منظرنامے پر اُبھرنے والے شاعروں میں لب و لہجے کی تازگی اور توانائی سے نہ صرف اپنے وجود کا احساس کرایا ہے بلکہ متاثر بھی کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ نئی نسل کے اس البیلے اور بقول اسلم جمشید پوری ''قلندر شاعر'' کی زندگی کا چراغ اسی سال گُل ہوگیا۔ انھوں نے اپنے پیچھے جو شعری سرمایہ چھوڑا ہے اُس میں ''جذبوں کی زبان''، ''شہباز''،

''وصالِ موسم''، ''اک چراغ تنہا سا''، ''معجزۂ نعت'' اور ''خوشبو چہرہ''، ''عشق ہے''، ''پس عشق'' قابلِ ذکر ہیں۔ ''اک چراغ تنہا سا''، ''خوشبو چہرہ'' اور ''عشق ہے'' نئی صدی کے تین شعری مجموعے ہیں۔ یہ سب ان کے غزلیہ شعری مجموعے ہیں۔ شہبازؔ ایک غزل گو شاعر ہیں اور غزل ان کی محبوب صنفِ سخن رہی ہے، ساتھ ہی ان کی پہچان بھی غزل کی وجہ سے ہی ہے۔ شہبازؔ کے چند اشعار پر ایک نظر ڈالیے:

عشق میں زندہ رہنے کا فن مسئلہ بن گیا
جذبۂ عشق میرے لیے اک سزا بن گیا

ہوا ہے جب سے کاسۂ سرمدی کم
خودی کم، بیخودی کم، سرخوشی کم

دیکھنے والی آنکھوں کی بینائی ہے گم دائرۂ حیرانی میں
کتنے ہی گرداب چن لیتے ہیں تیز و تند ہوا سے پانی میں

محسوس کیا میں نے تجھ کو، توحید کے سارے رنگوں میں
ابدالوں میں، مجذوبوں میں، مستوں میں اور ملنگوں میں

نئی زمینوں پہ بسنے والے، حسیں مکانوں میں رہنے والے
ہر ایک شئے سے بے خبر ہیں، نئے جہانوں میں رہنے والے

☙❧

شہبازؔ نے سادگی اور سلاست کے ساتھ اپنے اور دوسروں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے ہمیں غزل کے نئے میلانات سے واقف کرایا ہے جو بڑے لطیف انداز میں ہمارے جذبات کو متاثر کرتے ہیں جس سے ذہن کے پردے پر ایک نیا عالم اُبھرتا ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں تغزل کی وہ کیفیت موجود نہیں ہے جو بعد کے مجموعوں میں ہے۔ کوثر مظہری کی شاعری میں حُسن، رعنائی، دلکشی، زیبائی، خوبصورتی اور

جمال و جوبن بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی پوری شاعری میں عصری رُوداد ہے جو جیتے جاگتے ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔ شہباز دوسرے ہم عصر شعرا کی طرح سادہ پسندی کے قائل نہیں۔ وہ ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جو الفاظ کی تلاش، تراکیب کی ایجاد، استعارات کی اختراع اور محاوروں کے استعمال میں احتیاط برتتے ہیں۔ یہ اوصافِ شاعری بھی انھیں ایک الگ حیثیت قائم کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں غم کی شائستگی، اس دور کی تہذیب، روحانی اقدار کا پاس، عصری حسیت، عشق و عاشقی کی دیوانگی، رشتوں کی تحریم اور تقدیس، مکاری، دغابازی، مطلب پرستی، حرص وتمنا، انا پرستی، غفلت شعاری، دہشت زدہ انسانی قدروں کی بے حرمتی وغیرہ کی خوبصورت شکلیں نظر آتی ہیں۔ شہباز نے ہر موضوع کو کچھ اس طرح برتا ہے کہ اس میں نیا پن اور ایک مخصوص کشش پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی غزلیں اپنے مخصوص اسلوب، نت نئی تراکیب کے استعمال، زمینوں اور قوافی کے انتخاب اور تازگی و ندرت لیے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شہباز ایک جدید شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو نادر تشبیہات، حسین ترکیبات، بلیغ استعاروں سے معنویت کا ایک نیا رنگ وروپ عطا کیا۔

رؤف رضا دبستان دہلی کے ایک نمائندہ شاعر ہیں۔ راقم ان کے نام سے میں بذریعہ سوشل میڈیا (فیس بک) پر پچھلے دو سالوں سے واقف تھا۔ وہ فیس بک پر اپنے تازہ اور شگفتہ اشعار پوسٹ کرتے رہتے تھے جس پر ہم انھیں اکثر بیشتر داد دیتے تھے۔ ان کی شاعری کو پڑھنے کا اتفاق فیس بک ہی سے پہلی بار ہوا۔ انتقال سے صرف دو دن پہلے میں نے ان کے کسی شعر پر داد دی تھی جس کا انھوں نے فوراً شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ دو دن بعد جب فیس بک کا صبح صبح وصال ہوا تو ہشاش بشاش اور تندرست و توانا رؤف رضا کے اچانک انتقال کی خبر سن کر انگشت بہ دنداں رہ گیا۔ آج ان کی شاعری پر بات کرنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔

دبستانِ دہلی کی ادبی شخصیتوں میں رؤف رضا ایک ایسا نام تھا جو صاحبِ علم بھی تھے اور صاحبِ فن بھی۔ لیکن افسوس کہ وقت اور اپنوں نے ان کے ساتھ عجیب سا کھیل کھیلا۔ ہر چند کہ وہ مشاعروں کے کامیاب شاعر نہیں تھے لیکن پاک پروردگار نے انھیں شعر و

فکر کی خاص نعمت سے نوازا تھا۔ رؤف رضا دبستان دہلی کی ادبی روایتوں کے امین تھے۔ اُن کا شمار دہلی کے معتبر شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ادبی نزاکتوں اور اس راہ کے رموز سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ ان کے برتنے کا ہنر بھی خوب جانتے تھے۔ رؤف رضا کا اب تک ایک شعری مجموعہ ''دستکیں میری'' 2007 میں شائع ہوا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ زندگی کے آخری دنوں میں ایک اور شعری مجموعہ ترتیب دے رہے تھے۔ ''دستکیں میری'' سے کچھ شعر قارئین حضرات کی ذوقِ نذر کرتا ہوں:

یہ بستی تو مدت سے آسیبی ہے
نیندیں بیچنے والے تو نے سوچا کیا

تم بھی اس سوکھتے خواب کا چہرہ دیکھو
اور پھر میری طرح خواب میں دریا دیکھو

کچھ نیا باقی نہیں ہے مجھ میں
خود کو سمجھا کے سُلا دیتا ہوں

مہربانو مری آواز ذرا دھیمی ہے
میں بہت چیخنے والوں میں اُٹھا بیٹھا ہوں

---

رؤف رضا کا تذکرہ ''بیسویں صدی کے شعرائے دہلی'' (جلد اوّل) میں آیا ہے جس میں معروف کالم نگار عظیم اختر لکھتے ہیں:

> ''1970 کے بعد دہلی کے تنگ گلی کوچوں سے نوجوان شاعروں کی ایک نئی نسل ابھری ہے، جس کے لہجے کی تروتازگی اور شعری تیور دیکھ کر یہ احساس قوی ہوجاتا ہے کہ ان نوجوان شاعروں کے جلو میں خوبصورت، متاثر کن اور بڑی شاعری کا سورج طلوع ہو رہا ہے، رؤف رضا اسی نسل کا ایک

خاموش طبع اور سنجیدہ مزاج شاعر ہیں جو اسی شہر کے ادبی منظر نامے پر بڑی
سبک خرامی سے ابھرا ہے اور جس کے لہجے کی تازگی نے یہاں کے ادبی
حلقوں کو متاثر کیا ہے۔"

(بحوالہ ہفتہ وار، ہماری زبان، نئی دہلی، جلد ر 47، شمارہ ر 75، ص 1)

رؤف رضا نے شاعری کو اپنی شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا اور بہ الفاظِ دیگر اپنے لہجے کی تازگی اور متاثر کن شاعری کا استحصال نہیں کیا بلکہ وہ خاموشی کے ساتھ شعر و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ رؤف رضا کو دھیمے لہجے کا شاعر کہا جاتا ہے جس کا انھوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی اور شگفتگی کا عنصر فطری طور پر جلوہ گر ہوا ہے۔ لیکن سادگی کے ساتھ ساتھ اُس میں جذبے کی شدت اور غلو کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ ان کی شاعری میں کسی کسی شعر میں کڑواہٹ بھی نظر آتی ہے اسی لیے تو کہنے پہ مجبور ہوئے "یہ بستی تو مدّت سے آسیبی ہے"۔ آج کے حالات پر نظر دوڑائیں تو کہیں بھی راحت و سکون اور چین و قرار، خوشحالی و فراغت نصیب نہیں ہے۔ قومیں غفلت کی نیند میں سوئی ہوئی ہیں۔ کسی بھی قوم میں بیداری نظر نہیں آتی۔ انسان کو اپنے چاروں طرف وحشت اور خوف کا ڈر رہتا ہے۔ جان کی حفاظت کے لیے جنگل بھی محفوظ جگہ نہیں رہی۔ کیونکہ آج کا انسان حیوانیت کا روپ دھار چکا ہے۔ اب تو اس کی درندگی سے درندے بھی خوف کھانے لگے ہیں۔

عالمی تناظر میں دیکھیں تو آج بھی ہمارا ملک بہت پچھڑا ہوا ہے۔ اقتصادی طور پر بات کی جائے یا سوچ و بچار کی سطح پر، ہندوستان کی مفلوک الحالی پر رؤف رضا نے بڑا گہرا طنز کیا ہے۔ رؤف رضا نے اکثر اشعار میں شہر کا ذکر کیا ہے۔ انھیں شہر سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ کیونکہ شہر کی بھیڑ والی زندگی میں انسان کی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا، کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ یہاں انسان کی شخصیت گم ہو جاتی ہے۔ بقول رؤف رضا "اب شہر جاگے یا مری نیند ہی گہری ہو جائے"۔ موضوعات کے نظریے سے آنکنا چاہیں یا انداز بیان کے ترازو میں تول کر دیکھنے کی تمنا ہو، معنی و مفہوم کی پرت تک پہنچ کر دیکھیں یا جذبات اور سچائی کو مدِ نظر رکھ کر جاننے کی کوشش کریں، عصرِ حاضر کی صورتِ حال سے ان کی شاعری کا تعین کیا

جائے یا فرحت وشادمانی کی دبیز کو ٹٹولا جائے، رؤف رضا کا پیغام شاعری ہر اعتبار سے ایک سچے، پکے، بالغ اور تجربہ کار شاعر کا پیغام ہے۔

کوثر مظہری اسّی کی دہائی میں اُبھرنے والے شعرا کی فہرست میں اہم مقام پر براجمان ہیں۔ اب وہ اس سفر میں چار دہائیاں مکمل کرنے جا رہے ہیں۔ خراماں خراماں انداز میں اپنے شعری ذوق کو پروان چڑھانے والے اس نرالے شاعر اور بھلا کی تخلیقی ذہانت والے ادیب کا شمار اردو کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔ کوثر مظہری بیک وقت شاعر، ناقد، مترجم، مبصر، ناول نگار اور معلّم ہیں۔ یہ سب نام رَٹ کے نہیں گنائے جا رہے ہیں بلکہ راقم الحروف ان کی تحریروں سے استفادہ کرنے کے بعد ہی یہ کہنے اور لکھنے کی جسارت کر رہا ہے۔ ان تمام اصناف میں طبع آزمائی کر کے انھوں نے قارئین کے ذہن و دل پر اپنی فن کاری کے گہرے اور دیرپا نقوش مرتسم کیے ہیں۔ کوثر مظہری کا اب تک واحد شعری مجموعہ ''ماضی کا آئندہ'' 2008 میں منظر عام پر آچکا ہے۔ جس میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ نظموں کی بہ نسبت اس مجموعے میں غزلیں اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ کوثر مظہری کے شعری مجموعہ ''ماضی کا آئندہ'' سے کچھ شعر ملاحظہ کیجیے:

موجوں نے کہا 'پانی' ہم نے بھی سنا 'پانی'
طوفان اٹھا دل میں آنکھوں میں بہا 'پانی'

حال میرا ٹوٹ کر بکھرا ہوا
جانے کس 'ماضی کا آئندہ' ہوں میں

یہ ظلم و جبر کی آندھی یہ خامشی کا حصار
کسی بھی شخص کے منہ میں یہاں زبان ہے کیا

نیل کے پانیو رستے میں نہ حائل ہونا
کیا پتہ ضربِ کلیمی سے ٹھکانے لگ جاؤ

اپنی مٹی کی طرف کون جھکاتا ہے مجھے
شہر میں رہتا ہوں پر گاؤں ہی بھاتا ہے مجھے

ꕥ

کوثر مظہری کے درج بالا اشعار سے بھی اُن کی شعری انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ان کی شاعری پڑھنے کے بعد جو خیالات ذہن میں رچ بس جاتے ہیں وہ ان کا فلسفیانہ اور مفکرانہ ذہن کا حامل ہونا اور منفرد طرز کے لب ولہجہ کا اختیار کرنا۔ان کی فکر انگیز، درد انگیز، روح کو جھنجھوڑتی ہوئی، حقیقت سے آشنا کراتی ہوئی، دل ودماغ کی سینچائی کرتی ہوئی، دنیا کے اسرار ورموز سے آگاہ کراتی ہوئی، تاریخ ساز واقعات کی یاددہانی کراتی ہوئی، تلخ وپُر لطف جذبوں سے آشنا کراتی ہوئی، زیست کے تجربوں سے روشناس کراتی ہوئی، لمحۂ فکریہ کے نقش ثبت کرتی ہوئی، درد وغم کی کیفیت سے اثر انداز کراتی ہوئی، اذہان وقلوب کو وسعت بخشتی ہوئی، جبر واختیار سے آزادی کی طلب کراتی ہوئی، سسکتے اور دم توڑتے جذبات کی باز یافت کراتی ہوئی، ماضی کی اہم قدروں کی پاسداری کراتی ہوئی، انسانی بقا کے تحفظ کے جذبہ سے سرشار کرتی ہوئی، خواہشوں کو پروان چڑھاتی ہوئی شاعری دراصل ان کے جذبہ و احساس کا لبادہ کہی جاسکتی ہے۔کوثر مظہری کے مطابق:

> ''شاعری دراصل اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو جوڑتے رہنے کا نام ہے۔میرے اندر جو ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہے اسے ازسرِ نو بحال کرنے کے لیے یہی شاعری ہے یا تخلیقی عمل ہے جو Patching کا کام کرتا ہے۔آپ اسے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اپنے اندر کی بے اطمینانی اور اضطراب کے Outlet کے لیے شاعری کی جاتی ہے۔اس لحاظ سے شاعری سراسر ایک خارجی (Objective) عمل ہو کے رہ جاتی ہے جب کہ یہ ایک خارجی سے زیادہ ایک داخلی عمل ہے۔ہر شاعر اس لیے شاعری کرتا ہے کہ اس کے اندر اضطراب ہوتا ہے۔وجود کے اضطراب کو Explore کرنا اپنے وجود کو Explore کرنے کے مترادف ہے۔'' (ماضی کا آئندہ از کوثر مظہری، 2008، ص9)

پروفیسر کوثر مظہری شاعری کو اپنے اندر کی بے اطمینانی اور اضطراب کا محرک قرار دیتے ہیں اور شاعری کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔تو کیا شاعری داخلی عمل کا وجود ہے اور خارجی عوامل کا اس سے کوئی سروکار نہیں؟۔درحقیقت شاعر خارجی عناصر سے اثر انداز ہوکر شاعری کو اپنے جذبات واظہار کا ذریعہ بناتا ہے۔تخلیقی صلاحیت جو کہ ایک شاعر کو خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی ہوتی ہے خارجی عناصر سے ہی تحریک پاتی ہے۔اس طرح دنیا میں رونما ہونے والے خوش گوار اور ناخوش گوار واقعات وحالات وحادثات شاعر کے لیے محرک کا باعث بنتے ہیں جو اس کے داخلی جذبات اور احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں۔ خارجی ماحول کا مطالعہ ومشاہدہ ہی اطمینانی و بے اطمینانی اور اضطراب وسکون کی کیفیت کو جنم دیتا ہے۔گویا شاعر کی تخلیق کا بنیادی محرک خارجی ماحول ہی قرار پاتا ہے۔پھر دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ شاعر خارجی عناصر سے کس قدر متاثر ہوا ہے،اس کی داخلیت پر کتنا اثر ہوا ہے اس کا فیصلہ اُس کی تخلیق کرتی ہے جو شاعر زورِ بیانی میں مہارت رکھتا ہو وہی کامیاب شاعر قرار پاتا ہے۔ایک شاعر جس عہد میں جیتا ہے،جس عہد میں سانس لیتا ہے،جس عہد کا وہ مشاہدہ کرتا ہے اگر اس عہد کی حقیقی ترجمانی اور حاصل تجربے کو اپنی شاعری میں جگہ دینے میں ناکام رہتا ہے تو وہ ایک کامیاب شاعر نہیں ہوسکتا۔شاعر کا اپنے عہد کے سیاسی،سماجی،تہذیبی،ثقافتی، معاشی،اخلاقی اقدار وغیرہ سے گہرا ربط اور اُنس ہونا لازمی ہے۔ایک حساس شاعر کی شاعری میں اس عہد کے مسائل اور حقائق کا عکس ہو تو وہ اس کی شاعری کو قابلِ قدر بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔اب تک جو شعرا اپنے عہد اور حالات کی بہتر طور پر تصویر کشی کرنے میں کامیاب ہوئے وہ سربلندی کا درجہ پا گئے ہیں۔میں بھی یہ نہیں کہتا کہ شاعر صرف تاریخی واقعات اور دنیائی حالات ہی کی شاعری کے ذریعے عکاسی کرتا رہے اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کی شاعری حسن اور جمال سے عاری نظر آئے گی جس سے بصیرت وبصارت روشن ہوتی ہے۔شاعر کے تخیّل اور داخلی کیفیت سے اس کی اندرونی سنسناہٹ کا اظہار ہوتا ہے۔

پروفیسر محمد حسن کے درج ذیل اقتباس سے اس کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے:

''ادیب محض رپورٹر نہیں ہے وہ محض کیمرہ کی آنکھ یا کیسٹ کا ریکارڈ

نہیں ہے کہ جو دیکھے یا سُنے اسے محفوظ کرتا جائے بلکہ اس کی اپنی داخلی اور تخلیقی حیثیت ہے اور اس میں تخیّل کا ایک بڑا حصّہ ہے اُس لحاظ سے ادب میں پیش کردہ تفصیلات کو تاریخی حقائق کا درجہ دینا اتنا ہی غلط اور گمراہ کن ہوگا جتنا ادب کے فنی پہلوؤں اور اس کی جمالیاتی بصیرتوں کو نظر انداز کرنا۔"

(ادبی سماجیات، از محمد حسن، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2011، ص 15)

مندرجہ بالا اقتباس شاعر اور ادیب دونوں پر صادق آتا ہے۔اس کو زیرِ نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ایک شاعر کی شاعری میں داخلیت اور اس کے تخیّل کا بہت اہم رول رہتا ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔کوثر مظہری کی شاعری بھی اپنے عہد کی بھرپور ترجمانی اور نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔سنجیدگی، فکر مندی، خلوص مندی، تجسس، بے باکی، اختراعی اور خلاق ذہنیت ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں میں سے ہیں جن کا عکس ان کی شاعری میں صاف نظر آتا ہے۔ان کی شاعری میں بے چینی اور اضطراب کا عنصر کئی اشعار سے جا بجا ظاہر ہوتا ہے جیسے "یہ جو ہر لمحہ مری سانس ہے آتی جاتی" جس سے ان کے سینے میں ایک طوفان برپا ہوتا ہے۔ایسا شعر تبھی خلق ہو سکتا ہے جب کوئی واقعہ شاعر کے ذہن و دل پر طاری ہوا ہوگا۔بغیر اس کے یہ شعر کہنا ممکن نہیں۔کوثر مظہری کی شاعری میں غم و الم کی کیفیت میر اور فانی کی طرح بہت حد تک غالب ہوئی ہے۔غم، بادۂ غم، درد و غم، مرکزِ غم، شدتِ غم، آسمانِ غم، مداوائے غم، غم کی شراب، اشکِ غم، اضافہ کرنے کا غم، کھو جانے کا غم، ضبطِ غمِ دل، چراغِ غم، غمِ حیات، تارِ غم، دولتِ غم، غموں سے جان چھٹی، صحرائے غم و اندوہ، غم بارِ گراں، غموں کے بوجھ، غموں کے نئے گرداب، چہرۂ غم، نئے غم، غموں کی دھوپ، ہجومِ غم، غم کے باب وغیرہ ان کی شاعری کی جان ہے۔اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ غم کا استعارہ کس قدر ان کی شاعری میں مستعمل ہے۔غم و اندوہ کی شاعری کی مثال اس سے بہتر نہیں دی جا سکتی۔ان کی پوری شاعری غم میں مدغم اور سرشار نظر آتی ہے۔ڈاکٹر مولا بخش کوثر مظہری کی شعری غم کے متعلق یوں رقمطراز ہوئے ہیں:

''کوثر مظہری نے بھی فانی سے خود کو قریب کرتے ہوئے غم والم کے فلسفے کو اپنے طور پر یا اپنی زندگی کے تجربے کی روشنی میں سمجھنے کی سعی کی ہے۔ لیکن ان کے اندر وہ قوت مشاہدہ نہیں نظر آتا ہے کہ اس مضمون کو وہ کوئی نئی جہت عطا کر سکیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی شاعری کا اصلی رنگ دراصل اداسی ہی ہے اور جب وہ اپنی اس اداسی اور غم انگیزی کو تہہ نشیں کرتے ہوئے اپنے رنگ میں شعر کہتے ہیں تو غم کا یہی مضمون وسعت اختیار کر جاتا ہے۔''

(ماضی کا آئندہ از کوثر مظہری، 2008، ص 22)

زخم دل کا، نئے زخم، دل کے زخم، زخم ہنستے ہیں، زخم لگایا جائے، زخم تازہ ہے، ملا ہے زخم زمانے سے وغیرہ وہ زخم ہیں جو زمانے کی ناقدری، بے توجہی، بے التفاتی، ظلم و جبر، دغابازی، فتنہ و فساد اور اپنی تقدیر کا کھوٹا ہونے سے لگے ہیں۔ لیکن وہ ان غموں سے نہیں گھبراتے ہیں۔ اس طرح مرزا غالب کا یہ شعر اُن پر صادق آتا ہے:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آساں ہو گئیں

کوثر مظہری کی شاعری میں سمندر، دریا، صحرا، ماضی، حال، موج، موجیں، موجوں، تلاطم، طغیانی، پیاس، سنگ، شجر، خواب، لہو، فنا، خزاں، جنوں، خموشی، خاموشی، جذبہ، گلشن، زیست، مکیں وغیرہ الفاظ جا بجا استعمال ہوئے ہیں جن سے اُن کی شاعری کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ ماضی کا آئندہ، رنگِ خونِ ناب، آغوشِ التفات، خواب صحرا، بادۂ خوار جذبہ، چراغ طاقِ حرم، مانوسِ قید و بند وغیرہ اُن کی وضع کردہ وہ تراکیب ہیں جن سے ان کی شاعری مزین ہوئی ہے۔

کوثر مظہری نے ایسے اشعار بھی رقم کیے ہیں جن میں صنعتِ تلمیح کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایسے اشعار میں تاریخی واقعات کی جانب ہماری توجہ مبذول کی گئی ہے۔ جیسے حسینؓ،

یزیدی، علی ابن ابی طالب، کربلا، جانِ اصغر وغیرہ اس کی کچھ مثالیں ہیں۔ ''ماضی کا آئندہ'' میں بعض اشعار ایسے ہیں جن میں تکرار لفظی پائی جاتی ہے۔ جس میں مجموعے کی پہلی غزل کا پہلا شعر بھی شامل ہے لیکن چونکہ وہ غزل کا مطلع ہے تو اس میں تکرار لفظی عیب نہیں بلکہ حسن پیدا کرتا ہے۔ باقی جن اشعار میں تکرار لفظی ملتی ہے اس کے لئے صفحہ نمبر 47، 49، 53، 73، 77، 80، 83، 107 والی غزلیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ 107 والی غزل کا ایک شعر نمونے کے طور پر پیش ہے:

دیدہ دیدہ حیرانی ہے ، خنجر خنجر سلطانی
حیراں حیراں آنکھوں میں ہر خنجر گم ہر قاتل گم

کوثر مظہری کو تکرار لفظی کے استعمال میں بھی شعر کو برتنے کا خوب سلیقہ آتا ہے۔ وہ اس میں بھی شعری حسن کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ فصاحت، بلاغت اور سلاست کو وہ زائل نہیں ہونے دیتے۔ لفظیات کے عمل سے شعر میں چاشنی پیدا کر دیتے ہیں بقول وحید اختر ''ہر تخلیقی اظہار اپنی نوعیت کے ساتھ اپنی لفظیات بھی تجزیے کے بطن ہی سے لے کر ظہور میں آتا ہے۔'' کوثر مظہری کی شاعری میں اس کا عکس بخوبی نظر آتا ہے۔ ''ماضی کا آئندہ'' کے کچھ شعر ایسے ہیں جو ماضی قریب کے ساتھ ماضی بعید کا پتہ دیتے ہیں جیسے ''حال میرا ٹوٹ کر بکھرا ہوا'' اس میں لفظ ''حال'' جو موجودہ زمانہ یعنی جس سے آج کے وقت کے معنی نکلتے ہیں اور جو اپنی ذات کی حالت یا احوال کی کیفیت کے معنی کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے مصرعہ ثانی سے جو معنی واضح ہوتے ہیں یا جو ہم مراد لیتے ہیں وہ الگ بات ہے۔ معنی قریب اور معنی بعید پھر بھی اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں۔ اس شعر میں ''حال'' ایک ذو معنی لفظ ہے جو صنعتِ ایہام کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ پورا شعر ماضی بعید کی طرف بھی اشارہ دیتا ہے۔ اس کا مصرعہ ثانی ''جانے کس ماضی کا آئندہ ہوں میں'' سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ کوثر مظہری کی شاعری میں غم کی کیفیت بہت حد تک غالب ہوئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ذات غم سے چور چور اور نڈھال ہے۔ ان کی شاعری ذات اور حیات و کائنات کے پیرائے سے مملو ہے۔ شاعر کبھی زمین پر رہنے کی آرزو کرتا ہے، کبھی

آبادی سے دور جانا چاہتا ہے، کبھی بادۂ غم سے چور ہونے کا آرزومند ہوتا ہے، کبھی آبادی چھوڑ کر صحرا میں جانے کی چاہ رکھتا ہے، کبھی اپنی تقدیر سے بے زار نظر آتا ہے، کبھی شہیدان کربلا کا ذکر کرتا ہے، کبھی اپنے گاؤں کی مٹی کو یاد کرتا ہے، کبھی زمانے کے ہاتھوں زخم کھاتا ہے، کبھی دل کے زخموں کو سلنے میں لگتا ہے، کبھی ماضی کی خوش گوار لمحوں کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہے، کبھی اللہ سے دنیا کے ظلم و جبر سے پناہ مانگتا ہے، کبھی امید و اعتقاد کے بل پر خوش ہو لیتا ہے، کبھی اپنے دشمنوں کو جھوٹی شان کی زندگی جینے پر طنز کرتا ہے، کبھی اس پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں اور کبھی پاؤں تلے کی زمین کھسک جاتی ہے ایسا وقت بھی آن پڑا ہے، کبھی ایثار کے جذبے کو دل میں پال لیتا ہے، اس کا کوئی غم گسار نہیں جس کو حالِ زار سناتا، تخت و تاج کا متمنی نہیں، جو زخم زمانے سے ملے ہیں کوئی ایسا ہمدرد بھی نہیں جس کو اپنے دل کے گھاؤ دکھا سکتا وغیرہ۔ ایسی ہی کئی باتیں ان کی شاعری میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔

کوثر مظہری کی شاعری میں کہیں کہیں جنونی حالت کی بازگشت دکھائی دیتی ہے یہ حالت عرفانِ ذات سے اُبھر کر آئی ہے۔ ایسے اشعار تب خلق ہوتے ہیں جب انسان کسی ہار، کسی غم، کسی حادثے، کسی ڈر،، کسی خوف، کسی واقعہ، کسی اندیشہ، کسی سوچ، کسی فکر میں مبتلا ہوتا ہے۔ ان کی شاعری پر اس نوعیت کے کئی اشعار حاوی ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دل کو لبھانے، پُر کیف اور مسحور کُن اشعار بھی ملتے ہیں۔ کوثر مظہری کی شاعری کا جتنا زیادہ مطالعہ کریں اتنی ہی نت نئی باتیں سمجھنے میں مدد ملتی ہیں۔ انھوں نے کوثر اور مظہری دونوں تخلص استعمال کیے ہیں اور اپنے تخلصوں سے مقطع میں نئے نئے تجربے کیے ہیں۔ ان کا تخلیقی و فنی اظہار انھیں اپنے ہم عصر غزل گو شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔

اسّی کی دہائی میں جدید غزل کے منظرنامے پر ابھرنے والے شعرا کی فہرست تب تک نامکمل ہوگی جب تک اس فہرست میں نوجوان اور آج کی نسل کے ممتاز شاعر احمد محفوظ کے نام کا اندراج نہ ہو۔ احمد محفوظ عہد حاضر کے ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے نہایت قلیل وقت میں اردو دنیا میں اپنی شعری لیاقت اور تنقیدی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ احمد محفوظ کا اب تک کوئی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا ہے لیکن مختلف ادبی پروگراموں میں وقتاً فوقتاً اپنی

غزلوں سے قارئین کو محظوظ کرتے رہتے ہیں۔ 1992 میں بی بی سی لندن نے ہندوستان میں نوجوان شاعروں کا ایک مقابلہ کروایا تھا جس میں احمد محفوظ کا انتخاب ہندوستان کے دس بہترین نوجوان شاعروں میں قرار پایا۔ ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ان کا تخلیقی وفور قاری کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ انھوں نے جدید غزل کو اپنی فطری صلاحیت سے توانائی اور وسعت بخشی اس کے ساتھ ساتھ لسانی، موضوعی، اسلوبیاتی اور فنّی سطح پر نئی غزل میں جو امکانات روشن کیے ہیں وہ انھیں ایک ذہین، تجربہ کار اور باشعور شاعر کا منصب عطا کرتا ہے۔ ان کی فنی بصیرت اور تخلیقی قوت نئی غزل کے پوشاک پر وہ گل کاریاں کر رہی ہیں جس کی مثال ملنا مشکل ہے یہی فنی حسن اور شعری نادرہ کاری انھیں اس میدان میں ایک خاص امتیاز سے نوازتی ہے۔ یہاں پر احمد محفوظ کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جارہے ہیں جن سے غزل گوئی میں ان کے تخلیقی وفنی رچاؤ کا بھرپور احساس ہوتا ہے ملاحظہ فرمایئے:

کھلتی نہیں ہے یارب کیوں نیند رفتگاں کی
کیا حشر تک یہ عالم سویا پڑا رہے گا

دل کی آنکھیں کھول کے راہ چلو محفوظؔ
دیکھو کیا کیا عالم زیرِ خاک ہوا

لوگ کہتے تھے وہ موسم ہی نہیں آنے کا
اب کے دیکھا تو نیا رنگ ہے ویرانے کا

کسی سے کیا کہیں سنیں اگر غبار ہوگئے
ہمیں ہوا کی زد میں تھے ہمیں شکار ہوگئے

جینے کو جی رہا ہوں مگر سوچتا ہوں میں
کیوں زندگی کے نام سے ڈرنے لگا ہوں میں

احمد محفوظ کے درج بالا اشعار ہر معنوں، ہر نظر، ہر فکر اور ہر زاویے کے اعتبار سے اس عہد کی جلوہ گری کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی ابتدا میں کہی گئی شاعری کی بات کی جائے تو وہ بھی اپنا ایک منفرد تخلیقی رنگ رکھتی ہے اور آج کی شاعری سے اس کی مناسبت دیکھی جائے تو زیادہ فرق بھی نظر نہیں آئے گا لیکن موضوعی نوعیت سے دیکھا جائے تو ان کی شاعری اور فن پر اس عہد کے حالات کا اثر صاف طور پر دکھائی دیتا ہے جس کی پہچان کرنا مشکل بھی نہیں ہے۔ ہمیں مجموعی طور پر ان کے فن کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ ان کے یہاں زبان و بیان کا سلیقہ، تکنیکی اور فنی عناصر کا فن کارانہ استعمال اور تخلیقی رچاؤ نئی غزل کی شان اور مستقبل کی ضمانت دیتا ہے۔ جو شعری ہیئت ان کی شاعری کی پہچان ہے اور جو ابتدائے زمانے ہی سے برتتے آئے ہیں، ساتھ ہی جو مروّجہ شعری ہیئتوں میں شمار کی جاتی ہے اس میں نیا تجربہ نہ کرتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ انھوں نے صرف اور صرف غزل کو خوب سے خوب تر بنانے پر مرکوز رکھی ہے۔ عہد حاضر میں تخلیقی اور فنی لحاظ سے ان کی شاعری میں دلچسپی کے عنصر کا مزید اضافہ ہوا ہے۔ ان کے اندر ٹھہراؤ، سنجیدگی، بالغ نظری اور دیدہ وری کی بے کراں صلاحیت موجود ہے۔ انھوں نے نہ صرف شخصی و داخلی تخلیقی حسیّت کو تقویت دی ہے بلکہ جدید دور کے تمام لوازمات و محولات کو شاعری میں برتا ہے۔

احمد محفوظ نے جس دور میں غزل کہنی شروع کی اس دور میں بھی ملک کے حالات کچھ سازگار نہیں تھے۔ اگر یوں کہا جائے کہ آزادی کے بعد سے حالات میں تسلی بخش تبدیلی ہوئی ہی نہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ بلکہ روز افزوں حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ سیاسی بازار گرم ہے، ریاکاری اور فریبی کا چلن عام ہو گیا ہے، انسان دھوکہ دھری، فتنہ سامانی، دنگا فساد اور انتشار کی زد میں ہے، بے روزگاری اور نفسیاتی الجھنیں بڑھ گئی ہیں، غیر اخلاقی اور غیر قانونی کاموں نے طول پکڑا ہوا ہے۔ انسانی جذبات میں شدت پسندی آ گئی ہے، مار پیٹ اور خون خرابے کے مشاغل اپنائے جا رہے ہیں، سماج و معاشرہ میں انتشار پیدا ہو رہا ہے، اقتصادی معیشت میں بحران پیدا ہو رہا ہے، قوموں میں فساد برپا ہو رہا ہے اور مذاہب فرقوں میں تبدیل ہو رہے ہیں، قوانین کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے، رشتوں کا پاس و لحاظ نہیں کیا

جارہا ہے،انسانوں میں بے غیرتی اور بے مروتی نے جنم لیا ہے،انسانی اقدار کوفراموش کردیا گیا ہے۔انسان ایک دوسرے کو مارنے پر آمادہ ہوئے ہیں،مظلوم اور نادار شخص کی آواز دب گئی ہے،انصاف مانگنے والے کی آواز دبادی جاتی ہے،بیوروکریٹس اور سیاسی رہنماؤں نے ملک کو کھوکھلا کردیا ہے،ملک کے خزانے خالی ہونے کے دہانے پر ہیں،آجکل کے انسان مکھوٹا پہنے ہوئے ہیں اور اس کی پہچان کرنی مشکل ہورہی ہے،غرض کہ انسانی زندگی مفلوج ہوکررہ گئی ہے۔ایسے حالات جس شاعر کے زیرِ نظر رہے ہوں اور جو ایسے ہی ماحول میں پلا بڑھا ہو اُس کی شاعری ان چیزوں سے کیسے عاری ہوسکتی ہے۔اس طرح احمد محفوظ بھی ان حالات سے کافی حدتک متاثر نظر آتے ہیں۔

احمد محفوظ نے مذکورہ بالا میں ذکر کیے گئے حالات کے تعلق سے بھی بہت سارے اشعار رقم کیے ہیں۔وہ ایسے لوگوں کو مردہ قرار دیتے ہیں جو ان حالات کو صرفِ نظر کرکے درکنار کررہے ہیں جس سے ملک وقوم اور انسانیت کی بقا کو خطرہ لاحق ہے۔وہ غفلت کی نیند سوئے ایسے انسانوں کو مردہ قرار دیتے ہیں اور رب العزت سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ کیا یہ عالم روزِ محشر تک اسی غفلت کی نیند میں سویا پڑا رہے گا۔احمد محفوظ ان لوگوں پر طنز کا وار کرتے ہیں جو ملک کی تباہی اور قوم کی بربادی میں برابر کے شریک ہیں۔انسان کے دل کی آنکھوں کو کب روشنی میّسر ہوگی،کب اس کی سوچ زندہ ہوگی،کب وہ عالمِ انسانیت کے تحفظ کی سوچے گا،یہاں تو عالم کے عالم زیرِ خاک ہورہے ہیں،ہوائی بمباری اور زمینی دھماکوں سے اس جہاں آباد کی مٹی راکھ میں تبدیل ہورہی ہے،کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں،سب کی غیرت مرگئی ہے،انسان تو انسان عالم کے عالم زیرِ خاک ہورہے ہیں۔لوگ اب یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں کہ ماضی نہ سہی آئندہ کے حالات شاید بہتر ہوں لیکن اب جب نظر ڈالتے ہیں تو ایک نئی قسم اور نئے رنگ کی ویرانی کا جنم ہوا ہے جو انتہائی وحشت ناک ہے۔اب انسان دنیا میں آیا ہے تو جینا تو ہے ہی،لیکن جب حالات کو پھر سے بگڑتے دیکھتا ہے تو زندگی سے نفرت کرنے لگتا ہے،اس کو زندگی بے مقصد سی لگنے لگتی ہے۔غرض کہ اس دور کے پورے منظر نامے کی تصویر احمد محفوظ کی شاعری میں بخوبی ملتی ہے۔

احمد محفوظ کی شاعری میں دنیا اور زندگی کی حقیقت پوشیدہ ہے۔انھوں نے رس رسیلی اور تبلیغی شاعری نہیں کی بلکہ ایک مفکر کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھا ہے جس میں جاندار و نباتات کی قدر و قیمت ہے۔آج کا انسان اپنے آپ کو ہر جگہ غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔اب کہیں بھی انسان کی جان محفوظ نہیں ہے۔آج کا ہر انسان رونما ہو رہے ایسے ہزاروں واقعات کا چشم دید گواہ ہے،اب اس نوعیت کے واقعات کو دیکھنا اس کی زندگی کا معمول بن گیا ہے۔ لیکن باایں ہمہ دنیا میں جیو اور جینے دو کا سلیقہ اور سبق نہیں سیکھ پایا۔احمد محفوظ کی شاعری دور حاضر کے حالات وواقعات کی ایکس رے کہی جاسکتی ہے۔انھوں نے دنیا کو چشم بین اور دوراں بین دونوں کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ایک جہاں دیدہ شاعر کی جھلک احمد محفوظ کی شاعری میں بجا طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔پروفیسر علیم اللہ حالی احمد محفوظ کی غزل گوئی کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> ''احمد محفوظ کی تخلیقی فضا میں استعجاب کی ایک خاص کیفیت ہے،جس کا تجزیہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا فنکار مشاہدات سے پرے کسی حقیقت کا ایک لمس محسوس کر رہا ہے۔دھند کی کیفیت میں کہیں کوئی شئے چمک سی جاتی ہے۔فنکار اسے نہ پورے طور پر جذب کر سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو واضح کر سکتا ہے۔ایک حیرانی اور ویرانی کا ماحول ان کی پوری شعری فضا پر چھایا ہوا ہے۔''
>
> (جواز و انتخاب:80 اور بعد کی غزلیں از کوثر مظہری)

مندرجہ بالا اقتباس میں پروفیسر علیم اللہ حالی کو احمد محفوظ کی تخلیقی فضا میں حیرت و استعجاب کا جو پہلو نظر آیا۔وہ دراصل اس دنیا کی رنگت وسنگت،مشاہدے اور ادراک سے ان کی شاعری کا حصہ بن گیا ہے۔اس خاص عنصر کے علاوہ احمد محفوظ کی شاعری تازہ کار اور زبان و بیان کی جدّت پسندی کا پتہ دیتی ہے۔ان کی شاعری کی تفسیر و تفہیم سے بے شمار دنیاوی مسائل اور زندگی کی حقیقت کا علم حاصل ہوتا ہے۔

اس مقالے میں اکثر بزرگ شعرا کا ذکر آیا ہے۔لیکن ان سب شاعروں نے

اکیسویں صدی میں بھی شاعری کی ہے یا کر رہے ہیں۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں عہد حاضر کی ترجمانی بڑی حد تک کی ہے۔اس مقالے میں کچھ نام رہ گئے ہیں جن کی غزل گوئی پر خامہ فرسائی کی جا سکتی تھی۔ان میں گلزار دہلوی،نسیم نیازی،نور جہاں ثروت،عادل حیات وغیرہ شامل ہیں۔آئندہ ان سب شعرا کی شاعری پر بھی تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ہوسکتا ہے غیر دانستہ طور پر کسی اہم شاعر کا نام رہ گیا ہو تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

# جموں وکشمیر کی معاصر اردو شاعری
# اور چند اہم غزل گو شعرا

اگر جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے موجودہ منظرنامے کا بغور جائزہ لیا جائے تو صورتِ حال قدرے بہتر طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کے تینوں خطوں جموں، کشمیر اور لداخ میں اردو کی مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا کی اچھی خاصی تعداد ہے جو اپنی شاعری سے یہاں کی ادبی سرزمین کو سرسبز و شاداب کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ بیسویں صدی میں ریاست جموں وکشمیر میں چند بڑے قدآور اور ممتاز شاعر پیدا ہوئے ہیں جن کی شاعری فنی، فکری، تخیلاتی، شعوری اور جمالیاتی حسن کی سطح پر روشن شعری پس منظر کی مثال پیش کرتی نظر آتی ہے۔ نیز جن کی شاعری میں صفائی، سادگی، تازگی، نفاست اور فطری حسن کے بیش بہا نمونے ملتے ہیں۔ یہی نہیں اسلوب و ہیئت، زبان و بیان اور رنگ برنگی موضوعات کی پُرکاری کی بنا پر ان کی شاعری نہ صرف اپنے وقت بلکہ جدید شعرا کی صف میں بھی اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ جموں وکشمیر کے شعرا کی شاعری داخلیت اور جذباتیت کے لحاظ سے بھی مؤثر قرار دی جا سکتی ہے۔ ان کا کلام ہمہ گیریت اور جامعیت کے عنصر سے لبریز بھی ہے۔ یہاں بیسویں صدی میں اُن چند اہم ریاستی شعرا کے شعری اوصاف کے تذکرے کا مقصد دراصل یہ بیان کرنا ہے کہ ان کی شاعری جتنی روایت و جدت کی شدت سے آمیز ہے اتنی ہی سطحیت سے پاک بھی ہے۔

بیسویں صدی میں ریاست کے چند اہم شعرا میں نند لال کول طالب، اثر صہبائی،

غلام رسول نازکی، رسا جاودانی، شہ زور کاشمیری، حکیم منظور، حامدی کاشمیری، عرش صہبائی وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ آخر الذکر شاعر آج بھی بقیدِ حیات ہیں اور نئی صدی میں بھی کمال کی غزلیں کہہ رہے ہیں۔ ان کے بعد کی نسل میں غزل گو شاعر کے حوالے سے جو چند اہم نام لیے جا سکتے ہیں ان میں فاروق نازکی، پرتپال سنگھ بیتاب، شبیب رضوی، مظفر ایرج، رفیق راز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ستر اور اسی کی دہائی سے لے کر اکیسویں صدی یعنی عصر حاضر تک جن شعرا کی غزلیں مسلسل چھپ رہی ہیں اور خاص و عام میں بے حد پسند کی جاتی ہیں۔ ان میں ایاز رسول نازکی، شفق سوپوری، نذیر آزاد، زاہد مختار، سیدہ نسرین نقاش، بلراج بخشی، جان محمد آزاد، سجاد پونچھی، لیاقت جعفری، پرویز مانوس، اشرف عادل، سلیم ساغر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا کا انتخاب ماہنامہ ''شیرازہ'' کے ''ہم عصر شعری انتخاب نمبر'' سے کیا گیا ہے۔ یوں تو جموں و کشمیر میں ہم عصر غزل گو شعرا کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اس کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ غزلیہ شاعری کے اعتبار سے صورتِ حال بہت حد تک تشفی بخش کہی جا سکتی ہے۔ ''شیرازہ'' کے مذکورہ خصوصی نمبر میں سو شعرا حضرات کا کلام شائع ہونے کے بعد بھی یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہمارے یہاں ہم عصر شاعروں کی اتنی ہی تعداد ہے جب کہ اس میں کچھ کم بھی کیے جا سکتے ہیں اور کچھ کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے یا یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ اسے ''شیرازہ'' کی ضخامت مزید بڑھ جاتی، جس کی گنجائش نہ تھی یا یہ کہ ادارتی عملہ کی ریاست کے کچھ شعرا تک رسائی نہ ہو سکی وغیرہ۔ مجموعی طور یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے دیگر صوبہ جات کی بہ نسبت جموں و کشمیر میں اردو غزل گو شعرا کی تعداد مایوس کن نہیں ہے بلکہ یہاں کی سرزمین نے کہنہ مشق شاعروں کو بھی جنم دیا ہے۔ جنھیں تخلیقی انفراد کے امتیازی شعری وصف سے مہمیز ہونے کی بنا پر بلا شبہ ملک کے اعلیٰ و ارفع غزل گو شعرا کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی کسی حد تک قابل تسلیم ہے کہ ریاست کے کچھ شعرا کی شاعری میں عجلت پسندی، جذباتیت، تساہلی اور تند مزاجی کی وجہ سے سطحیت اور خارجیت غالب آئی ہے۔ جن میں فنی، ذہنی، فکری اور غزلیہ شاعری کے شعور کی بالیدگی کی کمی بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ شاعر کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ شاعری میں آفاقی رنگ پیدا کرنے کے لیے مطالعہ و مشاہدہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ

اس میں علم وادراک کے عرفان کا حاصل ہونا، ذہن کے دریچوں کو کھلا ہونا، علمی و تخلیقی شعور کی پختگی سے سرشار ہونا، زبان واسلوب پر دسترس ہونا، شاعری کے فنی اور جمالیاتی تقاضوں سے واقفیت حاصل ہونا بھی لازم وملزوم ہے۔ ایک شاعر کے ذہن پر جس قدر شعری رغبت اور شاعری کی جانب فطری رجحان طاری ہوگا اسی قدر اس کی شاعری میں غیر شعوری طور پر اوصافِ اصناف اور دیگر صفات پیدا ہوتے جائیں گے۔ شاعری میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے اس میزانِ معیار کا پایا جانا لازم قرار پاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ چاہے صنفِ غزل ہو یا کوئی اور شعری صنف۔ شاعر کے افکار ونظریات اور احساسات میں جدت کا احساس جھلکنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر قدرت بیان پر بھی فن کارانہ مہارت حاصل ہو تو شاعری اور دلچسپی کا موجب بن جاتی ہے۔

جموں وکشمیر کے معاصر اردو غزل گو شعرا کا کلام پچھلی کئی دہائیوں سے نہ صرف ریاست میں بلکہ ملک و بیرون ملک کے اخبارات اور رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح نئی صدی میں بھی یہاں کے شعرا کا کلام تواتر کے ساتھ منظر عام پر آرہا ہے۔ یہاں تک کہ پچھلے کئی برسوں سے اس جذبے میں کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ اس میں مزید اضافہ ہوتا آیا ہے جو کہ ایک خوش آئند قدم ہے۔ اس سے بہ آسانی یہ اندازہ بھی ہوجاتا ہے کہ ملک کے باقی علاقوں اور صوبوں کی طرح جموں وکشمیر کے شعری افق پر بھی نئے نئے شہسوار اُبھر رہے ہیں جو اپنی تخلیقات سے یہاں کی شبنمی ادبی سرزمین کو سیراب کررہے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین کرانا لازم ہے کہ شاعر کی جس زمانے اور ماحول میں پرورش و پرداخت ہوتی ہے اس کی شاعری اور ذہن ودل پر اس زمانے اور ماحول کا اثر پڑنا واجب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اس کی حقیقی عکاسی کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کی شاعری بے معنی سی ہوکر رہ جاتی ہے۔ روایت اور وقتی حالات سے بے نیاز ہونا کوئی دانش مندی نہیں کہلاتی۔ پھر شاعر کی انفرادی صلاحیت کا معاملہ پیش آتا ہے جس شاعر کو اس وصف میں امتیازی حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ اپنے جذبات واحساسات کو مؤثر انداز اور بلیغ پیرایۂ اظہار میں بیان کرنے کرتا ہے۔ اس طرح شاعری کے میدان میں اس کی حیثیت مسلم ہوجاتی ہے۔ یہ کچھ

عناصر ہیں، جن سے شاعر کا سروکار رہتا ہے۔ مختصراً ہر تخلیق کار کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی تخلیقی چیز کو ایک منفرد رنگ و روپ میں سامنے لائے تا کہ اس کی تخلیق پر انفرادیت کا رنگ چڑھ جائے کیونکہ بعض اوقات تقلیدی اور روایتی اسلوب و انداز اختیار کرنے سے تخلیق میں موثریت اور معنویت کا اثر کم نظر آنے لگتا ہے اس لیے شاعر خصوصاً غزل گو شاعر کو ان سب خصائص کی طرف دھیان دینے کی اشد ضرورت ہے۔ اس گفتگو کا مقصد محض یہ بتلانا ہے کہ جموں و کشمیر کے معاصر شاعروں کی غزل گوئی ان تمام لوازمات پر کھری اترتی ہے۔

یہاں مختلف لب و لہجے کے شاعر پائے جاتے ہیں جو پچھلی کئی دہائیوں سے اپنی انوکھی تخلیقی روش اور طرز ادا سے قارئین کا دل جیتتے آرہے ہیں۔ یہاں کی شاعری متنوع موضوعات، حسین جذبات، معصوم احساس، رنگارنگ فطری عجائبات اور منفرد تہذیب و تمدن کی بوقلمونی سے آراستہ و پیراستہ ہوئی ہے۔ زندگی کے تلخ تجربات اور مخدوش واقعات تک یہاں بیان ہوئے ہیں۔ غرض کہ عصری حقائق کا بیباکانہ اظہار ہوا ہے۔ اس میں نہ صرف مقامی رنگ کی خوشبو بسی ہے بلکہ آفاقی رنگ کے امتزاج کا عکس بھی اس میں بخوبی نظر آتا ہے۔ یہاں کے شاعروں کا دائرہ کار اب بے پناہ وسعت کا حامل ہوگیا ہے۔ سرحدیں اور حدود ان کی اڑان کے سامنے لاچار و بے بس نظر آتی ہیں۔ اس طرح یہاں کی شاعری صدیوں کی ثروت مند روایت کی امین ہونے کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے بدلتے حالات کے تحت جدّت پسندی، رنگارنگی اور توسیع کے حاوی میلان کی غماز معلوم ہوتی ہے۔ سرزمینِ کشمیر کی شعری فضا اس قدر مانوس اور قابل اعتبار ہے کہ اسے کسی بھی معنوں میں ہندو پاک کی عصری اردو شاعری سے کم نہیں آنکا جاسکتا۔ یہاں کے شاعر حضرات اپنے معاصر شعرا کے دوش بہ دوش چلتے ہیں، شائع ہوتے ہیں، داد لوٹتے ہیں اور اپنی شاعری کا لوہا بھی منوا لیتے ہیں۔ خدا کی عطا کی ہوئی ادبی و فنی صلاحیتوں کا کشمیر کے معاصر اردو شعرا نے خوب استعمال کیا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کی عصری حقیقت، زمانے کے تغیرات، تحریکات اور رجحانات سے کبھی منہ نہیں موڑا بلکہ وہ ہمیشہ زمانے کو اپنے ساتھ لے کر چلے ہیں۔ ہر چند کہ یہ زمانہ انھیں ہمیشہ ہی سے فراموش کرتا آیا ہے۔ ان کے تئیں ہمیشہ بے رخی برتی گئی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں اور

اس کے ذمہ دار کشمیر کے اردو شعرا کسی حد تک خود بھی ہیں۔ کیونکہ ایک زمانہ تھا جب وسائل محدود تھے اور ادیب حضرات اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لیے ڈاک کا سہارا لیا کرتے تھے اور پھر خط و کتابت کا سلسلہ بھی استوار ہوتا تھا۔ اس طرح وسائل کے محدود ہونے کے باوجود بھی ان کی تخلیقات کسی حد تک ہندو پاک کے رسائل کی زینت بنتی تھیں۔ جب کہ آج انٹرنیٹ اور ٹکنالوجی نے زمین و آسمان کی قلابیں ملا دی ہیں۔ اس کے باوجود بھی کشمیر کے اردو شعرا باہر کے اخبارات اور جرائد میں اپنی تخلیقات کو شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ ایسے شعرا کی تعداد نہایت قلیل ہے جو باہر کے رسائل میں چھپنا پسند کرتے ہیں۔

ریاست سے باہر کے ادبا و شعرا کی ان کے ناموں سے ناواقفیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اس کے کیا نقصانات اٹھانے پڑ رہے ہیں اس کی وضاحت آگے کی کچھ سطور میں خود بہ خود ہو جائے گی۔ باہر کے رسائل میں نہ چھپنے کی ایک وجہ سستی یا کاہلی قرار دی جا سکتی ہے، دوسری وجہ ٹکنالوجی سے غیر مانوسیت کی ہے، تیسری وجہ کشمیر کے ابتر سیاسی حالات ہو سکتے ہیں، چوتھی وجہ باہر کے ادبا سے میل جول نہ رکھنے یا بے تعلقی ہو سکتی ہے، پانچویں وجہ شاعری میں کمی یا خامی بھی ہو سکتی ہے، چھٹی وجہ موجودہ ادبی منظرنامے سے بے خبری ہو سکتی ہے، ساتویں وجہ اپنے آپ کو منظر عام پر لانے کی خواہش کا نہ ہونا ہو سکتی ہے، آٹھویں وجہ اس کے علمی و ادبی فوائد سے کم آگہی ہو سکتی ہے، نویں وجہ اشاعت کے فوائد سے انجان ہونے کی ہو سکتی ہے وغیرہ۔ یہ کچھ باتیں ہیں جن پر ہمیں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

مندرجہ بالا میں جموں و کشمیر کے معاصر اردو شعرا کو دنیا کے ادبی و شعری منظرنامے پر نظر انداز کرنے کے حوالے سے چند آرا پیش کی گئی۔ جس میں کشمیر کے ان معاصر اردو شعرا کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے جو اس ترقی یافتہ دور میں سانس لیتے ہوئے بھی دنیا کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں سے پچھڑ رہے ہیں۔ اگر یوں بھی کہیں کہ اردو کی شعری دنیا میں ماسوائے جموں و کشمیر کے ان کا کہیں ذکر نہیں ہوتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کا ذکر نہ ادب کی تاریخی کتابوں میں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ شعری انتخابات میں جگہ پاتے ہیں۔ اگر باہر کے کسی ادیب، ناقد، محقق یا مبصر نے جموں و کشمیر کے کسی شاعر پر ایک آدھ مقالہ یا تبصرہ لکھ بھی دیا ہے تو اس

کی وجہ کسی ادبی وغیرادبی سرگرمی میں ملاقات یا شناسائی، نجی تعلقات، دوستانہ مراسم یا دوسرے لفظوں میں کشمیر یا کشمیر سے باہر کسی ادیب وشاعر کے ساتھ ان کی ملاقات کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسا خال خال ہی ہوا کہ جموں و کشمیر کی کسی ادبی شخصیت سے متاثر ہو کر مضمون لکھا گیا ہو۔ یہ ایک کڑوی حقیقت ہے جس میں بہت حد تک سچائی تلاش کی جا سکتی ہے۔ اگر راست بازی اور دیانت داری سے کام لیا جاتا تو تاریخی اور شعری انتخاب پر مشتمل ان کتابوں میں، جموں و کشمیر کے کسی نہ کسی معتبر شاعر وادیب کی شمولیت ضرور ہوتی۔ اس کو بھی کسی المیے سے کم تعبیر نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں بالکل ہی نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ جو سلوک اب تک جموں و کشمیر کے اردو شعرا کے ساتھ روا رکھا گیا ہے وہ نا قابلِ اعتنا ہے۔ شعر وادب کی کتابوں میں انھیں خارج کرنے کی کوئی تو وجہ ہونی چاہیے، کوئی تو جواز پیدا کرنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تاریخ ادب اردو (عہدِ میر سے ترقی پسند تحریک تک) چار جلدوں میں 2002 میں شائع ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد کو بحیثیت ایک ترقی پسند شاعر کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آجاتی ہے کہ اردو کی اس تاریخی کتاب میں موصوفہ نے ایک عہد اور ایک تحریک کے ممتاز شاعروں کو جگہ دی ہے جس میں جگن ناتھ آزاد مرحوم ہی جگہ پا سکے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر وہاب اشرفی کی تاریخ ادب اردو (ابتدا سے 2000 تک) جو تین جلدوں میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس میں ابتدا سے لے کر بیسویں صدی تک کے تمام اہم اردو ادیبوں، فکشن نگاروں، محققوں، ناقدوں اور شاعروں وغیرہ کا مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں جموں و کشمیر کے کسی معاصر اردو شاعر کا تذکرہ کیوں نہیں کیا گیا۔ پھر آخر پر اضافہ شدہ لوگوں کی فہرست میں پروفیسر محمد زماں آزردہ کشمیر کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس میں زماں آزردہ کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات کا سرسری تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جہاں ڈاکٹر وہاب اشرفی نے ''تاریخ اردو ادب'' میں ہند و پاک کے کئی معاصر شعرا حضرات کو شامل کرنا موزوں سمجھا تو کیا اس میں جموں و کشمیر کا کوئی معاصر شاعر جگہ پانے کا حق نہیں رکھتا تھا؟ کیا ان کی شعری و ادبی وقعت اور حیثیت نئی صدی کے شعرا سے کم تر ہے اور اگر ہے تو کس اعتبار سے؟ کیا جموں و کشمیر کی معاصر اردو شاعری دنیائے شعر وادب کے اصول وضوابط اور معیار پر کھری نہیں

اترتی ؟۔کیا اردو شعروادب کے فروغ میں کشمیر کے معاصر اردو شاعروں کا کوئی کردار نہیں۔
جموں و کشمیر ہندوستان کی واحد ایسی ریاست ہے جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے اور ریاستی حکومت کی عدم توجہی کے باوجود بھی یہاں کے شاعر وادیب اردو زبان اور شعروادب کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔اس لیے محققین اور مورخین کے لیے یہاں کے ادبا و شعرا کا ذکر اور بھی دلچسپی کا موجب بن سکتا تھا جب کہ نتیجہ اس کے برعکس ہے۔کچھ ناقدین حضرات اپنے مقالات میں جموں و کشمیر کے شعرا کے اشعار کا حوالہ اکثر دیتے رہتے ہیں۔ اس طرح اگر کہیں کسی کتاب میں مختصر تعارفی ذکر آیا ہے تو اسے حق شناسی ادا نہیں ہوتی۔

جموں و کشمیر کی اردو شاعری کا اعتراف ریاستی سطح پر بھی بہت کم ہو رہا ہے۔تحقیق کے میدان میں ریاست کے بعض محققین سے اس کا حق کم و کاست ادا ہو رہا ہے۔البتہ تنقید کے میدان میں اس کی پذیرائی ابھی تشنۂ لب ہے۔بس گنتی کے کچھ ناقد ہیں جو دل و جان سے ان کی صلاحیتوں کو منکشف کر کے منظر عام پر لانے کی سعی و جستجو میں مصروف ہیں۔وہ چاہے کشمیر کے رسائل ہوں یا ملک و بیرونی ممالک کے رسائل۔غرض کہ ہر جگہ سے شائع ہونے والے رسائل میں جموں و کشمیر کے بعض اردو اسکالرں اور کچھ مخصوص ناقدوں کے تنقیدی و تحقیقی مقالات کی اشاعت سے یہاں کے معاصر اردو شاعری کا قرض ادا ہو رہا ہے جس کو فرض اولین سمجھ کر بھی ترجیح دی جانی چاہیے۔تاہم میرے مشاہدے میں آیا ہے کہ دورانِ ریسرچ اکثر و بیشتر محققین محض ڈگری کی حصولیابی کی خاطر ایک دو تنقیدی و تحقیقی مقالات کی اشاعت کے بعد ادب کے منظرنامے سے بالکل ہی غائب ہو جاتے ہیں جو باعثِ تشویش ہے۔چنانچہ ریاست جموں و کشمیر کے ادبا و شعرا کی ادبی کاوشات کو بیرونی ریاستوں اور غیر ملکی ادیبوں سے متعارف کرانے کی سخت ضرورت محسوس کی جارہی ہے تاکہ ملکی پیمانے پر بلکہ اردو کے عالمی منظرنامے پر بھی جموں و کشمیر کے اردو ادیبوں اور شاعروں کی ادبی خدمات کو تسلیم کیا سکے۔اب چونکہ اس منظرنامے پر نئے نئے شاعر حضرات اُبھر رہے ہیں اس لیے بروقت ان کی شعری خدمات کا صحیح جائزہ لینا اور اس کا عمیق محاکمہ پیش کرنا لازمی ہو جاتا ہے تاکہ وہ مستقبل میں ادب کے شعری میدان میں جگرکاوی کا ثبوت دے سکیں۔

مزید ان کے قلم سے شاہکار ادبی فن پاروں کا وجود ممکن ہو۔ فی الحال ریاست جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سے شائع ہورہے اردو رسالہ ماہنامہ ''شیرازہ'' اور سالانہ رسالہ ''ہمارا ادب'' سے ریاست میں اردو شعروادب کی جو خدمت انجام پا رہی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اس سے قارئین کو ریاست جموں و کشمیر میں اردو کی مجموعی صورتِ حال سے واقف کرانے کی ایک اچھی کوشش ہورہی ہے۔ یہ دونوں رسائل پابندی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ''شیرازہ'' کے مختلف موضوعات اور شخصیات پر خصوصی نمبر بھی شائع ہورہے ہیں جو دستاویزی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ گذشتہ کچھ برسوں سے اس کے خصوصی شماروں میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ قلم کاروں سے اچھے اچھے موضوعات پر لکھوایا جارہا ہے۔ جموں و کشمیر کے اردو شاعروں اور ادیبوں کو ان شماروں میں خاص طور پر جگہ دی جاتی ہے۔ باہر کے ادیبوں کا قلمی تعاون بھی حاصل کیا جاتا رہا ہے۔ شاعری کے حوالے سے کئی خصوصی شماروں کا اہتمام عمل میں لایا گیا۔ مزید برآں ریاست کے کئی مشہور و مقبول شعرا پر بھی خصوصی شمارے شائع کرکے انھیں خراج تحسین بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ''ہم عصر شعری انتخاب نمبر'' ''جموں و کشمیر میں معاصر اردو نظم نمبر'' ''جموں و کشمیر میں معاصر نسائی ادب نمبر'' ''حامدی کاشمیری نمبر'' ''فرید پربتی نمبر'' اور اب ''نوجوان نسل نمبر'' خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مذکورہ خصوصی اشاعت سے جموں و کشمیر میں معاصر اردو شاعری خصوصاً غزل کی شعری فضا کا بہت حد تک اندازہ ہوجاتا ہے۔ ان شماروں میں جہاں جموں و کشمیر کے سینئر شعرا کی شعری تخلیقات کی اشاعت عمل میں لائی گئی وہیں ابھرتے ہوئے شعرا حضرات کے کلام کو بھی شائع کیا گیا ہے۔ جموں و کشمیر کے نمائندہ غزل گو شعرا کا کلام جن موجودہ بیرونی رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان میں ششماہی ''بیسویں صدی'' سہ ماہی ''تحریکِ ادب'' سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' سہ ماہی ''استفسار'' سہ ماہی ''نیاورق'' سہ ماہی ''انتساب'' ماہ نامہ ''تریاق'' ماہ نامہ ''ایوانِ اردو'' ماہ نامہ ''کتاب نما'' ماہ نامہ ''تحریرِ نو'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان رسائل و جرائد سے یہاں کے معاصر شعرا کی معقول عزت افزائی ہوتی ہے۔ ان رسائل و جرائد کے بعض مدیران یہاں کے تخلیق کاروں کی تخلیقات کو شائع کرنے میں تساہل پسندی سے کام نہیں لیتے۔

غزل اردو شاعری کی سب سے زیادہ ہردلعزیز، مقبولِ عام اور متداول صنفِ سخن کہلاتی ہے۔ وجود میں آنے کے بعد سے ہی غزل نے ہر عہد پر اپنے مؤثر کن اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہاں تک کہ غزل اردو کے زیادہ تر شعرا کی محبوب صنف رہی ہے اور یہی وہ صنف ہے جس نے کئی شعرا کو بامِ عروج پر پہنچایا اور شہرت عام و بقائے دوام بخشا۔ وہ سودا ہو یا میر، غالب ہو یا مومن، داغ ہو یا اقبال، حسرت ہو یا اصغر، جگر ہو یا فانی وغیرہ سب کی مقبولیت کی وجہ غزل رہی ہے۔ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم شعرا سب نے مشترکہ طور پر صنفِ غزل کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ وہ چاہے خواندہ ہو یا ناخواندہ، امیر ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، مسلم ہو یا غیر مسلم، طالب علم ہو یا استاد، کم عمر ہو یا بزرگ، اردو زبان کا عام قاری ہو یا کسی دوسری زبان کا، اردو شعبے سے تعلق رکھتا ہو یا کسی دوسرے شعبۂ جات سے منسلک ہو، غرض کہ ہر ایک غزل کے کئی اشعار وردِ زبان کیے رہتا ہے۔ ہندی سنیما کے کلاسیکی فلموں کی شہرت کا باعث ان کے گانے ہوا کرتے تھے اور جن فلموں میں کسی شاعر کی غزل گنوائی جاتی تھی وہ بکس آفس پر سوپر ڈوپر ہٹ (Super Duper Hit) ہو جایا کرتی تھی۔ کچھ گلوکار ایسے ہوئے جنھوں نے زندگی بھر صرف غزلیں گائیں اور ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ بعض کو غزلوں نے امر کر دیا اور بعض غزلیں ان کی آواز کا معمہ بن گئیں۔ غزل ہر زمانے میں ایک زندہ اور رواں دواں، بامعنی اور بامراد صنف رہی ہے۔ کئی صدیاں گزرنے کے باوجود غزل کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ غزل اپنی منزل کی جانب آج بھی رواں دواں نظر آتی ہے۔ جی ہاں! اس بات سے آگاہ کراتے جائیں کہ غزل کی منزل سے آپ یہ نہ مراد لیں کہ اس کے حدود متعین ہیں۔ غزل کی منزل اس کا عروج ہے جو تاحال منزلِ مقصود کی جانب گامزن ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہر زمانے میں ایسے غزل گو شاعر منظر عام پر آتے رہے ہیں جو غزل گوئی میں نئے شعور کی روح ڈال کر، نئی وسعتیں بخش کر، نیا آہنگ عطا کر کے اور ایک نئے لہجے کا جامہ پہنا کر اس سے جاودانی کی شاہراہ پر لا کر کھڑا کرتے ہیں۔ یہاں سے غزل اپنے سفر پر گامزن ہوتی ہے۔ غزل ایک ایسی صنف ہے جو کئی صدیوں کی تہذیبی روش، فکری سفر اور جذبات و احساسات کا جائزہ لے چکی ہے۔ اس صنف میں اتنا دم ہے کہ وہ اردو کی بقا تک زندہ رہے گی۔

بیسویں صدی کے مختلف ادوار میں جموں و کشمیر میں کئی ایسے شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ جنھوں نے یہاں کی غزلیہ شاعری کے لیے نہ صرف فضا سازی کا کام کیا بلکہ اس صنفِ شاعری کی نشو ونما میں اپنا خون جگر بھی صَرف کیا۔ ماقبل نئی صدی ان شعرا نے غزل کو آب و تاب اور رنگ و روپ عطا کیا۔ انھوں نے ریاست میں غزل گوئی کے لیے ایک خوش گوار ماحول پیدا کر کے اس قدر اپنے گہرے اور مثبت نقوش مرتسم کیے ہیں کہ آئندہ نسلیں بھی ان سے بہرہ مند ہوئیں۔ رفتہ رفتہ کئی دور بیت گئے۔ بسا اوقات مختلف ادوار میں ایسے غزل گو شاعر بھی پیدا ہوئے جنھوں نے شعر و ادب کی آبرو صنف غزل کو اعتماد و اعتبار اور وقار بخشا۔ بیسویں صدی کے ان شاعروں میں کچھ ایسے ہیں جو آتے آتے اکیسویں صدی یعنی نئی صدی میں بھی تعلیم و تعلم اور شعر و ادب کے چراغ روشن کرتے گئے۔ بیسویں صدی کے جموں و کشمیر کے وہ بزرگ شعرا جو آج بھی بقید حیات ہیں، وہ اور ان کے سلسلۂ تلمذ و دیگر معاصر شعرا کی بدولت ریاست میں اردو شاعری خصوصاً غزلیہ شاعری کا میدان کافی زرخیز نظر آتا ہے۔ ریاست کی جدید نسل کے غزل گو شعرا اپنے بزرگوں کی شفقت اور سرپرستی میں اچھی راہ پر گامزن ہو رہے ہیں۔ جدید نسل کے شعرا سے میری مراد محض اکیسویں صدی میں ابھرنے والے شعرا ہی نہیں بلکہ ماقبل نئی صدی کے وہ شعرا بھی ہیں جو ساٹھ، ستر یا اسّی کی دہائی سے لے کر مسلسل عصر حاضر میں بھی اردو شعر و ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ جن کا ذکر اس مضمون کی ابتدائی سطور میں آچکا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے معاصر اردو غزل گو شعرا کے اس قبیل میں پروفیسر حامدی کاشمیری سرخیل شاعر قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ان کا شمار ریاست کے بزرگ ترین اور سینئر غزل گو شعرا میں کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی شعری کائنات سات دہائیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ ان کے پہلے شعری مجموعے ''عروسِ تمنا'' میں مرقوم دیباچہ کی اس تحریر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ بقول حامدی کاشمیری ''اس میں میری منتخب نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو میں نے گذشتہ گیارہ برسوں میں کہی ہیں''۔ ''عروسِ تمنا'' 1961 میں شائع ہوا ہے۔ جب کہ مصرہ مریم کے مطابق یہ مجموعہ کلام حامدی کاشمیری کی 1941 سے 1950 تک کی لکھی گئی

شاعری کا انتخاب ہے۔اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مصرہ مریم تاریخ کا صحیح اندازہ نہیں لگا پائی ہیں وگرنہ 1961 سے قبل کے گیارہ برس کا شمار 1949 یا 1950 سے لے کر مجموعے کی اشاعت تک قرار دیے جاسکتے ہیں۔ بہر حال ان سات دہائیوں میں حامدی کاشمیری کے کل سات شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں جو ادبی حلقے میں کافی مقبول ہو چکے ہیں۔جن میں ''عروسِ تمنا''، ''نایافت''، ''لاحرف''، ''شاخ زعفران''، ''وادیٔ امکاں''، ''خواب رواں'' (2003)'' اور ''شہر گماں (2005)'' قابل ذکر ہیں۔آخر الذکر دو شعری مجموعے ایسے ہیں جو اکیسویں صدی میں شائع ہوئے ہیں۔ان تمام شعری مجموعوں کو ایک خاص وصف اور امتیاز حاصل ہے وہ یہ کہ سب میں غزلوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ یہاں تک کہ تین شعری مجموعوں میں صرف غزلیں ہی ہیں۔

حامدی کاشمیری کے حوالے سے بغیر کسی مبالغہ آرائی کے کہا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں جموں و کشمیر کے جس شاعر کا کلام بکثرت شائع ہوتا رہا ہے۔ان میں حامدی کاشمیری کا نام سرفہرست ہے۔حامدی کاشمیری ریاست کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کی غزلیں دنیا کے معروف اور مقبول ترین رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔ ایسا شاید ہی کوئی رسالہ ہو جس میں ان کا کلام نہ شائع ہوا ہو۔حامدی کاشمیری سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس صدی میں خود کو صرف غزلیہ شاعری ہی تک محدود رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات غزلوں کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔نئی صدی کے وہ تمام رسالے اس بات کے گواہ ہیں جن میں ان کا غزلیہ کلام شائع ہوتا آیا ہے۔اگر گذشتہ برسوں میں ان کی شائع شدہ غزلوں کو مرتب کر دیا جائے تو ان کے مزید کئی شعری مجموعے وجود میں آسکتے ہیں۔ یوں تو حامدی کاشمیری نے اردو کی ہر صنف میں اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے اور ہر صنف میں اپنے تخلیقی و تنقیدی اور تحقیقی نقوش چھوڑے ہیں۔لیکن شاعری ان کا پسندیدہ میدان رہا ہے۔اس صنف میں انھوں نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔حامدی کاشمیری نے افسانے بھی تخلیق کیے، ناول بھی لکھے، سفرنامہ بھی تحریر کیا، تحقیقی نمونے بھی یادگار چھوڑے اور تنقید میں بھی خاص و عام میں خوب شہرت پائی۔مگر شاعری ان کے اظہار کا ایسا وسیلہ قرار پایا جس سے انھوں

نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور تا حال اس کی پرورش کر رہے ہیں۔ جب کہ باقی اصناف کے ساتھ ان کا رشتہ اس کے برعکس رہا۔ مظہر امام کے بقول "خود ان کا خیال ہے کہ وہ پہلے شاعر ہیں، پھر تنقید نگار"۔ ظاہر ہے شاعری میں انھیں اوّلیت حاصل ہے اور اس میں بھی غزل اور نظم میں انھیں ایک خاص استعداد حاصل ہے۔

حامدی کاشمیری نے اپنی شاعری کا آغاز اُس وقت کیا جب ترقی پسند تحریک دم توڑ رہی تھی اور جدیدت کا آغاز ہونے والا تھا۔ آتے آتے جدیدیت کا سامنا ہوا اور پھر مابعد جدید رجحان سے سابقہ پڑا۔ اس طرح مختلف النوع قسم کے تجربات، تحریکات اور رجحانات و میلانات سے حامدی کاشمیری کا سروکار رہا۔ جس طرح انھوں نے انھیں پلتے، پنپتے اور بڑھتے دیکھا۔ اسی طرح ان کی سسکتی اور دم توڑتی زندگی بھی دیکھی۔ اس دوران حامدی کاشمیری نے اپنا تخلیقی سفر جاری و ساری رکھا اور نئی صدی میں داخل ہوتے ہوتے ان کی غزل گوئی میں جدت کے عناصر دیکھنے کو ملے۔ شاعر میں ایسی انفرادیت ہونی چاہیے کہ اس سے اپنے وقت یا دور کی آواز سمجھا جائے۔ کیونکہ وقت کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں، رسوم و رواج، تہذیب و ثقافت اور کلچر کی سطح پر بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے ایک شاعر کے کلام میں اُس کے عہد کے حالات، معاشرتی مسائل، سماجی و تہذیبی زندگی اور افکار و خیالات کی تصویر نظر آنی چاہیے اور حامدی کاشمیری میں ایسا تخلیقی شعور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

حامدی کاشمیری کی غزل گوئی کا دامن کافی وسیع ہے۔ انھوں نے ہر دور کے طبقۂ فکر کو اپنی شاعری سے متاثر کیا۔ یہاں تک کہ ملک و بیرون ملک کے معاصر غزل گو شعرا نے بھی ان کی شعری انفرادیت وعظمت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ اپنی شعری زندگی کے کئی مرحلوں سے گزرے، اس کے نت نئے دور دیکھے اور ہر دور میں کئی بڑے نام ان کے معاصرین ہوئے۔ جن کے دوش بہ دوش ان کا کلام چھپتا رہا۔ یہاں پر ان کے ہم عصروں کے نام گنوانا مقصود نہیں۔ جس شاعر کی شاعری کا دامن جتنا وسیع و عریض ہوتا ہے اس کی شاعری کو کم لفظوں میں سمیٹنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ حامدی کاشمیری کی شاعری اس کی جیتی جاگتی مثال کہی جا سکتی ہے۔ حامدی صاحب کی حالیہ سترہ برسوں میں کہی گئی اور شائع ہوئی چند مقبول غزلوں کے اشعار

نمونے کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ جو اگرچہ ان کی شاعری کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے البتہ ان کے تخلیقی فن کی نمائندگی ضرور کر سکتے ہیں۔ کچھ شعر ملاحظہ فرمائیں:

چہرے کو بے نقاب کرنا تھا
ہر حقیقت کو خواب کرنا تھا

ہوگئے محرومِ بینائی تو کیا
نور کو ظلمت میں ضم ہونا ہی تھا

ہجوم غمگساراں ہے، نہیں ہے
الٰہی ہست کیا ہے، بود کیا ہے

الٰہی خواب ہے یا جاگتا ہوں
وہی ہیں سب کے سب، کوئی نہیں ہے

خود بھی کیا رنج پال رکھتا ہے
کون کس کا خیال رکھتا ہے

تمام اہلِ گلستان سربہ زانو ہیں
نسیم کہتی ہے منظر بدلنے والا ہے

سیہ ملبے کے ٹیلے دیدنی ہیں
وہ بستی کب کی غارت ہوگئی ہے

پرندے صبح تک رکنے نہ پائے
گلوں کی اشک باری رہ گئی ہے

موجود ہیں دیوار و در دیکھا نہ تھا
میں نے شاید اپنا گھر دیکھا نہ تھا

حامدی کاشمیری کے مذکورہ اشعار کاانتخاب ان کی حالیہ صدی میں کہی گئی بعض اہم غزلوں سے کیا گیا ہے۔ جو ان کی تخلیقی حسیت اور شعوری وجدان کا پتہ دیتی ہیں۔ اگر موضوعاتی اور فنی لحاظ سے ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اس کے لیے صفحات کم پڑ جائیں گے۔ اس لیے یہاں پر اختصار کے ساتھ ان کی عصری غزل گوئی کے چند امتیازی پہلوؤں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ حامدی کاشمیری کی شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے جس میں ایک خاص انفرادیت اور زندگی کے تمام نشیب و فراز کسی نہ کسی زاویے سے مل جاتے ہیں۔ اس میں سنجیدگی و پاکیزگی بھی ہے اور وزن و وقار بھی، اس میں زندگی کا عرفان، اس کو بسر کرنے کا ایک لائحۂ عمل اور برتنے کا ایک نظام بھی ہے۔ ان کی غزلیں ان کی بالغ نظری، وسعتِ فکری اور قادرالکلامی کی غماز ہیں۔

حامدی کاشمیری یوں تو روایتی غزل گوئی سے بھی فیض یاب ہوئے، باوجود اس کے انھوں نے روایت سے بغاوت کی۔ انھوں نے نئی شاعری کے سلسلے میں پیش رفت کی اور روایتی و رومانی شاعری سے کنارہ کش ہوکر موضوع و اسلوب کو بے جا جکڑ بندیوں سے آزاد کرا کے غزل کو نئے شعری تقاضوں کے مطابق کر دیا۔ ان کی غزل گوئی نہ صرف اسلوب اور آہنگ کے لحاظ سے ایک نئی انفرادیت اختیار کر گئی ہے بلکہ اس میں ایک تو موضوع کا تنوع پیدا کر دیا اور دوسری خصوصیت یہ کہ پیچیدہ عصری مسائل بھی در آئے ہیں۔ زبان و بیان کی چستی اور لفظوں کی گہرائی حامدی کاشمیری کی غزل گوئی کو معنویت عطا کرتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے فراق گورکھپوری اور حامدی کاشمیری کے بیچ امتیاز و تقابل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”فراق صاحب اور حامدی کاشمیری میں فرق ہے تو صرف یہ کہ فراق صاحب کی زبان میں وہ کچا پن اور انداز میں وہ خود اعتمادی ہے جو ہمارے زمانے کے پی۔ ایچ۔ ڈی اور فراق صاحب کے زمانے میں بی۔ اے کے طالب علم کا صفت تھا اور حامدی صاحب نے اتنے

بڑے بڑے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ جن کو دیکھ کر بوعلی سینا کو بھی جھرجھری آجائے۔"
شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ الفاظ حامدی کاشمیری کی نقد میر کے تعلق سے استعمال کیے ہیں اور اگر دیکھا جائے تو اس کا تھوڑا تھوڑا عکس حامدی صاحب کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔

موصوف ایک صاحب اسلوب شاعر ہیں۔ ان کا منفرد اسلوب انھیں معاصر شعرا میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا شعری اسلوب نئے آہنگ اور نئے مزاج سے پوری طرح آشنا کراتا ہے۔ ان کی غزلیات میں تنوع اور رنگارنگی ہے۔ یہ تنوع صرف مضامین اور موضوعات کے انتخاب اور اظہار تک محدود نہیں رہ جاتا بلکہ اس کا دامن شاعر کے اسلوب تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے تخلیقی ذہن کا ایک اہم جز اُن کا عصری شعور ہے جو مادّیت پرستی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی کے انسانیت سوز نتائج سے لبریز ہے۔ دراصل عصری حسّیت کی شدت نے حامدی کاشمیری کی شاعری کو اذیت ناک اور دہشت خیز احساسات کی شاعری بنا دیا ہے۔

بہرکیف یہ بات بالکل واضح ہے کہ حامدی کاشمیری کی شاعری اپنے اندر عمیق تجربات سموئے ہوئی ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حامدی کاشمیری کی شاعری ان کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ سماج اور کائنات کے متعدد و متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں عصری حسّیت، خارجی کرب، داخلی انتشار، سیاسی و سماجی مسائل اور فکر و فلسفہ کے بے شمار عناصر موجود ہیں۔ چونکہ وہ ایک لمبے عرصے سے لکھ رہے ہیں لہٰذا ان کے شاعرانہ لہجے، آہنگ اور ڈکشن میں وقتاً فوقتاً کافی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ ان کے یہاں ایک نئی شعری کائنات، آسیب زدگی، غیر یقینیت، نارسائی اور نادیدہ طلسمی دنیاؤں کا احساس ہوتا ہے۔ حامدی صاحب کی شاعری میں شدت اور نفاست کا روّیہ اس قدر نظر آتا ہے کہ یہ ان کے تخلیقی عمل کا روّیہ معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تجربہ روشن اور اس کی تمام لکیریں رنگارنگ نظر آتی ہیں۔ انھوں نے شاعری میں شدت کے عنصر کو برقرار رکھنے کے لیے آہستہ روی کے توازن کو بگڑنے نہیں دیا۔ اس توازن کی وجہ سے ان کی شاعری سستی لفظ بازی کا شکار نہیں ہو پائی۔ حامدی کاشمیری کی شاعری میں فن و فکر کی کئی امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

حامدی کاشمیری نے استعارات و علامات اور تراکیب کے استعمال سے اپنی غزل گوئی میں جو حسن پیدا کیا ہے وہ ان کی خلاقانہ ذہنیت اور فکری و فنی شعور کا بہترین مظہر ہے۔ منفرد ڈکشن، لب و لہجہ، موضوع و ہیئت، شائستہ اسلوب، زبان و بیان کی سادگی، چھوٹی بحر کا استعمال اور عصری حالات کی عکاسی حامدی کاشمیری کی غزل گوئی کا طرۂ امتیاز ہے۔ حامدی کاشمیری کی شاعری حسن و عشق، طنزیہ انداز، فلسفیانہ اور عارفانہ خیالات، کشمیر کے حالات و کوائف، ذاتی درد و غم کے مضامین، زندگی کی بے ثباتی، روایتی رنگ، رنگِ تغزل اور بے ساختگی، موسیقیت اور غنائیت، جذباتیت، رجائیت، زبان و بیان، استعارہ سازی، لسانی تشکیل، رومانیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اثرات، مقامیت و کشمیریت وغیرہ خصوصیات کی حامل ہیں۔ حامدی کاشمیری کی شعری طبیعت میں زود گوئی ہے۔ انھوں نے ایک دن میں تیس غزلیں کہنے کا اعتراف تک کیا ہے۔ اس کے علاوہ حامدی کاشمیری ایک جدید غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزل گوئی میں تمام شعری محاسن سمٹ آئے ہیں۔ جموں و کشمیر میں اردو غزل کی آبیاری کرنے والوں میں حامدی کاشمیری کا ذکر جلی حروف میں کیا جایا گا۔

ہنس راج اَبرول معروف بہ قلمی نام عرش صہبائی سرزمینِ کشمیر میں عہدِ حاضر کے سب سے بزرگ اور استاد شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں ان کی حیثیت اور شناخت کافی مستحکم ہو چکی ہے۔ حامدی کاشمیری، حکیم منظور، فاروق نازکی، پرتپال سنگھ بیتاب وغیرہ ان کے معاصرین میں شمار ہوتے ہیں۔ عرش صہبائی کا شعری اثاثہ کم از کم ستر برسوں پر محیط ہے۔ میدانِ شاعری میں آغاز ہی سے ان کا رجحان غزل گوئی کی طرف تھا۔ اس کے علاوہ عرش صہبائی معروف شاعر جوش ملسیانی کے سلسلۂ تلمذ میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ ان کے اب تک کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''شکستہ جام''، ''شگفتِ گل''، ''صلیب''، ''یہ جھونپڑے یہ لوگ''، ''اسلوب''، ''ریزہ ریزہ وجود''، ''توازن''، ''نایافت'' (2004)، ''عکس جمال'' (2007) اور ''جواز'' (2011) وغیرہ شامل ہیں۔ آخر الذکر تین مجموعے نئی صدی کے گذشتہ برسوں میں منظر عام پر آئے ہیں۔

عرش صہبائی سے متعلق خاص بات یہ ہے کہ وہ ایک مکمل شاعر ہیں اور زندگی بھر گیسوئے شعروادب کو ہی سنوارتے رہے ہیں۔انھوں نے شاعری میں نت نئے تجربے کیے اوران تجربوں کو برتنے میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔حامدی کاشمیری کی طرح عرش صہبائی کو بھی مختلف ادبی تحریکات ور جحانات سے واسطہ پڑا۔انہی کی طرح ان کلام بھی برصغیر کے معتبر رسائل وجرائد کو رونق اور وقار بخشتا رہا۔عرش صہبائی کا کلام اہمیت میں کسی ممتاز شاعر سے کم نہیں۔بلکہ ہندوپاک میں ان کا اوران کی شاعری کا احترام کیا جاتا ہے۔عرش صہبائی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے ہیں۔ان کی شاعری میں استقلال اور ضبط وتحمل نظر آتا ہے۔وہ شاعری سے کبھی مضمحل نہیں ہوئے بلکہ شاعری میں ان کی ثابت قدمی نے مثال قائم کردی ہے۔حالیہ ستر برسوں میں ان کی غزل کا اچھا خاصا سرمایہ وجود میں آیا ہے۔دیگر اصنافِ سخن کی بہ نسبت غزل ہی وہ صنف ہے جس میں عرش صہبائی کا قلم چل پڑا ہے۔ان کی غزل گوئی میں اعتماد کا رنگ جھلکتا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں عصری واقعات اور درپیش مسائل کو خوداعتمادی کے ساتھ بیان کیا ہے۔انھیں وقت کے مختلف رنگوں میں اپنے آپ کو رنگنا اچھی طرح آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ گذشتہ صدی کی بہ نسبت ان کے شعری رنگ وآہنگ کی نوعیت اب یکسر بدل گئی ہے۔وہ دن گئے جب عرشؔ کی غزلوں جام وسبو، ساقی ومیخانہ، رندومستی، عشق ودیوانگی، یاس وحسرت، غم زدگی وبیگانگی، راحت وسکوں، اضطراب اوراضمحلال، لب ورخسار وغیرہ کا پیمانہ جھلکتا تھا۔آج کے عرش صہبائی میں ایک مفکر، سنجیدہ، حساس، باشعور اور دردمند شاعر کی بے شمار خوبیاں موجود ہیں۔اس سے پہلے جو خوبیاں تھیں وہ اپنے عہد کی عکاس ہیں اور آج کی خوبیاں اس عہد کی ترجمان ہیں۔یہی سب عناصر ایک شاعر کی شاعری کو وقار اور وقعت سے ہمکنار کراتے ہیں۔عرش صہبائی کے پہلے شعری مجموعہ کے گفتنی میں امیؔر بدایونی عرشؔ کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’کسی شعر میں شوخی ہے تو ایسی کہ عُریانی یا بے تکلفی کی ہوا تک نہیں لگی۔ محبوب کو پاکر طالبِ علم کس قدر بوکھلا جاتا ہے اور کیسی بازاری باتیں کرتا ہے اس کو سب جانتے ہیں۔اگر عرش بھی اس میدان میں کھیل

کھیلتے ہیں تو مقامِ تعجب نہ تھا کیونکہ وہ جوان ہی نہیں نوجوان ہیں۔مگر اُن کے تغزل میں وہ ٹھہراؤ ہے جو کسی بوڑھے سے تجربہ کار اور خوددار شاعر میں ہوتا ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے عرشؔ صہبائی کی ابتدائی شاعری کی خصوصیات سے متعلق اچھی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔اس اقتباس کا آخری جملہ عرشؔ صہبائی کی غزل گوئی کو امتیاز عطا کرتا ہے۔جو اس طرح ہے کہ''اُن کے تغزل میں وہ ٹھہراؤ ہے جو کسی بوڑھے سے تجربہ کار اور خوددار شاعر میں ہوتا ہے۔''اس کے برعکس عرشؔ کی عصری غزل گوئی کے بارے میں بلاشک وشبہ وبغیر تردد کے کہا جا سکتا ہے کہ''اُن کے تغزل میں وہ ٹھہراؤ اور رچاؤ ہے جو کسی نوجوان تجربہ کار، خوددار، باشعور اور حساس شاعر میں ہوتا ہے۔''

عرشؔ کی اکیسویں صدی میں کہی گئی غزلوں میں عصری تازگی ہے جو عہد حاضر میں بھی اپنا اعتماد مسلسل بحال رکھے ہوئے ہیں۔وہ حقیقت پسند انداز میں اس عہد کے حالات و واقعات، تہذیب و معاشرت اور ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں۔عرشؔ صہبائی کی غزلیات میں تخئیل اور فکر کی گہرائی ہے، عصری شعور اور میلان کا امتزاج ہے، روایت اور جدیدیت کی آمیزش ہے، خیالات اور لفظیات کا دلکش برتاؤ ہے، عمق اور تازگی ہے، تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال ہے۔نیز تراکیب وعلامات اور محاورات کو برتنے کی فن کارانہ جوہر ہے۔یہ سب چیزیں ان کی شاعری کو جاودانی عطا کرتی ہیں۔اس ضمن میں عرشؔ صہبائی کی عصری غزل گوئی سے کچھ ایسے ملے جُلے اشعار قارئین کی نذر کرتے ہیں جو ان کی شاعری کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

آوازِ گم شدہ کے سوا اور کچھ نہیں
اس دور میں جو شخص حقیقت پسند ہے

میں مشکلوں کے سامنے جھکتا نہیں کبھی
مجھ کو بڑے وقار سے جینا پسند ہے

نظر میں جو بھی ہے منظر، غبار جیسا ہے
مرا معاشرہ خستہ مزار جیسا ہے

یہی تو زندگی کے ارتقاء کی ہیں بنیاد
حقیقتوں کو کبھی بے لباس رہنے دو

آج کے دور کی ظلمت سے نکالو مجھ کو
اور ترساؤ نہ فردا کے اجالو مجھ کو

ختم ہوگی کبھی دنیا سے یہ دہشت گردی
ہم نے اس حال میں کب تک ہے لٹکتے رہنا

صرف محروم ہیں انسانیت کے جذبے سے
دیکھنے کو سبھی انسان نظر آتے ہیں

آرزوؤں کو بسانا کبھی دل میں پہلے
اور پھر وادیٔ حسرت میں بھٹکتے رہنا

جو زندگی میں رہِ حق پہ چلتا رہتا ہے
وہ شخص اہلِ زمانہ کو کھلتا رہتا ہے

اس کے ہر منظر پہ مٹ جا، اس کا پس منظر نہ دیکھ
زندگی اک خول ہے اس خول کے اندر نہ دیکھ

متذکرہ بالا کے علاوہ اس نوع کے کئی اور شعر ہیں جنھیں عرش صہبائی کی غزل گوئی کا شعری اختصاص کہا جا سکتا ہے۔ ان سے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں کہ عرش صہبائی کا لب و لہجہ موجودہ عہد میں کس قدر بدل گیا ہے اور کیوں کر بدل گیا ہے۔ اس کے لیے ان کی

شاعری کا مطالعہ کرنا بہت لازم وملزوم ہو جاتا ہے۔

عرش صہبائی کی شاعری پر اس عہد کے اچھے خاصے اثرات پڑتے نظر آتے ہیں جن سے انھوں نے اپنا دامن بچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان اثرات کو قبول کر کے انھوں نے اپنی شاعری کو جدّت سے ممیّز کیا ہے۔ عرش صہبائی اس عہد کی غزلیات میں اپنے جذبات وخیالات کا اظہار بھی موثر طریقے سے کرتے ہیں۔ عرش صہبائی حقیقت پسند شاعر ہیں اور بے باک شعری لہجہ رکھتے ہیں۔ انھیں بخوبی احساس ہے کہ ظلمت کا اندھیرا چھا رہا ہے جس میں سچائی اور اصول پرستی کا خونِ ناحق ہوتا ہے۔ آج کا معاشرہ خستہ حالت میں ہے۔ حالانکہ عرش نے اُس پر بہت طنز کیا ہے جو ظلم سہنے کا عادی ہو گیا ہے اور سچائی کو برداشت کرنے کا تحمل کھو چکا ہے۔ عرش کی شاعری میں اعتماد ہے اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی۔ وہ دہشت گردی کو قوم کے لیے مضر ٹھہراتے ہیں جس سے بے گناہوں کا کشت وخوں ہو، جس سے انسان کی بقا خطرے میں پڑ جائے، جس کے شکنجے میں مظلوم و نادار اور بے بس لوگ آ جاتے ہیں۔ عرش صہبائی کی شاعری میں زمانے کی شورش پسندی کے سبب اضطراب اور اضمحلال کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کا ان کی شاعری میں جگہ جگہ اظہار ہوا ہے۔

عرش صہبائی کی غزلیہ شاعری میں کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے، تو کہیں ملال اور غم کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ اس میں فکر کا پہلو بھی ہے اور طنز کی کاٹ بھی۔ اس میں پُر اعتمادی بھی ہے اور شگفتہ مزاجی بھی۔ اس میں آرزوئیں اور حسرتیں ہیں تو ان کی تعبیر کا خواب بھی پوشیدہ ہے۔ عرش صہبائی کی شاعری جتنی سادہ نظر آتی ہے، اتنی ہی اس میں معنویت کی تہہ داری بھی ہے۔ جو لطف وانبساط بھی پہنچاتی ہے اور غم انگیز حالات سے آشنا بھی کراتی ہے۔ ان کی غزلیں سادگی اور پُرکاری کا اعلیٰ نمونہ کہی جا سکتی ہیں۔ جن میں چاشنی بھی موجود ہے اور شیرینی بھی۔ عرش زبان وبیان پر عبور اور ردیف اور قافیہ کے استعمال میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ عہدِ حاضر کا ہر موضوع ان کی غزل میں در آیا ہے۔ ان کی شاعری اپنے معاصرین سے الگ معنویت اور اہمیت رکھتی ہے۔ عرش صہبائی کا شعری سفر رواں دواں ہے۔ مستقبل میں ان کے ذہن و دل وقلم سے کئی اور فکر انگیز غزلیں وجود میں آنے کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔

فاروق نازکی دورِ حاضر کے چند اہم اور ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وادیٔ کشمیر کے شعرا میں انھیں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اردو شعروادب کے گیسو سنوارنا ان کی خاندانی وراثت میں ہے۔ فاروق نازکی وادی کے نامور اور مقبولِ عام شاعر غلام رسول نازکی کے سپوت ہیں۔ ایاز رسول نازکی بھی انہی کے خاندان سے ہیں اور وہ بھی شعروادب کے بال و پر سنوار رہے ہیں۔ غرض کہ ان کے پورے خاندان کو علمی و ادبی انجمن کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ فاروق نازکی لمبے عرصے سے شاعری کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری نے کئی منزلیں طے کی ہیں، کئی دور دیکھے ہیں اور اس دوران انھیں کئی قسم کے تجربوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مگر فاروق نازکی کی شاعری ہر دور میں اپنی پوری آب و تاب اور شان و شکوت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ انھیں شاعری کی ہر صنفِ ادب پر کامل عبور ہے۔ مگر غزل اور نظم میں وہ ایک خاص انفرادیت رکھتے ہیں۔ برسوں پہلے ان کے دو شعری مجموعے منظر آئے تھے مگر ان مجموعوں کے بعد آج تک ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہو سکا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''آخری خواب سے پہلے'' (1990) اور دوسرا ''لفظ لفظ نوحہ'' (1994) پر مشتمل ہے۔ لیکن وقفے وقفے سے غزلیں کہتے ہیں اور شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے اُن کی مصروفیات مجموعے کی اشاعت میں آڑھے آئی ہو۔ ویسے فاروق نازکی ''کم کہو، اچھا کہو اور اپنا کہو'' میں یقین رکھتے ہیں اور اس سے ان کے مجموعہ کلام میں اشاعت کی تاخیر سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن اب تک ان کا جتنا بھی کلام شائع ہوا ہے اس سے ان کی انفرادیت، اہمیت اور وقعت کا احساس بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

فاروق نازکی کے معاصرین میں حکیم منظور، عابد مناوری، مظفر ایرج، سلطان الحق شہیدی، عرش صہبائی، حامدی کاشمیری وغیرہ قابلِ ذکر شعرا شامل ہے۔ مگر ان کا شعری لب و لہجہ اپنے معاصرین کیا یہاں تک کہ جدید نسل کے شعرا سے بھی الگ اور منفرد نظر آتا ہے۔ فاروق نازکی کی شاعری فکر، سوچ، تخئیل، قوتِ مشاہدہ اور اندازِ بیان کی وسعت سے مالامال ہے۔ ان کی شاعری سادہ بیانی، ندرت اور پرکاری کا اعلیٰ نمونہ کہی جا سکتی ہے۔ اکیسویں صدی میں ان کا جتنا شعری سرمایہ جمع ہو چکا ہے، اس میں غزلیں زیادہ ہیں اور نظمیں کم۔ ہم

یہاں پر ان کی غزل گوئی پر بات کر رہے ہیں اور وہ بھی نئی صدی میں ان کی کہی ہوئی غزل گوئی کے حوالے سے۔

فاروق نازکی بھلے ہی مدتوں سے شعر کہہ رہے ہوں لیکن ان کی شاعری میں جو جلال و جمال آج سے تیس چالیس برس پہلے نظر آتا تھا۔ وہی جلال اور وہیں کمال ان کی عصری غزل گوئی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ان کی غزلوں میں تخئیل کی بلندی اور فکر کی پرواز ہے۔ سنجیدگی اور شعور کی بالیدگی ہے۔ان میں تلخ حقیقتوں کے راز پنہاں ہیں،شوخی اور کسک ہے، عشق ومحبت اور کچھ بھولی دسری یادیں ہیں،کہیں کھونے کا غم اور کہیں دل کی کیفیت کا اظہار ہوا ہے، کہیں ہمت وحوصلہ ہے اور کہیں فخریہ انداز۔فاروق نازکی کی غزل گوئی میں جہاں مکاری اور چال بازی کی جلوہ گری ہے، وہیں دہشت زدہ ماحول کا خوف بھی عیاں ہوتا ہے۔ان میں عصری زندگی کی گھٹن ہے اور اظہارِ تاسف بھی۔ وہ اپنی غزلوں میں انسان کو اصلیت اور اس کے حدود سے آشنا کراتے ہیں۔فاروق نازکی نے اس صدی میں جو غزلیہ شاعری کی ہے اس میں سے کچھ اشعار یہاں پر پیش کیے جا رہے ہیں۔جن سے ان کے تغزل کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

وقت کو جن پہ کبھی ناز رہا، ہم ہی تھے
وقت بے وجہ جنھیں بھول گیا، ہم ہی تھے

یہ لوگ ذہن میں کانٹے بچھائے بیٹھے ہیں
اگر چہ پھول ہی وجہ سوال ٹھہرا ہے

اُسی نے سب کے رگ و پے میں زہر گھول دیا
وہ ایک شخص جو شیریں مقال ٹھہرا تھا

فصلِ گُل کے بعد پت جھڑ، یوں تو ایک معمول ہے
خوف بن کر پھر در و دیوار پہ چھائے گا کیا؟

میری بے بسی کے حصار میں مجھے چھوڑ کر جو چلا گیا
تو خدا ہے تجھ سے بعید کیا، اُسے لوٹنے کا خیال دے

نہ گئے دنوں کا گلہ کوئی، نہ رفاقتوں کی شکایتیں
جو گزر گیا سو گزر گیا، مجھے بے کلی سے نکال دے

ہم زمینوں کی بھی خبر رکھنا
زلزلہ آسمان پر رکھنا

طوفانوں کی آمد ہے
پنچھی لوٹ رہے ہیں گھر

فاروق نازکی کا شعری لہجہ اور آہنگ اتنا توانا اور تازہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کو دیکھ کر بالکل بھی یہ شبہ نہیں ہوتا کہ کسی ستر پچھتر برس کے شاعر کا کلام ہوگا۔ ان کی غزلیہ شاعری میں استفہامیہ انداز ہے جو قاری کو تجسس میں ڈال دیتا ہے۔ نیز مکالماتی انداز کی کیفیت بھی بخوبی اجاگر ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں ان کے کہے گئے بیشتر کلام کا اسلوب سادہ رہا ہے اور اس کے علاوہ چھوٹی بحور و اوزان میں کہا گیا کلام بھی قاری کو متاثر کرتا ہے۔ لیکن نئی صدی کی کچھ غزلوں میں وہ اسلوب کہیں کہیں زائل ہوتا نظر آتا ہے۔ جہاں تک بحور و اوزان کا تعلق ہے تو اس میں جدت اور نئے پن کا عنصر جھلکتا ہے۔ شعری محاسن علامتوں، استعاروں، ترکیبوں، پیکروں اور مرقع نگاری کا ان کی غزلوں میں لاجواب امتزاج ملتا ہے۔ نیز ان کی غزلیں رمز و ایمائیت کے جاذب استعمال کا بہترین نمونہ ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے ان میں تنوع کا رنگ پیدا ہوا ہے۔ ان کی غزلوں میں معنی و مفاہیم کی کئی پرتیں وا ہوتی ہیں جو ان کی غزلوں کو استحکام عطا کرتی ہیں۔

فاروق نازکی کی عصری غزلیں اس عہد کی بھرپور عکاس ہیں۔ معاشرتی تضادات، انسان کی بے اعتمادی، بے یقینی، فریب کاری، اخلاقی قدروں کی گراوٹ، تہذیبی ناشائستگی،

ظلم و جبر، تحیر و استعجاب، فساد کی ہولنا کی اور عصر کی حشر سامانی کا اندازہ فاروق ناز کی غزلوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ معاشرے کی عصری حقیقتوں اور انسانی ذہن کی بیداری ان کی غزل گوئی کا ایک اہم عنصر قرار دیا جاسکتا ہے۔ فاروق ناز کی اس شعری سفر کو ابھی رواں دواں رکھے ہوئے ہیں اور امید ہے کہ مستقبل میں بھی ان کی نئی تخلیقات سے استفادے کا موقع مل جائے گا۔

پرتپال سنگھ بیتاب نے ماقبل اکیسویں صدی بڑی برق رفتاری کے ساتھ شعر و شاعری کی ہے اور بہت اچھی شاعری کی ہے۔ یہی وجہ اردو شعر و ادب کی دنیا میں اُن کی ناموری اور شہرت کی باعث بنی۔ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے بعد اُن کی اِس رفتار میں اور بھی تیزی آئی۔ ہماری ریاست میں اگرچہ سکھ شاعر و ادیب زیادہ نہیں ہیں لیکن کچھ کم بھی نہیں ہیں۔ البتہ یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ سکھ کمیونٹی کے شاعروں کی تعداد ابتدا ہی سے بہت کم رہی ہے۔ اس صورتِ حال میں یہ افضل ہے کہ پرتپال سنگھ بیتاب سکھوں میں اس قندیل کو روشن کیے ہوئے ہیں اور اردو شاعری میں سکھوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیتاب کی شاعری کیا دوسرے معاصر شعرا سے کسی قدر کم تر ہے۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہیں۔ اگر بیتاب کی شاعری کا اپنے عہد کے کسی ممتاز شاعر کی شاعری سے موازنہ کیا جائے تو بیتاب ہر اعتبار سے ایک بہترین شاعر قرار پاتے ہیں۔ راقم الحروف کے پاس پرتپال سنگھ بیتاب کا جتنا کلام موجود ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیتاب کی شاعری پانچویں دہائی میں قدم رکھ چکی ہے۔ انھوں نے اردو کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اردو غزل اور نظم پر انھیں خاص طور پر دسترس حاصل ہے۔

پرتپال سنگھ بیتاب کو عموماً غزل کا ہی شاعر کہا جاتا ہے۔ جب کہ اردو نظم پر ان کا ایک مبسوط مجموعہ کلام "نظم اکیسویں صدی" بھی شائع ہو چکا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیتاب کا دائرہ کار شاعری میں صرف غزل ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ نظم نگاری کے بھی بڑے شہسوار ہیں۔ ان کا شمار وادیٔ کشمیر کے سینئر اور جدید ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی اسی دور میں شاعری کا آغاز کیا جب کشمیر آگ کی لپیٹ میں تھا۔ ویسے بھی ریاست جموں و کشمیر میں آزادی کے بعد حالات کبھی سدھرے ہی نہیں۔ یہاں کے لوگ ہمیشہ سے ہی کبھی

سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے اور کبھی فتنہ وفساد برپا کرنے والے لوگوں کے شکار ہوئے۔ لیکن ان حالات کا سامنا کرتے ہوئے بیتاؔب نے اپنا شعری سفر جاری رکھا اور اس کو نئی منزل کی جانب گامزن کیا۔ وہ منزل جس پہ آج وہ براجمان ہیں اور جہاں انھیں ایک قد آور شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ان کے اب تک آٹھ شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ جن میں ''پیش خیمہ''، ''سراب در سراب''، ''خود رنگ''، ''کیکٹس اور گلاب''، ''موجِ ریگ''، ''شہرِ غزل''، ''فلک آثار'' اور ''نظم اکیسویں صدی میں'' قابل ذکر ہیں۔ یوں تو آخرالذکر شعری مجموعے کو چھوڑ کر ان کے تمام شعری مجموعوں میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ ''موجِ ریگ (2003)''، ''شہرِ غزل (2008)'' میں صرف غزلیں اور ''فلک آثار (2013)'' میں ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ یہ بیتاؔب کے وہ مجموعے ہیں جو اکیسویں صدی میں شائع ہوئے ہیں اور جن میں ان کی اکیسویں صدی میں کہی ہوئی غزلیں ہیں۔ اس سے بیتاؔب کی غزلیہ شاعری کے زخیرے کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔

پرتپال سنگھ بیتاب اس عہد کے مقبول غزل گو شاعر ہیں۔ انھوں نے بحیثیت ایک غزل گو اپنا لوہا منوایا ہے۔ اُن کی غزلیں بہت قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''پرتپال سنگھ بیتاب نئے شاعروں کی اس صف میں ہیں جو اس وقت نمایاں ہونا شروع ہوئی جب نئی شاعری کے سلسلے میں اٹھنے والی بحثوں اور اختلافات کی گرد بڑی حد تک بیٹھ چکی تھی۔'' ان خیالات کا اظہار فاروقی صاحب نے بیتاؔب کے پہلے شعری مجموعے ''پیش خیمہ'' کے پیش لفظ میں کیا ہے۔ جو تیں پینتیس سال پہلے لکھا جا چکا ہے۔ لیکن گذشتہ سولہ سترہ برسوں میں ان کا جو غزلیہ کلام وجود میں آیا ہے اس سے ان کی ماقبل اکیسویں صدی کی شاعری اور موجودہ صدی کی شاعری میں جدت وندرت اور معنی آفرینی کا پتہ چلتا ہے جس میں انھیں اپنے عہد کے کئی شاعروں پر سبقت حاصل ہے۔ بیتاؔب کی غزل گوئی کو ایک امتیاز حاصل ہے اور وہ ہے ان کا منفرد تخلیقی رنگ جو انھیں دوسرے معاصر شعرا سے الگ کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں بے شمار شعری محاسن موجود ہیں، وہیں وہ اس عہد کی کرب انگیزی کو بھی موثر طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ بیتاؔب نے اپنی شاعری کو محض ذات تک محدود نہیں

رکھا بلکہ انھوں نے اس کو کائنات کے مختلف رنگوں کی مالا میں پرو دیا ہے۔ان کے نمونۂ کلام سے حظ اٹھائیں:

راز موجوں کے سمندر نے بتائے ہیں مجھے
یہاں ڈوبوں گا کہیں اور ابھر جاؤں گا

اے مرے خدا مجھ کو یہ توفیق عطا کر
جو دل پہ گزرتی ہے وہ اظہار میں آوے

حادثوں کے شہر میں اِک حادثہ یہ بھی ہوا
ایک شیشہ آ گیا ہے پتھروں کے درمیان

وشت میں تھی بلا کی تاریکی
دُور روشن کہیں تھا کوئی کھنڈر

مجھ سے باہر مرا سراغ نہیں
میں کہ منزل بھی ہوں نشاں بھی ہوں

زمیں کا لمس مِل جائے تو اتروں
ابھی تو پاؤں کے نیچے خلا ہے

میری ہجرت ہی میری فطرت ہے
روز بستا ہوں روز اجڑتا ہوں

زلزلے جس کا مقدر ہو گئے اُس شہر میں
درمیاں اونچے مکانوں کے کھنڈر میرا بھی ہے

وسعتیں ہیں اُسی کی ہفت افلاک
بحروبر بیکرانیاں اُس کی

❧❧

پرتپال سنگھ بیتاب کی غزل گوئی کا مطالعہ کرتے وقت اکثر احساس ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی ردِعمل انتہاؤں تک اور انتہاؤں کے درمیان رونما ہونے والے عوامل کی جمالیاتی تفہیم اور پیش کش سے وابستہ ہے۔اس طرح لامحدودیت کی آرزو بیتاب کی غزل گوئی میں ایک بنیادی محرک کے طور پر سرگرمِ کار ہے۔حدود کی اسیری اور آرزوئے بال و پر بیتاب کی غزلوں میں اظہار کی کم وبیش دو انتہائیں ہیں۔بلراج کومل ''موجِ ریگ'' کے پیش لفظ میں بیتاب کی غزلوں میں برتی گئی بحور واوزان کے تعلق سے یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''بیتاب نے بحروں اور لفظوں کے انتخاب میں رواں دواں بحروں اور سامنے کے الفاظ کو غیر ہموار بحروں اور فارسی نژاد الفاظ اور تراکیب پر ترجیح دی ہے۔بیتاب کی وہ غزلیں جو چھوٹی بحر میں ہیں، سہل ممتنع کی زندہ اور دلآویز مثالیں ہیں۔''

(موجِ ریگ از پرتپال سنگھ بیتاب، ص13)

درج بالا اقتباس سے بیتاب کی شاعری میں بحور اور اوزان سے واقفیت حاصل ہوتی ہے جس کو بڑی غیر جانبداری سے بیان کیا گیا ہے۔بیتاب کی غزلیں سادگی اور بانکپن لی ہوئی ہیں۔ان غزلوں میں زمانے کے تلخ ترین حقائق کا اظہار سرمستی کی حالت میں ہوا ہے۔ کیونکہ عصری زوال آمادہ تہذیب کا دردانگیز اظہار بے خودی کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ بصورت دیگر جذبات کی رو اور جوش کی کیفیت میں آنے کے امکانات قوی ہوجاتے ہیں جس کے نتائج تلخ ترین اور ناقابلِ برداشت ہوں گے۔یقین، بدگمانی، ادھوراپن، بکھرنا، سمٹنا، آوارگی، گوشہ نشینی، گھر، بے گھری، خانہ داری، بلندی، پستی وغیرہ بیتاب کا خلق کردہ تخلیقی منظرنامہ سوانحی تفصیل کی میزان سے کہیں افضل تر تخلیقی منظر نامہ ہے۔

جھیل، بحر، کشتی، سمندر، جزیرہ، موج، طوفان، خلا، صحرا، آسمان، کوہسار، پربت

وغیرہ الفاظ بھی بیتابؔ کی شعری اساس کہے جاسکتے ہیں۔انھوں خاک،کھنڈر،قبریں،وشت، خرابے،خار،جنگل،شہر،زندگی،دنیا،پرواز،دھوپ،بھیڑ وغیرہ جیسے الفاظ بھی اپنی شاعری میں جابجا استعمال کیے ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری کا احاطہ اس مختصر سی گفتگو میں ممکن نہیں۔ ان کی غزلیں بے کراں معنی اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہیں۔بیتابؔ کی غزلیں تابانی سے معمور ہیں جو وسعت افلاک کی مانند مطالعہ اور غور وخوذ کی دعوت دیتی ہیں۔

مظفر ایرج دورِ حاضر کے شعرا کی صف میں ایک اہم مقام پر فائز ہیں۔اردو شاعری میں ان کی حیثیت مستند ہے اور اپنے معاصرین میں بھی وہ ایک اونچے پائیدان پر براجمان ہیں۔ مظفر ایرج برسوں سے اردو ادب کی خدمت کرتے آرہے ہیں۔وہ آج بھی اردو شعروادب کی خدمت گزاری کا سلسلہ مسلسل جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔اردو شاعری کو وسعتوں سے ہمکنار کرانے میں ان کا بہت اہم رول رہا ہے۔اردو غزل اور نظم میں انھیں خصوصی اختصاص حاصل ہے۔لیکن غزل ان کی شناخت کا قابل قدر ذریعہ بنی ہے۔یہی وہ صنف ہے جو مظفر ایرج کی ریاست و بیرون ریاست میں شہرت کی ضامن بنی۔مظفر ایرج کے پانچ شعری مجموعے ہیں جن میں ''ابجد''،''انکسار''،''ثبات''،''دل کتاب'' اور ''ہوا دشت دیار'' قابل ذکر ہیں۔موخرالذکر تین شعری مجموعے بالترتیب 2007، 2009، اور 2010 میں شائع ہوئے ہیں۔اس طرح نئی صدی میں ان کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔جو انھیں اکیسویں صدی کے جدید شعرا میں شمار کرنے کے لیے کافی ہے۔

شاعر قدیم ہو یا جدید، سینئر ہے یا جونیئر اس سے شاعر کی شناخت متعین نہیں ہوتی۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ شاعر کی تخلیق کس قدر اپنے اندر معنویت رکھتی ہے۔اس کی شاعری کا کیا موضوع ہے؟۔شاعر جس عہد میں زندگی جی رہا ہے کیا وہ اس عہد کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے؟۔ کیا اس کی شاعری وقت یا زمانے کی متقاضی ہے؟۔کیا وہ اپنے عہد کے شعری اصول وضوابط پر کاربند ہے؟۔اس کا شعری آہنگ اور لب ولہجہ سماج و معاشرت سے ہم آہنگ ہے کہ نہیں؟۔ کیا اس کی شاعری میں جدت ہے؟۔موضوعات میں کس حد تک تنوع ہے؟۔کہیں روایتی یا فرسودہ موضوعات تو نہیں اپنائے ہیں؟۔اپنے معاصر شعرا کی بہ نسبت اس نے ہیئت واسلوب

میں کس طرح کے تجربے کیے ہیں؟۔کیا اس کی شاعری پائیدار ہے؟۔اس کی شاعری سماجی تقاضوں پر کھری اترتی ہے کہ نہیں؟۔اس کی شاعری کس قدر لوگوں کی توجہ کو اپنی جانب توجہ مبذول کراتی ہے؟ وغیرہ۔یہ اور اس نوعیت کی کئی اور باتیں ہیں جو کسی بھی شاعر کی کامیابی کی راہ کو متعین کرتی ہیں۔

مظفر ایرج ریاست کے وہ شاعر ہیں جن کی شاعری میں سطور بالا میں مذکور تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔انھوں نے اردو غزل خصوصاً نئی غزل کو بہت وسعت بخشی ہے۔نئی صدی میں ان کے شائع ہو چکے شعری مجموعوں میں کچھ اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے جو یہاں پر ان کی غزل گوئی کی نمائندگی کر رہے ہیں۔اس کو مظفر ایرج کی شاعری کا ایک جز سمجھئے نہ کہ کل۔ملاحظہ کیجیے:

مغرب سے آفتاب اُبھرنے کی دیر ہے
مشرق سے کوئی سورج اُگے گا نہ سوچئے

جلتی ہوئی اُجاڑ زمینوں کی کوکھ سے
یادوں کا کوئی پھول کھلے گا نہ سوچئے

وہ تو احساس ہے رگ رگ میں اتر جائے گا
صورت میں شعلہ جلائے گا گزر جائے گا

کچھ نہ کچھ لُوٹنے والا ہے خوشی کا موسم
در و دیوار سلامت ہیں تو سر جائے گا

ہم کو مانوس کر اندھیروں سے
اور پھر روشنی دِلوں میں اُتار

رُک جانا تم میں آؤں گا رات ڈھلے
اپنا تن من بکھراؤں گا رات ڈھلے

ساتھ کسی دن ٹھہرو گے تنہائی میں
پھر نہ مجھے تم بہلانے کی بات کرو

میں نے پڑھی، پڑھی ہی نہیں عشق کی نماز
سجدے میں جا کے سوچنا آشفتہ سری تھی

مظہر امام اور کچھ دوسرے ناقدین نے مظفر ایرج کو نظم کا شاعر کہا ہے۔ بلاشبہ مظفر ایرج کی نظمیں فن کی بلندیوں کو چھوتی ہوں گی۔ لیکن انھوں نے جو اضافہ اردو غزل میں کیا ہے اور اس میں جو معیار قائم کیا ہے وہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ وہ شاعری کی اپنی مقرر کردہ شاہراہ پر چلتے ہیں۔ بنے بنائے اصولوں سے بھی ذرا اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا شعری اسلوب اپنے معاصرین سے بالکل الگ ہے۔ البتہ چھوٹی بحر میں کہی گئی غزلیں ان کے معاصر شاعر فاروق نازکی کے یہاں بھی ملتی ہیں لیکن شعری ڈکشن دونوں غزل گو شعرا کا منفرد ہے۔ اردو کے قدیم شاعر میر سوز کی غزلوں کی بحر بھی مظفر ایرج کی غزلوں سے مماثلت و مناسبت رکھتی ہے۔ متانت و سادگی میں بھی ایرج کی غزل گوئی میر سوز کی غزل گوئی سے مطابقت رکھتی ہے۔ تاہم مظفر ایرج کی شاعری میں جدید حسیت کی ہم آہنگی کے ساتھ عصری تقاضے بھی سمٹ آئے ہیں۔ عصری حالات سے جوجھتی انسانیت کی نقاب کشائی کی جھلک یہاں پر خوب دیکھنے کو ملتی ہے۔ استفہامیہ اور مکالماتی پن ان کے یہاں بھی نکھر آیا ہے۔ طنز کی کیفیت بھی صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ مظفر ایرج کی غزلوں میں غنائیت کے عنصر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ سادگی، برجستگی، شائستگی، متانت اور شستہ پن ان کی غزلوں میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ ناقدین کے مطابق مظفر ایرج نے روایت پسندی اور روایت شکنی سے ذراہٹ کر شاعری کی ہے اور اپنے شعری اسلوب کی انفرادیت کی خاطر ایک طرح کا تیسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ جس میں انھوں نے لہجے کی صلابت، بے ساختگی، بصری پیکروں کا وفور اور اظہار میں طلسماتی فضا جیسی خوبیاں پیدا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ مظفر ایرج نے چار چار لفظوں پر مشتمل مصرعے کہہ کر بھی اشعار میں معنویت پیدا کر دی ہے۔ انھوں نے نئی صدی کی غزل کو نئی، منفرد اور رنگارنگ علامتوں

سے پرو دیا ہے، علامتی اظہار ان کی غزل کو توانائی فراہم کرتا ہے۔

مظفر ایرج کی غزل گوئی سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ایک عام سی بات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کی انھیں فن کارانہ مہارت حاصل ہے۔جس سے نہ شعر کا حسن زائل ہوتا ہے اور نہ ہی بات کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔اس طرح وہ بالکل آسان انداز میں قاری تک اپنے پیغام کی ترسیل کردیتے ہیں۔ نغمگی کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں گیت کا سا حسن بھی نظر آتا ہے۔ناقدین میری بات سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن مظفر ایرج کی جو غزلیں کانوں میں رس گھولتی ہیں ان میں گیتوں کا حسن کارفرما ہے۔جب کبھی پورا مضمون لکھنے کا موقع ملے گا تب راقم الحروف مثالوں کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری مظفر ایرج کے یہاں صاف عیاں ہوجاتی ہے۔بنتے بگڑتے اور بکھرتے ٹوٹتے رشتے، یکجہتی اور بھائی چارگی کا نہ ہونا، اپنی ذات اور کسی کی جدائی کا کرب، فرد کی محرومی اور موجودہ دور کا آشوب، مایوسی، غمگینی، بے بسی، تنہائی، شکستگی، درد و کسک وغیرہ کا احساس مظفر ایرج کی غزل گوئی کا طرۂ امتیاز ہے۔موجودہ صدی میں مظفر ایرج کی بے شمار غزلیں شائع ہوئی ہیں جو ان کی شاعری کو جلا بخشتی ہیں۔

رفیق راز کا شمار عہد حاضر کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے نہ صرف ریاست جموں و کشمیر میں اردو اور کشمیری شعر و ادب میں اپنا نام درج کرایا ہے بلکہ کشمیر کی سرحد کو پھلانگتے ہوئے ہندو پاک میں بھی اپنی شہرت اور مقبولیت کا جھنڈا گاڑا ہے۔ان کی غزلیں تمام معتبر و مستند رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں اور مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔رفیق راز غالباً پچھلی پانچ دہائیوں سے شعر و شاعری کر رہے ہیں لیکن 1980 کے بعد انھوں نے باقاعدہ طور پر اپنے عہد کے شعرا سے انفرادیت حاصل کی اور ساتھ ہی ممتاز مقام پایا ہے۔رفیق راز کا پہلا شعری مجموعہ ''انہار (2004)'' اور دوسرا شعری مجموعہ ''مشراق (2009)'' اور تیسرا شعری مجموعہ ''نخلِ آب (2015)'' میں شائع ہوا ہے۔قابلِ ذکر تینوں شعری مجموعے رفیق راز کی غزلیہ شاعری پر مبنی ہیں۔آخر الذکر شعری مجموعہ ''نخلِ آب'' میں دو چار نظمیں بھی شامل ہیں۔رفیق راز غزل کے معمار شاعر تسلیم کیے گئے ہیں۔رفیق راز کے اکیسویں صدی میں منظر عام

پر آئے ان غزلیہ مجموعوں سے غزل کی زمین شاداب اور زرخیز ہوئی ہے اور اردو شاعری کی وسعتِ دامنی کی بھی علامت ثابت ہوئی ہے۔

رفیق راز کی غزل گوئی میں فکر وشعور کی آگہی، تخلیقی پختگی، اختراعی ذہنیت کی پھوہار، نئی لفظیات کا دلکش استعمال، لسانی نظام کی دروبست، فلسفیانہ اساس، دانشمندانہ اور متخیلانہ انداز، دانائی وقوتِ بینائی کا امتزاج، خارج وباطن کا گہرا ادراک، کائنات کا وسیع وعمیق مشاہدہ، فنی و فکری تازگی، عصری سچائی، زبان وبیان کی پختی، علم ودانش وبینش کی استعداد، اخلاق واقدار کی بازیافت، زندگی کی حقیقت کا انکشاف، دنیا کی ناپائیداری، عزل ونصب کا احساس، ازل وابد کی طرفداری، معنی خیزی ومعاشرتی طنز قاری، اظہارِ ذات کی کرب بیانی، جسمانی، نفسیاتی اور روحانی الجھنوں کا بیان، اسرار ورموز کا انکشاف، حالات اور تاریخی واقعات سے آشنائی، جودت ووحدت کی آمیختگی، حیرت واستعجاب اور تحیر کا مادہ، ماسوائی وماورائی حقائق کا اظہار، بصیرت وبصارت اور روشن خیالی کی آئینہ داری، کار جہاں اور فکر فردا کی فکرمندی اور جذبات واحساسات کی پاسداری وغیرہ ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں سے چند بہترین شعر دیکھئے:

ہم تو اندر سے کوئی غار تھے اب گھر ہوئے ہیں
یعنی آباد اسے کر کے قلندر ہوئے ہیں

بجا، کہ شہر میں ارزاں بہت ہیں خواب مگر
یہاں تو نیند ہی ہم پر حرام ہے سائیں

اوّل فلک پہ آ کے تمہیں نے کہا تھا مانگ
مانگی تو پھر قبول دعا کیوں نہیں ہوئی

دل کے بازار میں ہلچل سی مچادی اس نے
مجھ کو دھوکا ہوا یوسف لاثانی کا

یہ زمانہ ہے چاپلوسی کا
ہم تو واقف نہیں اسی فن سے

اشک سے خاک ہوئی تر یہی بس کافی ہے
ایک بے جان سا پیکر تو بنا سکتے ہیں

گرچہ پرواز کی قوت نہیں خواہش ہے بہت
ہم خیالات کو شہپر تو بنا سکتے ہیں

مژگاں نہ کھول آنکھ کو حیرت سرا نہ کر
جوبن پہ رات ہے ابھی روشن دیا نہ کر

❧☙

رفیق راز کی غزلیات تجربات کی زائیدہ کہی جاسکتی ہیں۔انھوں نے اپنے معاصر کشمیری غزل گوشعرا کی بہ نسبت ایک منفرد قسم کا تجربہ کیا ہے جو انھیں وادیٔ کشمیر کے تمام شعرا سے الگ کرتا ہے۔ان کا اسلوب جداگانہ ہے اور لب ولہجہ بھی۔ان کا ہر شعر ایک نئی فکر اور احساس کی دعوت دیتا ہے۔ان کی غزل کے ہر شعر میں خیالات واحساسات کا جہاں آباد ہوتا ہے۔ان کی بیشتر غزلیں ایسی ہیں جو ایک عام قاری کے فہم وفراست سے بالاتر ہیں۔عصری مسائل سے دوچار اور پُر آشوب حالات کی شکار دنیا، زندگی کے لاتعداد مسائل اور دہشت خیز ماحول سے جوجھتے انسان، انسانی بقا اور قدرت وفطرت کے مناظر کی عکاسی، ایک عام اور مظلوم انسان کی مظلومیت کی آہ وبکا کی پکار، صنعت وحرفت، معاشی تغیر وتبدل اور سائنس وٹکنالوجی کی نت نئی ایجادات، سماجی اور معاشرتی برائیاں، پستی اور بلندی کا احساس، انسانی فطرت اور اس کی مکاریاں، سیاست ومذہب، تہذیب وکلچر، سماجی تبدیلیوں وغیرہ سے متعلق ان کے یہاں اشعار خال خال پائے جاتے ہیں۔جس کو آکال یا سوکھے کے مترادف ٹھہرایا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا اور اگر اس کا تھوڑا تھوڑا دھندلا دھندلا سا عکس کہیں نظر آتا بھی ہے تو اشارے اور

کنایے کی صورت میں۔ بہر حال ہر شاعر کا اندازِ بیان جداگانہ ہوتا ہے۔ رفیق راز کے یہاں بھی اس کی تصویر اجاگر ہوتی ہے۔ ان کا ہنر اس معنوں میں بہت اعلیٰ ہے کہ کسی بھی خیال کو شعر کے قالب میں ڈھال لیتے ہیں اور وہ خیال انسان یا قاری کے ذہن سے پرے نہیں ہوتا۔ مگر یہ رفیق راز ہی کا کمال ہے جو اس خیال کو شعری جامہ پہنا دیتے ہیں اور پھر اسے زندگی اور جاودانی کا روپ عطا کرتے ہیں۔ ان کے شعری اسلوب و ہیئت کو اگر پیچیدہ یا مبہم نہ کہیں تو آسان بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس خیال کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کی آرا پیش کی جاتی ہے جس سے اس کی کافی وضاحت و صراحت ہو جاتی ہے شمس الرحمٰن فاروقی کے بقول:

> ''غزل کے بارے میں مدت تک یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں رہی کہ اسے سادہ اور میٹھا اسلوب ہی درکار ہے۔ بعض لوگوں نے تو غزل میں استعارے کو بھی ناپسند کیا ہے۔ بعض لوگوں سے غزل نے تقاضا کیا کہ اس میں صرف آپ بیتی اور ذاتی داخلی وارداتوں پر مبنی مضامین ہوں۔ رفیق راز اُن شعراء میں نمایاں ہیں جنھوں نے غزل کے اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ ان کے لہجے اور افکار دونوں میں تمکین اور پختگی کے آثار نمایاں ہیں۔''

شمس الرحمٰن فاروقی کے درج بالا اقتباس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعری کی کتنی خوبیاں ہیں۔ اس کی ایک خوبی مذکورہ اقتباس میں بیان کی گئی ہے۔ ان کی بات سے ہم متفق بھی ہیں۔ راقم الحروف کو حال ہی میں کلیم اختر کے شعری مجموعے ''تشکیلات'' پر تبصرہ کرنے کا موقع ملا۔ کلیم اختر کے شعری مجموعے کو پڑھ کر انسان ایک نئے تجربے سے آشنا ہوتا ہے۔ لفظیات، ترکیبات، تشبیہات و استعارات، تلمیحات اور علامتوں وغیرہ کی آمیزش و آویزش سے انھوں نے ''تشکیلات'' میں جس نئی دنیا کی تشکیل کی ہے وہ واقعی میں لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ معنی و مفاہیم کی سطح پر بھی اس میں نئی دنیا آباد ہوئی ہے۔ یہاں پر اس کا ذکر پیش کرنے کی نوبت اس لیے آئی کہ رفیق راز بھی اسی طرح کے تجربوں میں یقین رکھتے ہیں جس کو وہ برسوں سے برتتے آئے ہیں۔ ہر شاعر کی اپنی ایک امتیازی حیثیت ہوتی

ہے۔اس میں موضوع کے تنوع کی اہمیت اور انفرادیت اپنی جگہ ہے اور اسلوب و بیان کی تہہ داری اپنی جگہ۔ ہر شاعر اپنا ایک آہنگ رکھتا ہے، یہاں تک کہ الہام کے سوتے تک ہر شاعر میں الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ رفیق راز کے یہاں یہی معاملہ ہے۔ علامتوں، ترکیبوں اور استعاروں کے استعمال میں رفیق راز کو خوب مہارت حاصل ہے۔ جن کے استعمال سے وہ اپنے مفہوم کی قاری تک ترسیل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ رفیق راز خوبصورت ردیفوں اور قافیوں کو اپنی تخلیقی بیانیہ کا حصہ بناتے ہیں اور اظہار کے نئے نئے ذریعے تلاش کرتے ہیں۔ اگر رفیق راز کو خیالات و محسوسات کا شاعر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کا تخلیقی سفر جاری ہے اور اس طرح اس میں نئے نئے نگینے جڑنے کے امکانات نظر آتے ہیں۔

جموں و کشمیر میں معاصر اور بلند پایہ غزل گو شعرا کی یہ فہرست مزید طویل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس بات کی تشنگی رہی کہ سب معتبر شاعروں کا یہاں ذکر نہیں کر پایا۔ البتہ آئندہ راقم کی یہی کوشش رہے گی کہ ان تمام اہم شعرا کا اپنے کسی مضمون میں تفصیلی ذکر کر سکوں۔ جس میں ایاز رسول نازکی، رخسانہ جبین، فرید پربتی، شفق سوپوری، نذیر آزاد، اقبال فہیم، زاہد مختار، سیدہ نسرین نقاش، بلراج بخشی، بشیر چراغ، پریمی رومانی، مشتاق مہدی، عادل اشرف، نکہت فاروق نظر، لیاقت جعفری، پرویز مانوس، فاروق احمد فاروق، سجاد پونچھی، علمدار عدم اور سلیم ساغر، عاصم اسعدی کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا جائے گا۔
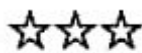
# بچوں کے چند اہم نمائندہ غزل گو شعرا

## (اکیسویں صدی میں)

بچوں کے ادب میں نظم اور کہانی دو ایسی اصناف ہیں جن پر سب سے زیادہ خامہ فرسائی کی جاتی رہی ہے۔اس کے بعد بیشتر ادیب مضمون نگاری کی جانب راغب ہوئے۔ چنانچہ جب ہم ادبِ اطفال کو اپنا موضوع بناتے ہیں تو ہماری توجہ زیادہ تر نظم اور کہانی پر مرکوز رہتی ہے۔جس کے سبب دوسری مقبولِ عام اصناف غزل، ڈرامہ، رباعی وغیرہ بے اعتنائی کا شکار ہوتی ہیں۔جب کہ ادبِ اطفال میں ان اصناف کی خدمات کم سہی لیکن حوصلہ افزا ہے۔ جس کا ثبوت اسکولی سطح کے نصاب میں کئی دہائیوں سے شامل میرؔ، غالبؔ، دردؔ، مومنؔ، ذوقؔ، سوداؔ، داغؔ، فانیؔ، شادؔ وغیرہ کی وہ لافانی عام فہم غزلیں ہیں جو بچوں کو بہ آسانی ازبر بھی ہوتی ہیں اور ان کے عقل و شعور اور تخیّل کی کارفرمائی کا باعث بھی بنتی ہیں۔اگر مذکورہ شعرا کی شاعری میں ادبِ اطفال کا عنصر نہ ہوتا تو بچوں کے ساتھ ان کا تعلق نہ جڑ جاتا۔بچوں کے میرؔ، بچوں کے غالبؔ، بچوں کے دردؔ، بچوں کے فانیؔ وغیرہ جیسی کتابیں اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔اس ضمن میں اردو کے کئی اہم ادارے متحرک ہوئے ہیں جن کے توسط سے کئی کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہیں۔حالانکہ مذکورہ شعرا کا شعری رجحان بالکل منفرد ہے اور انھوں نے بچوں کے حوالے سے شعوری یا دانستہ طور پر کوئی غزل تخلیق نہیں کی ہے۔یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ میرؔ، غالبؔ، دردؔ، ذوقؔ، مومنؔ، داغؔ، حسرتؔ وغیرہ اردو شاعری کی آبرو کہلاتے

ہیں اور وہ اردو کے ابتدائی زمانے میں شاعری کے افق پر چمکنے والے تابندہ و پائندہ ستارے کہے جاسکتے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اپنی جگہ انفرادیت کی حامل ہیں کہ ابھی تک اردو شاعری میں ان کا کوئی ثانی پیدا نہ ہو سکا۔ یہی ایک وجہ ہے کہ گذشتہ کئی دہائیوں سے اردو کے نصاب میں تبدیلی کی گنجائش پیدا نہیں ہوئی یا جس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ البتہ ماضی یا روایت کی اعلیٰ اقدار کو فراموش کیے بغیر زمانے کے عصری تقاضوں کے مطابق چلنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ ہر زمانے میں حالات بدلتے رہتے ہیں، قدریں بدلتی رہتی ہیں، رجحانات بدلتے ہیں، تہذیب و ثقافت اثر انداز ہوتی ہے، رسوم و رواج بدلتے ہیں، انسان کا مزاج اور سوچ بدل جاتی ہے، یہاں تک کہ زبانیں بھی زمانے کا اثر قبول کرتی ہیں۔ ان سب چیزوں کا بدلنا ادب کی ناگزیر تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب شاعری کی ایک اہم صنف غزل میں عشق و عاشقی کے موضوع کو اکثر و بیشتر شعرا نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔ حالانکہ وہ شاعری کا ابتدائی دور تصور کیا جاتا ہے اور جب کہ غزل کے لغوی معنی بھی ''عورتوں سے باتیں کرنا'' کے ہیں۔ چنانچہ اسی حوالے سے شاعری بھی ہو رہی تھی اور پسند بھی کی جا رہی تھی۔ اس طرح اس موضوع کے حصار سے نکلنے میں اردو شعرا کو اچھا خاصا وقت لگ گیا۔ رفتہ رفتہ غزل میں اصلاحی، سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، معاشی موضوعات کو بھی برتا گیا۔ جس سے غزل کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو گیا اور آج اس کے ذریعے سے متنوع قسم کے مضامین و مسائل اجاگر کیے جا رہے ہیں۔ غرض کہ غزل انسانی زندگی سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے۔ بچوں کے ادب میں جس طرح نظم اور کہانی کو اہمیت حاصل ہے، اسی طرح غزل کی معنویت اور افادیت سے انکار کی گنجائش ممکن نہیں۔ ماہرینِ ادبِ اطفال نے شاید نظم اور کہانی کو بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور اصلاحی تربیت کا موزوں و مناسب اور موثر ذریعہ سمجھا۔ اس کی دوسری بڑی وجہ نظم میں ان کے تقلیدی رجحان کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک سبب ہو سکتا ہے کہ غزل کے ایک مصرعے میں ایک موضوع کو باندھنے میں بعض شعرا دِقت محسوس کرتے ہوں جب کہ برعکس اس کے وہ اسی موضوع کو نظم میں برت کر پوری نظم کہہ دیتے ہیں۔ اس میں شعرا ایک ہی موضوع کو بہت

مفصل انداز میں سمجھانے کی سعی بھی کرتے ہیں، جسے وہ اپنے اور بچوں کے لیے بہت سودمند تصور کرتے ہیں جو کسی حد تک درست بھی ہے۔ تاہم وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ غزل ہی وہ صنف ہے جو تمام اصناف سے زیادہ رواج پا چکی ہے۔ نظم کے برعکس غزل کے اشعار بچوں کو ذہن نشین کرانا بہت آسان ہے۔ یہ شاعر پر انحصار کرتا ہے کہ وہ غزل کس قدر سلیس، شستہ اور دلچسپ کہتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا موضوع بچوں کی نفسیات سے کس قدر مناسبت رکھتا ہے۔ بچوں کے ادب میں کہانی اور نظم کے اس رجحان نے یقیناً صنف غزل پر نقصان دہ اثرات مرتب کیے ہیں۔ ادیبوں کا بچوں کے لیے غزلیں تخلیق نہ کرنا انھیں اردو کی ایک اہم اور باوقار صنف سے محروم رکھتی ہے۔ اگر آج اسکولی سطح کے نصاب کی نظر ثانی کی جائے یا اس کی تبدیلی کے بارے میں سوچا جائے تو اس میں ادبِ اطفال کے عصری غزل گو شعرا کی شمولیت پر بہت غور وفکر کی ضرورت محسوس ہوگی۔ جس کی وجہ بچوں کے لیے غزلیہ تخلیقات کا سرمایہ بہت کم اور نایاب ہونا ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ انسانی ذہن ارتقا پذیر ہے، اس میں عمر کی کوئی قید نہیں۔ بدلتے وقت کے ساتھ بچے کا شعور، اس کا ذہن، اس کی سوچ اور اس کے کردار وافعال پر بھی اثر پڑتا ہے۔ آج کے بچوں کی ذہنی نشو ونما اور شعوری بیداری کے لیے ہم دوسو سال پہلے دہرائی ہوئی چیزیں پیش کر کے ان کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ شعرا و ادبا کو عصری ماحول، حالات اور مسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ضروریاتی چیزیں بھی بچوں کو پیش کرنی چاہیے۔

عہد حاضر کے بچوں میں پروازِ تخیل کے لیے غزلیہ تخلیقات بھی اتنی ہی اہم ہیں جتنی کی نظمیہ شاعری اور کہانیاں۔ موجودہ دور کے بچوں کی ذہنی انفرادیت، فکری شعور اور قوتِ ادراکیہ میں حیران کن تجربے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی فکری وسعت اور ذہنی پختگی کو زیر غور رکھتے ہوئے غزل کے ساتھ ان کے رشتے کو استوار کرنا بھی دلچسپ ثابت ہوسکتا ہے۔ جب ہم اکیسویں صدی میں بچوں کے غزل گو شعرا کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ہمارے ہاتھ صرف مایوسی آتی ہے۔ اردو کے بہت سے شعرا حضرات نے بچوں کے لیے غزلیں کہی ہیں مگر اس صنف میں وہ بچوں کا زیادہ مضبوط اور دور تک ساتھ دیتے نظر نہیں

آتے بلکہ کچھ غزلوں پر ہی اکتفا کر کے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ بعض شعرا تو ایسے ہیں جنھیں اپنی شائع شدہ غزلوں پر ہی اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے انھوں اپنی غزلوں کو شائع نہیں کرتے۔ البتہ عصر حاضر میں بچوں کے چند شاعر ایسے ہیں، جنھوں نے بچوں کے لیے غزلیں لکھ کر اس صنف کی نہ صرف ساکھ رکھی بلکہ ان کے تئیں فرض شناسی بھی ادا کی۔ یہ غزل گو حضرات بچوں کے لیے غزل لکھنے کی روایت کو آگے بڑھانے میں مفید و معاون رول ادا کر رہے ہیں۔ ادب اطفال کے ان غزل گو شعرا میں امجد حسین حافظ کرناٹکی، مظفر حنفی، نذیر فتح پوری، ابو الفیض عزم سہریاوی، ظفر کمالی، فروغ روہوی، قیصر صدیقی، آصف ثاقب، شمسی قریشی، ظفر گورکھپوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

امجد حسین حافظ کرناٹکی کو اکیسویں صدی میں ادب اطفال کا امام کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جنھوں نے بچوں کے لیے کم و بیش ستر کے قریب کتابیں لکھی ہیں جن میں مختلف موضوعات مثلاً غزل، نظم، کہانی، رباعی، قطعے، دوہے، گیت، نعت و منقبت اور مضامین وغیرہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ حافظ کرناٹکی نے بچوں کے لیے وافر تعداد میں غزلیں کہی ہیں۔ بچوں پر ان کی غزلیہ کتابوں میں ''معصوم غزلیں''، ''بچوں کی غزلیں'' اور ''ننھی منی غزلیں'' خاص طور پر شامل ہیں۔ یہ تینوں کتابیں اکیسویں صدی میں ہی شائع ہوئی ہیں۔ حافظ کرناٹکی سے پہلے اردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا ہے جس نے بچوں کے لیے غزلوں کا کوئی مجموعہ یادگار چھوڑا ہو۔ اس میدان میں حافظ صاحب پہلے شاعر واقع ہوئے ہیں جنھوں نے تجربہ کیا تو کامیاب بھی ہوئے۔ موصوف شاعر نے نہ محض لکھنے کا تجربہ کیا بلکہ ایک نیا فارمولہ اپناتے ہوئے بچوں سے اپنی غزلوں کی قرأت کروائی اور اس کے ساتھ ساتھ ترنم سے پڑھوائی بھی۔ جب انھیں اپنی غزلیں بچوں کے لیے مانوس لگنے لگیں تو انھوں نے مزید تجربہ کرتے ہوئے دو اور مجموعے شائع کروائے۔ اس طرح ان کی غزلیں بچوں کو راس آگئیں۔ اس کے علاوہ اساتذۂ سخن اور دیگر شعرائے کرام نے بھی ان کی غزلوں کو بے حد پسند کیا ہے۔ حافظ کرناٹکی اپنی غزل گوئی کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''میں جانتا ہوں کہ میری تمام غزلیں غزلیہ شاعری کی رعنائی اور شعریت کی

حائل نہیں ہیں۔ ایسا ممکن بھی نہیں تھا کہ اس طرف توجہ کرنے سے غزل غزل تو بن جاتی مگر وہ بچوں کی غزل نہیں رہ پاتی۔"

امجد حسین حافظ کرناٹکی ادبِ اطفال کے معمار تصور کیے جاتے ہیں۔ بچوں کے ادب میں ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ اسی اختصاص نے انھیں ادب میں ایک اہم مقام عطا کیا ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حافظ صاحب بچوں کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے اردو غزلوں کا جو گرانقدر سرمایہ تحریر کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ ان کی غزلیں جہاں بچوں کی ذہنی بیداری کرتی ہیں، وہیں بالغ ذہنوں کی بھی افزائش و بالیدگی کا عنصر پیدا کرتی ہیں۔ اس جدید سائنس و ٹکنالوجی کے ترقی یافتہ دور میں بھی بعض شعرا غزل کے معنی "عورتوں سے باتیں کرنا" ہی مراد لیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب غزل کے لغوی معنی "عورتوں سے باتیں کرنا" کے ہیں تو شاعر بچوں سے کیسے باتیں کر سکتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہماری شاعری کس موڑ پر کھڑی ہے۔ ایسے شعرا کے لیے حافظ کرناٹکی کا غزلیہ کلام زندۂ جاوید مثال ہے۔ بچے تو بچے یہاں تک کہ بڑے بھی ان کے غزلیہ کلام سے حظ اٹھاتے ہیں۔ ان کے کلام میں وہ ہر چیز ہے جس سے بچوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ حافظ کرناٹکی نے عام فہم زبان میں نہایت سادہ، سلیس، شستہ، رواں اور پہلودار غزلیں کہی ہیں۔ جو چاشنی اور لطافت و فطانت سے بھرپور ہیں، فصیح و بلیغ ہیں اور جو فن کی کسوٹی پر پوری طرح کھری بھی اترتی ہیں۔ حافظ کرناٹکی کی کتاب "بچوں کی غزلیں" سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

یہ عہدِ نو کے شریر بچے
ہیں آپ اپنی نظیر بچے

دور جن سے کتاب ہوتی ہے
ان کی قسمت خراب ہوتی ہے

ایک چھوٹی سی لغزش بھی
عمر بھر کا عذاب ہوتی ہے

بنائی ہے عورت نے قدرت کی خاطر
حیا کی حویلی، حجابوں کی دنیا

موجوں کی طرح مل کر جھرنوں کی طرح رہئے
اک پیڑ کی شاخوں پہ پھول کی طرح رہئے

ہر اک سائے سے افضل
ماں اور باپ کا سایہ ہے

حافظ کرناٹکی نے بچوں کی نفسیات اور فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے متنوع اور بوقلمونی انداز کی سینکڑوں غزلیں کہی ہیں۔ یہ سب غزلیں چاشنی، روانی اور متانت جیسی ہر خوبی سے مملو ہیں۔ ان کی چھوٹی بحر اور بالکل آسان لفظوں میں پیش کی گئی غزلوں بے شمار موضوعات پنہاں ہوئے ہیں اور غزل میں اسی عنصر کو بنیادی خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ غزل میں عموماً اشاروں کنایوں میں بات ہوتی ہے۔ جس کے لیے علامتوں، استعاروں، ترکیبوں اور تشبیہوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جس کی اہل علم حضرات اپنے اپنے طور پر تشریح و تفہیم کرتے ہیں۔ غالب اور اقبال کے کلام کی شرحوں سے بھی میری اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن جب شاعر بچوں کے لیے غزل تخلیق کر رہا ہو تب اس کو ان کی ذہنی سطح پر آنا ہوتا ہے۔ بچوں کا ذہن اور دل جن چیزوں کی طرف مانوس ہوتا ہے غزل میں ان چیز کو پیش کرنا بہت لازمی ہے۔ اتنا ہی نہیں بچوں کے شعور کو کیسے بالیدہ کیا جائے، ان کی ذہنی اپج کو کیسے ابھارا جائے، اچھائی اور برائی میں کیسے تمیز کی جائے، صحیح اور غلط کی نشاندہی کیسے کی جائے، دنیاوی حقیقت سے کیسے روشناس کیا جائے، رشتوں کا احساس کیسے کرایا جائے، بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کا درس کیسے دیا جائے، دین و مذہب کی حقیقت سے کیسے آگاہ کیا جائے، انسان کی اصلی دولت کیا ہے،

علم وعمل اوراچھے اخلاق وعادات کے کیا فائدے ہیں، سچائی کی علم کیسے بلند کی جاسکتی ہے، انسانیت کی حفاظت اوراس کی بقا کیسے ممکن ہے، بلند عزائم کے کیا فوائد ہیں، حوصلوں کو پروان کیسے چڑھایا جائے، مشکل حالات کا سامنا کیسے کریں، محبت واخوت اور بھائی چارگی کی روشنی کیسے پھیلائیں، زندگی کے حوادثات کا سامنا کیسے کریں، اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کیسے کی جائے، قوم کی ترقی اور وطن کی بھلائی کے لیے کون ساراستہ اختیار کیا جائے،، حقوق کے گماں کو کیسے برقرار رکھا جائے، دوستی کیسے نبھائی جائے، جھوٹے دوستوں کی پہچان کیا ہے، بڑوں کی قدر اوران کی خدمت کس قدر ضروری ہے، روایتی اقدار سے فراموشی کس قدر نقصان دہ ہے، نظم وضبط کیسے پیدا کیا جائے، نفرت، دشمنی اور پیار، محبت وشفقت میں فرق کیسے کیا جائے، نئی نئی ایجادات کی معلومات بہم پہنچانا وغیرہ کو ابھی تک شعرا جس طرح صنف نظم میں پیش کرتے آرہے ہیں اسی طرح حافظ کرناٹکی نے بھی ان موضوعات کو بڑی شگفتگی کے ساتھ پیش کر کے غزل کی انفرادیت واہمیت واضح کردی ہے جس سے ان کی تخلیقی صلاحیت کا اندازہ بھی بخوبی ہوجاتا ہے۔ جس طرح نظم نگار شعرا نے بچوں کے لیے اپنی تخلیق کردہ نظموں میں میلوں، ٹھیلوں، تہواروں، پھلوں، پھولوں، چرند وپرند، جانوروں، سمندروں، ندی ونالوں، قومی دنوں، عظیم سیاسی رہنماؤں، تاریخی عمارتوں، عالموں، دانشوروں، مفکروں، دلچسپ تاریخی واقعات کے علاوہ تعلیمی، ادبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی، اصلاحی اور زندگی کے مختلف النوع امور کو موضوع بحث بنایا ہے اسی طرح حافظ کرناٹکی کی غزلیں بھی ان میں بیشتر پہلوؤں کی خوبصورت تصویر کشی کرتی نظر آتی ہیں۔

حافظ کرناٹکی کا پہلا مجموعہ کلام ''معصوم غزلیں'' باون غزلوں، دوسرا مجموعہ ''بچوں کی غزلیں'' ایک سو چھیالیس غزلوں، اور تیسرا مجموعہ ''ننھی منھی غزلیں'' اڑتالیس غزلوں پر مشتمل ہے۔ حافظ کرناٹکی کی باقی ماندہ مجموعوں کی غزلیں بھی بڑی دلنشین ہیں جن میں بچوں کی ذہنی، اخلاقی، اصلاحی اور سماجی نشوونما کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ان کے ہر شعر میں فکر انگیز معنی پوشیدہ ہے۔ ان کی غزلیں الجھاتی نہیں بلکہ وہ براہ راست بچوں کے فہم ودسترس میں ہیں۔ ان میں کچھ غزلیں سبق آموز ہیں اور کچھ فکر وشعور کی آگہی سے پُر۔ حافظ کرناٹکی کی ان

غزلوں میں بچوں کے معصوم جذبوں اور امنگوں کی فضا سموئی ہوئی ہے نیز اس میں بچوں کے لطیف جذبات، احساسات وخیالات اور نازک خواہشات کی قدر پائی جاتی ہے۔ ''بچوں کی غزلیں'' اور ''ننھی منی غزلیں'' سے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

پھول کھلے انگاروں میں
آگ لگی گلزاروں میں

محنت یا مزدوری کر
ظاہر مت مجبوری کر

بھول نہ اپنے بچپن کو
بچوں کی ضد پوری کر

کانٹے نکھرے سوکھے پھول
اب کے کھلے ہیں کیسے پھول

اُس کی آمد سے روشن
گھر کا کونا کونا ہے

پیڑ لگایا کرتا ہوں
سر پہ سایہ کرتا ہوں

بھر بھر کے بھی خالی ہوں
میں اک ٹوٹی پیالی ہوں

حافظ کرناٹکی کی ہی شعری سعادت مندی دیکھئے کہ انھوں نے کس طرح پھولوں سے طرح طرح کے معنی ومفاہیم پیدا کیے ہیں، کس کس نوعیت کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔

جس میں ایک تو بچوں کی شگفتہ مزاجی ہے تو وہیں دوسری جانب اس کے در پردہ فکرمندی اور تجسس آمیز کیفیت کی سرشاری بھی موجود ہے۔ان کی غزلوں میں اخلاقیات کا درس ہے اور نصیحت و سبق آموز باتیں بھی۔انھوں نے اپنی غزلوں میں دوستی، دشمنی، حق، باطل، سچائی، نفرت، عداوت، بغاوت، جرأت، انسان کی عظمت، والدین کی بچوں کے تئیں قربانی، دین کی آگہی، دن اور رات کی حقیقت، سورج اور چاند کی جاذبیت، محنت و مزدوری کی اجرت، فرقہ وتعصب پرستی کی نشانیاں، برائیوں سے بچنے کی تدبیریں، امن واماں کی مثالیں، پیڑوں کی اہمیت، عورتوں کی بے پردگی، دھوپ چھاؤں کا احساس، نیکیوں کا صلہ، اپنوں کی بیگانگی اور دوستوں کی فرقت، ظالموں اور جابر انسانوں کی تصویریں دکھائی ہیں اور ان سب کا بہت خوبصورت احساس کرایا ہے۔اگر تکنیکی اعتبار سے دیکھیں تو حافظ کرناٹکی کی غزلیں مطلع و مقطع سے زیب تن ہیں جن میں ردیف وقوافی کے التزام کو برتا گیا ہے۔اس کے علاوہ دو مصروں میں بات مکمل کرنے کا اختصاص بھی موجود ہے۔بہت سے شعر رمزوایمائیت کے ہنر سے پُر ہیں لیکن وہ بچوں پر بار نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ان میں سیدھے سادے انداز میں مفہوم جھلکتا ہے۔یہ غزلیں سہلِ ممتنع کی بہترین مثال ہیں۔حافظ کرناٹکی بچوں کے لیے تن اور من سے لکھ رہے ہیں انھوں نے اردو کی بیشتر اصناف میں لکھ کر بچوں کے ادب میں اپنی انفرادیت قائم کر کے ایک خاص شناخت بنائی ہے۔موصوف بچوں کے ادب میں پہلے غزل گو شاعر ہیں جنھوں نے باضابطہ طور پر اس صنف کے شعری مجموعوں کی بنیاد ڈالی ہے۔المختصر حافظ کرناٹکی کی غزلیہ شاعری ادبِ اطفال کے سرمایے میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔

پروفیسر مظفر حنفی اردو ادب میں ادب اطفال کا ایک معتبر نام ہے۔جنھوں نے بچوں کے لیے چھے سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ان کے لکھنے کا سلسلہ اکیسویں صدی میں بھی جاری و ساری ہے۔بچوں کے ادب میں ان کا رجحان زیادہ تر نظم نگاری کی طرف رہا ہے۔تاہم ان کی تخلیقات میں کچھ غزلیں بھی شامل ہیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ان غزلوں کو پڑھ کر ایک قاری کو محسوس ہی نہیں ہو کر سکتا کہ ان کی نظمیں معنی و مفاہیم، بچوں کی ذہنی ساخت اور تربیت و کردار سازی میں برتر ہیں یا ان کی غزلیں۔

چونکہ بچوں پر لکھتے وقت مصنف کے پسِ پشت محض ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے ان کی اخلاق و کردار سازی، چاہے وہ صنف نظم ہو یا صنف غزل وغیرہ۔ مظفر حنفی بھی بچوں پر لکھتے وقت اس پہلو کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے نظمیں بھی وقیع لکھی ہیں اور غزلیں بھی شستہ ورواں و فہم۔ کچھ شعر آپ حضرات کی ذوقِ نذر کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

بچّے لائے انوکھی تتلی اور نرالے پھول
خوشبو دینے والی تتلی اور نرالے پھول

جس دن گلشن میں نفرت کی آندھی چلتی ہے
شاخوں پر اُگنے لگتے ہیں کالے کالے پھول

میری گود میں پوتی ہے تو پوتا کندھے پر
جیسے جھِلمل جھِلمل جگنو بھولے بھالے پھول

میاں کی جیب میں کل تو بھرے ہوئے تھے چنے
اب ان کی جیب سے نکلے مٹر تو کیا ہوگا

ساری جھیلیں سرینگر کی باغ بغیچے دلّی کے
بابا میرے گاؤں میں کیوں ہے اتنا کیچڑ اتنی دھول

جو ہم کو اخروٹ نہ دیں گے
ہم ان کو ووٹ نہ دیں گے

بچّے نے سکہ ایسی ادا سے بڑھایا ہے
جیسے وہ خرید رہا ہو دکان تمام

مظفر حنفی نے جہاں اپنی غزلوں سے بچوں کے دلوں کو لبھانے کا کام کیا ہے، وہیں

ان کے لیے ایک دلچسپ سبق بھی چھوڑ گئے ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار سے اس کا اندازہ لگانا قطعی مشکل نہ ہوگا کہ کس طرح انھوں نے پھول کو موضوع بنا کر پیار و محبت کا گلشن آباد کیا ہے۔ مظفر حنفی نے اپنی غزلیہ شاعری میں بچوں کے معصوم جذبات اور لطیف احساسات کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے بچوں کی پسندیدگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تتلیوں، پھولوں، بغیچوں، جھیلوں، جگنوؤں، ہِسکوں، بڑوں کی بچوں سے قربت اور ماحول وغیرہ کی خوبصورت عکاسی کی ہے جس سے وہ ایک تو بچے کا دل بھی بہلا رہے ہیں اور دوسری طرف اس میں شعوری بیداری کا وسیلہ بھی پیدا کر رہے ہیں۔ موصوف شاعر رمز و ایما کو بھی بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور اس طرح برتتے ہیں کہ بچہ بھی بھار محسوس نہیں کر سکتا۔ اس طرح شاعر علامتی رنگ میں بچوں کو نقصان دہ عناصر سے آگاہ بھی کرتا ہے۔ مظفر حنفی بچوں کے افعال و حرکات کو بھی شاعری کا موضوع بناتے ہیں کیونکہ ہر انسان کی زندگی میں بچپن کا مرحلہ آتا ہے۔ اس لیے شاعر کو بچپن کے تجربے سے آگہی ہوتی ہے۔ مظفر حنفی کی غزلیں بچوں کو حظ پہنچانے کے ساتھ ساتھ اخلاقی درس بھی دیتی ہیں۔ ان کی غزلیں بچوں کو تفریح طبع کا بھر پور سامان فراہم کرتی ہیں۔

ساحل مرتضٰی تسلیمی ادب اطفال کے معماروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے بچوں کے لیے پینتالیس کتابوں کا ایک بیش قیمت سرمایہ تخلیق کیا ہے۔ جس میں چالیس کتابیں شاعری اور چار کتابیں کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ ساحل مرتضٰی بچوں کے لیے غزلیں بھی تخلیق کرتے رہے ہیں۔ اگر چہ ان کی نظمیہ شاعری غزلوں پر بھاری محسوس ہوتی ہے تاہم غزل گوئی میں ان کو خصوصی اختصاص حاصل ہے جن کو وہ شائع بھی کراتے ہیں اور اپنی کتابوں میں نظموں کے ہم پہلو فخر کے ساتھ جگہ بھی دیتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں بچوں کے لیے اخلاقی، دینی و مذہبی، ذہنی و جسمانی اور روحانی تعلیم نظم کرتے ہیں۔ ان کی شگفتہ بیانی اور مسحور کن تخلیقی انداز بچوں کو متاثر کرنے کی بھر پور صلاحیت رکھتا ہے۔ آسان الفاظ، چھوٹی بحر، سیدھی سادی تحریر اور دلچسپ موضوعات ان کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ ساحلؔ کی غزلوں کی قرأت کرتے کرتے بچّے دین و دنیا کی بے شمار حقیقتوں سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ ان کی

نظموں کی طرح بچوں کے لیے کہی گئی غزلوں میں بھی وہ چاشنی اور دل آویزی موجود ہے جو بچے کی فکری نشو ونما اور افزائش کا مکمل ضامن بن سکتی ہیں۔ مندرجہ ذیل میں ساحل مرتضی کے کچھ غزلیہ اشعار کی قرأت کریں تو اندزہ ہو جاتا ہے:

خدمتِ خلق، خدمت اسلام
ہو یہی کام روز و شب میرا

میرے کردار کو سراہیں لوگ
ذکر محفل میں آئے جب میرا

تکبر نہ کر، ظلم کرنے سے بچ
خدا کی زمین پر خدائی نہ کر

جس کو چھوٹوں سے پیار ہوتا ہے
وہ بڑا باوقار ہوتا ہے

بے ادب ہر جگہ ہے بے عزت
با ادب باوقار ہوتا ہے

اُس کو اچھا کوئی نہیں کہتا
جو بار بار فیل ہوتا ہے

ہر کام محنت سے کریں، کاہل نہ ہوں کاہل نہ ہوں
ہم دوستی اُن سے کریں پڑھنے کے جو شوقین ہوں

قبل اس کے، کوئی حساب کرے
آدمی خود ہی احتساب کرے

ساحل مرتضیٰ تسلیمی کی غزلوں میں رنگارنگی سموئی ہوئی ہے۔ان غزلوں سے جہاں بچوں کی ذہنی آبیاری ہوتی ہے وہیں ان میں سچائی، ایمانداری، مخلصی، اچھائیوں کی نشاندہی، خدا کی خداوندی، عزم واستقلالی، وفاشعاری، دین کی عظمت، کام اور محنت کی افادیت، کاہلی اور بے ادب لوگوں سے بچنے کی تلقین، ظالموں سے نجات، رکبر سے پناہ، برائیوں کا پچھتاوا اور غلطیوں کے اعتراف کا حوصلہ، حقوقِ انسانی کی پاسداری، راہِ راست پر چلنے کی التجا، علم حاصل کرنے اور اس کی شمع جلانے کا عزم، اعتبار واعتماد رکھنے، اپنے اندر جذبۂ ایمان کی حرارت پیدا کرنے وغیرہ سے متعلق بہت ہی مفید مطلب باتیں ہوئی ہیں۔جو نصیحت آموز ہیں اور حقیقت پر مبنی بھی۔ان غزلوں سے مصنف کی روشن خیالی اجاگر ہوتی ہے اور اسی روشن خیالی کا درس انھوں نے بچوں کو بھی دینے کی ایک جاندار سعی کی ہے۔ان کی غزلیہ شاعری نہ محض بچوں بلکہ بڑوں کے لیے باعث تقلید ہیں۔باتیں وہی ہیں جو چھوٹے بڑے ہر عمر کے انسان پر صادق آتی ہیں۔ساحل کی غزلوں میں بچوں کی رہنمائی اور درس وعبرت کے بیکراں معنی پنہاں ہیں۔

ادب اطفال کے موضوع پر لکھنے والوں میں نذیر فتح پوری کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔جنھوں نے بچوں کے لیے اردو کی بہت ساری اصناف میں لکھا ہے جس میں شاعری بھی شامل ہیں۔انھوں نے شاعری میں غزل کی طرف بھی خصوصی توجہ کی ہے۔پندرہ سال قبل ساہتیہ اکادمی سے مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ کتاب ''اردو میں بچوں کے ادب کی اینتھولوجی'' شائع ہوئی۔جس میں اردو میں بچوں کے تعلق سے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والوں کی تخلیقات پیش کی گئیں۔اس کتاب میں بچوں کے لیے غزل لکھنے والوں میں خواجہ میر درد، میر تقی میر، مومن خاں مومن، شاد عظیم آبادی اور فانی کے ساتھ نذیر فتح پوری کا نام بھی باقاعدہ طور پر شامل کیا گیا ہے اور نمونے کے طور پر ان کی غزل بھی شامل کی گئی ہے جو کسی سند سے کم نہیں۔اس غزل کے تین شعر ملاحظہ ہو:

محنت کو جہاں میں کبھی رسوا نہیں کرنا
ہاتھوں کی لکیروں پہ بھروسہ نہیں کرنا

مالک کے بنائے ہوئے انسان ہیں سارے
نفرت سے کسی کو کبھی دیکھا نہیں کرنا

ہر شعر میں اخلاص و مروّت کا سبق ہے
پڑھ کر جسے بچو! کبھی بھولا نہیں کرنا

نذیر فتح پوری کی اس غزل کے تمام شعر واضح ہیں اور ہر شعر بچوں کی صحیح و معاون رہنمائی کرتا نظر آتا ہے۔اس غزل کے تمام شعر شاعر نے بے ساختگی کے ساتھ کہے ہیں یہی وجہ کہ ان میں روانی اور فطری حسن نمایاں ہوا ہے۔نذیر فتح پوری اس غزل میں بچوں کو محنت کی اہمیت سے روشناس کراتے ہیں، خوداعتمادی کا جوش پیدا کرتے ہیں، عالموں کی قدر و منزلت کو کہتے ہیں اور ظالموں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا ولولہ پیدا کرتے ہیں، انسانیت کی عظمت بتاتے ہیں اور اس کا پرچم بلند کرنے کو کہتے ہیں، بھائی چارگی اور انسان دوستی کا پیغام دیتے ہیں، جاہ وحشمت کی رسوائی سے گریز کا پیغام دیتے ہیں اور ایماں وایقاں کا راستہ اپنانے کو کہتے ہیں، اخلاص و مروّت کا سبق پڑھاتے ہیں اور تا حیات اسی سبق پر پابند رہنے کو کہتے ہیں۔یہ پوری غزل بچوں کے لیے کس قدر موثر ثابت ہوسکتی ہے، مجھے نہیں لگتا اس کی مزید وضاحت ضروری ہے۔نذیر فتح پوری کی غزلوں سے نمونے کے طور پر کچھ اور شعر ملاحظہ فرمایئے:

یہ جو سر پر بادل ہے
جیسے ماں کا آنچل ہے

بھائی چارے کی بات جب ہوگی
آپ کو بھائی جان لکھوں گا

جب وہ پوچھیں گے پیار کی بولی
تب میں اردو زبان لکھوں گا

ماں کے قدموں، میں جنت ہے
باپ اسی جنت، کا ہے در

نذیر فتح پوری کی یہ غزلیں ادب اطفال میں ایک اہم اضافہ ہے۔ان غزلوں میں نذیر فتح پوری آسان زبان، آسان الفاظ اور موزوں بحر کا استعمال کر کے بچوں کو فائدہ بخش موضوعات، فرحت بخش معلومات اور لطف و انبساط کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ یہ غزلیں بچوں کے لیے بہت کارگر ثابت ہوسکتی ہیں۔

ابوالفیض عزم سہریاوی میدانِ ادبِ اطفال کے ایک باکمال شاعر ہیں۔جن کے ابھی تک چار سے زائد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔اس سے پہلے ان کی کئی نظمیں اور غزلیں مختلف رسائل و جرائد میں چھپ چکی ہیں۔ان کی غزلیں بڑی دلفریب ہیں اور معنی آفرین بھی۔عزم سہریاوی کو بچوں کا چہرہ پڑھنا اچھی طرح آتا ہے، بچے کیا محسوس کرتے ہیں، ان کی خواہشیں کیا ہیں، وہ اس کا بخوبی علم رکھتے ہیں۔بلکہ ایک غزل میں تو اس کا رنگ پوری طرح نکھر کر آ گیا ہے۔جس گھر میں چھوٹے چھوٹے بچّے ہوں اور حسنِ اتفاق سے وہ گھر شاعر کا ہو تو بھلا وہ شاعر کب تک اپنے آپ کو بچوں پر قلم اٹھانے سے روک سکتا ہے۔اتنا ہی نہیں انسان زندگی کے ہر پڑاؤ پر اپنے بچپن کے سہانے دنوں کو یاد کرتا رہتا ہے۔اس لیے کل کا بچپن اور آج کا بچپن دونوں کی تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرتی رہتی ہیں۔ جس سے قلم میں زورِ قوت پیدا ہونے کے بہت زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔یہی زورِ قوت عزم سہر ویاوی کی درج ذیل غزلیہ اشعار میں نظر آتا ہے۔آیئے کچھ اشعار سے لطف اٹھایئے:

سویرے کا موسم ہے کتنا سہانا
سویرے ہی اُٹھ کر ہے اسکول جانا

بڑوں سے یہ کرتے ہیں بے حد محبت
بڑوں سے ہے اُلفت اِنہیں والہانہ

کبھی جو اداسی ہو چہرے پہ ان کے
نہ اسکول جانے کا ہے یہ بہانا

اگر نرم خو نرم گفتار ہوگی
یہی ہاتھ میں تیرے تلوار ہوگی

تجھے امن کرنا ہے قائم جہاں میں
وگرنہ ڈگر تیری دشوار ہوگی

یقین ہے تو منزل پہ پہنچے گا آخر
اگر تیز تیری رفتار ہوگی

عزم سہریاوی نے اپنی غزلیہ شاعری میں بچوں کے جذبات واحساسات کو بے حد خوبی سے نظم کیا ہے۔ یہ بچّے کی فطرت میں ہے کہ بچپن میں اس کو جس سے سب سے زیادہ پیار اور شفقت ملتی ہے۔ وہ اسی کے سب سے زیادہ قریب جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ قربت پائیدار و مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ عزم سہریاوی نے جہاں بچوں میں ایسی قربت دیکھی ہے، وہیں ان میں فکر مندی بھی پائی ہے مثلاً صبح سویرے اسکول جانے کی فکر کرنا وغیرہ۔ بچّے دل کے سچے ہوتے ہیں۔ دنیا کے مسائل و مصائب سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ دل کی پاکی اور دنیا سے بے فکری انھیں ہمیشہ خوش رکھتی ہے کیونکہ ان کے دل میں کوئی میل نہیں ہوتا اور دنیا سے بے پروا ہو کر وہ ہنسنے ہنسانے میں لگے رہتے ہیں اور ان کا ہنستا کھِلتا چہرہ دیکھ کر دوسرا بھی (اگر کوئی غمزدہ بھی ہو) مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عزم سہریاوی ان سب چیزوں کے علاوہ بچوں کو امن آشتی کا پیمبر بننے، زندگی کے گام پر پھرتیلا پن پیدا کرنے، بڑوں سے کچھ حاصل کرنے اور یقین و اعتماد کی بحالی کا سبق دیتے ہیں۔

ظفر کمالی اس صدی میں بچوں کے ایک جانے مانے ادیب ہیں۔ انھوں نے بھی بچوں کے لیے نظموں اور غزلوں کا اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے جس میں وہ آج بھی مسلسل

اضافہ کر رہے ہیں۔ بچوں کے ادب پر انھیں بھرپور عبور حاصل ہے۔ نظموں کو اہمیت دیتے ہوئے انھوں نے غزلوں کی طرف بھی توجہ دی ہے اور خاصی تعداد میں بچوں کے لیے غزلیں تخلیق کی ہیں۔ بچوں پر ان کی کتاب ''بچوں کا باغ'' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہوئی ہے۔ ان کی غزلیں فطانت و متانت اور معنی آفرینی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ جو لطف اندوزی سے لبالب ہیں اور فنی و فطری نزاکت سے شرابور بھی۔ ظفر کمالی اپنی غزلوں میں بچوں کی معمولی سے معمولی اور بڑی سے بڑی خواہش کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ بچوں کے معمول کی زندگی سے جڑی چیزوں کو غزلوں میں نہایت سادگی کے ساتھ پیش کر کے ان کا دل جیتنے کی ہم ممکن کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام فنی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو بچوں کے ذوق و شوق کو ابھارتی ہیں۔ ظفر کمالی اپنی غزلوں کے ذریعے بچوں کو ہنسی مذاق کے ساتھ ساتھ اخلاقی درس بھی دیتے ہیں۔ ان کے کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے:

دعا مجھ کو دیتے ہیں چاچو میرے
تمہاری پٹائی سلامت رہے

بڑا ہو کے لکھوں گا میں بھی کتاب
قلم روشنائی سلامت رہے

پھسل کر اگر دم سے گر جائے کوئی
تو ایسے میں تالی بجانا برا ہے

نظر آئے بچھو تو فوراً ہی مارو
بہادر ہو تم تھرتھرانا برا ہے

محلّہ تمہارا ''نرالا نگر''
وہاں ہر بشر ہی نرالا رہے

پڑھنے کو جب بھی گھر پر کہتے تھے میرے بھائی
کرتا تھا دردِ سر کا اکثر ہی میں بہانا

مذکورہ بالا اشعار کے انتخاب سے ظفر کمالی کی شعری ہنر مندی کا اندازہ بہ آسانی ہو جاتا ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں بچوں کو خوبیوں سے آشنا کرایا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے طنز و مزاح بھی پیدا کیا ہے۔ مظفر حنفی کے بعض غزلیہ اشعار میں بھی یہ عنصر دیکھنے کو ملا تھا اور ظفر کے یہاں بھی اس چیز کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ وہ لوگ ناداں ہیں جو یہ کہتے بچوں کی سطح کی غزل کہہ کر غزل کا حسن زائل ہو جاتا ہے۔ جو اشعار اس پورے مضمون میں شامل کیے گئے وہ ان کے لیے زندہ مثال ہے۔

بچوں کے لیے لکھنے والوں میں ایک نام فراغ روہوی کا ہے۔ بچوں پر ان کی کتاب ''ہم بچے ہیں پڑھنے والے'' مغربی بنگال اردو اکادمی سے شائع ہوئی ہے۔ انھوں نے نظم، غزل، رباعی وغیرہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس ضمن میں ان کی کئی تصانیف بھی شائع ہو چکی ہیں۔ بچوں سے رغبت اور لگاؤ کا اندازہ ان کی تخلیقات سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ فراغ روہوی نے بچوں کے لیے غزلیں اور نظمیں دونوں تخلیق کی ہیں۔ انھوں نے مذکورہ دونوں اصناف میں بچوں کی دلچسپی اور طبیعت کو ملحوظ رکھا ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

دل کی صفائی کی ہے
اپنی بھلائی کی ہے

جب ہم نے کی شرارت
ماں نے پٹائی کی ہے

یاروں نے پیٹھ پیچھے
میری برائی کی ہے

ٹیچر نے دھوبی جیسی میری دھلائی کی ہے

حق کے لیے ہمیشہ ہم نے لڑائی کی ہے

ജ്ഞ

دیکھیے یہ غزل کتنی صفائی کے ساتھ کہی گئی ہے۔ جس کے سبھی شعر مفہوم سے پُر ہیں نیز چار چار پانچ پانچ لفظوں کو ایک موزوں بحر میں برت کر وزن کی لذت وحلاوت اور قافیہ و ردیف کی یکسانیت کے ساتھ خوبصورت ڈھنگ سے شعری جامہ پہنایا گیا ہے۔ اس غزل میں بچوں کے نٹ کھٹ پن، شوخی، شرارت، دل کی صفائی، دیانت داری، حق پرستی کے علاوہ مشقت پر زور دیا گیا ہے۔ فروغ روہوی کی غزلیں بھی باقی شاعروں کی طرح بچوں کو اچھائی اور بھلائی کی راہ پر چلنے کا عزم وحوصلہ عطا کرتی ہیں۔

ادبِ اطفال کے موضوع پر ان دنوں کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ اردو ادب کی تاریخی کتابوں میں کہیں ادبِ اطفال کا موضوع ہی نہیں ہے۔ البتہ کچھ رسائل جیسے ''امنگ''، ''بچوں کی دنیا''، ''پیام تعلیم''، ''نیا کھلونا'' وغیرہ ابھی تک اس کی ساکھ بچائے ہوئے ہیں۔ وگرنہ ناقدین کب کے اس موضوع کو فراموش کر بیٹھے ہیں یہی وجہ ہے کہ شاعر حضرات ادبِ اطفال موضوع کی طرف توجہ مبذول نہیں کرتے ہیں کیونکہ ان کی پذیرائی کے لیے کوئی سامنے نہیں آتا ہے۔ بچوں میں یوں تو نظم نگار شاعر بہت ہیں لیکن غزلیہ شاعر کی تعداد نہایت قلیل ہیں، پھر بھی بعض شعرا نے کم وبیش غزلیں تخلیق کر کے بچوں کے ادب میں صنفِ غزل کی آبرو رکھی ہے۔ جن شعرا نے اکیسویں صدی میں بچوں کے لیے غزلیں لکھی ہیں ان میں ظفر گورکھپوری، شبنم کمالی، ڈاکٹر محمد شفیق اعظمی، متین اچل پوری، عادل حیات، سالک جمیل براڈ، شمس قریشی، قیصر صدیقی، آصف ثاقب وغیرہ شامل ہیں۔ بعض لوگوں نے غیر دانستہ طور پر ایسی غزلیں لکھی ہیں جو بچوں کے ذمرے میں آتی ہیں ایسی غزلیں اگر تلاش کی جائے تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بچوں کے ادب میں صنف غزل بہت جلد رواج پا جائے گی۔

☆☆☆

# مشرقی پنجاب میں اردو نظم کا حالیہ منظرنامہ

پنجاب کی سرزمین سے اردو زبان کا بہت قدیم، گہرا اور مضبوط رشتہ رہا ہے۔ اس قدر مضبوط رشتہ کہ حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' سے اس بات کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ مقالہ اس لیے اہم تصور کیا جاتا ہے کہ اس میں حافظ شیرانی نے پنجاب میں اردو زبان کا آغاز جیسا تہلکہ انگیز نظریہ پیش کیا۔ اس کے بعد جب جب اردو زبان اور اس کے آغاز کی بحث چھیڑی گئی تب تب حافظ شیرانی کے مقالے کا حوالہ دیا گیا۔ چنانچہ یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ جب شاعری خصوصاً اردو نظم کے حوالے سے گفتگو ہوتی ہے تو اس کے پس منظر کا ذکر کرنا لازم و ملزوم ہو جاتا ہے، کیونکہ اردو میں جدید نظم گوئی کے بنیاد گزار حالیؔ قرار دیے جاتے ہیں جن کی ایماء اور کاوشوں سے ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد پڑی۔ جہاں اردو نظم کے فروغ کے سلسلے میں ''انجمن پنجاب'' کا کارنامہ ناقابل فراموش ہے، وہیں اس کی بنیاد رکھنے والے ہمہ جہت شخصیت کے مالک حالیؔ کی کاوشیں قابل صد احترام قرار دی جاسکتی ہیں۔ پنجاب میں اردو کی روایت بیان کرنے کا اصل مقصد یہی ہے کہ کسی نہ کسی سطح اور نہج پر یہاں مسلسل اردو کی آبیاری ہوتی رہی۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی پنجاب بھی تقسیم ہوا۔ تقسیم کے نتیجے میں یہاں کے ادیب و شاعر ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ مختلف شہروں میں بکھر گئے۔ جس سے اگرچہ یہاں اردو کے پالنہاروں میں کمی واقع ہوئی تاہم لدھیانہ، جالندھر، پٹیالہ بالخصوص مالیرکوٹلہ سے وقتاً فوقتاً بعض اہم ادیب، شاعر، افسانہ نگار، ناقدین اور محققین وغیرہ پیدا ہوتے رہے ہیں جو پنجاب میں اردو کی شمع جلانے اور اس کی تابندگی کے ضامن بنے ہیں یا بنے ہوئے ہیں۔

آزادی کے بعد مشرقی پنجاب سے اُبھرنے والے چند اہم شعرا میں ساحر لدھیانوی، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، میلا رام وفا، جگن ناتھ آزاد، آزاد گلاٹی، پریم وار برٹنی، راجندر ناتھ رہبر، کرشن ادیب، عرش ملسیانی، بلراج کومل، مخمور جالندھری، گوپال متل، سردار پنچھی، ذوقی لدھیانوی، معصوم انبالوی، ڈاکٹر محمد رفیع وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے بعد بھی حال تک مختلف ادوار میں شعرا حضرات کی کئی نسلیں آئیں جنھوں نے یہاں شاعری کا چراغ روشن کیا۔ مگر جب ہم مشرقی پنجاب میں اردو نظم کے حالیہ منظرنامے پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمارے ہاتھ مایوسی ہی آتی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے کہ تفریح طبع اور مشاعرے بازی کی سطح تک تو ٹھیک ہے لیکن اردو کے صحیح ذوق اور نشوونما کی سطح پر اسے انتہائی مایوس کن قرار دیا جاسکتا ہے۔ آج ہمیں مشرقی پنجاب میں چند معدودے شاعر ہی ملتے ہیں جو اردو نظم کو اپنے خونِ جگر سے سینچ رہے ہیں۔ جنھوں نے غزلیہ شاعری کے ساتھ ساتھ نظموں کا بھی وافر ذخیرہ تیار کیا ہے۔ یہ شعرا اپنے متقدمین شعرا کے نقشِ قدم پر چل کر پنجاب میں اردو نظم کی روایت کو بحال کیے ہوئے ہیں۔ ان میں اسلم حبیب، وشال کھلر، زاہد ابرول، سالک جمیل براڑ، روبینہ شبنم، ندیم احمد ندیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسلم حبیب مشرقی پنجاب کے جانے مانے شاعر ہیں۔ جو عرصۂ دراز سے شاعری کے افق پہ چھائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے شاعری کو ہی اپنا بنیادی وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ شاعری میں موصوف نے اردو نظم، غزل اور گیت جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو کے علاوہ اسلم حبیب پنجابی زبان میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ ''سہکدے پرچھاویں'' اور ''ہواتے اُکری کتاب'' پنجابی غزلیات کے مجموعے ہیں جس میں آخرالذکر مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ جب کہ ان کے اردو شعری مجموعوں میں ''داغ داغ''، ''اپنے گھر تک آپہنچا ہوں''، ''مجھے اک گیت ایسا دے'' قابلِ ذکر ہیں۔ مزید برآں ''صدق و وفا'' کے نام سے نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ ''ایک گیت ایسا دے'' میں غزلوں اور گیتوں کے علاوہ ان کی نظمیں بھی ہیں۔ یہ نظمیں ان کے 1969 تا 2011 تک کے ادبی دور کا احاطہ کرتی ہیں۔

ڈاکٹر اسلم حبیب نے بھی اپنے معاصرین کے طرز پر چلتے ہوئے آزاد نظمیں ہی

کہی ہیں۔ میرے مشاہدے میں آیا ہے کہ مشرقی پنجاب کے دور حاضر کے شعرا کا رجحان غزل کی جانب زیادہ رہا ہے اور جو نظم نگار شاعر ہیں انھوں نے آزاد نظمیں کہنے میں دلچسپی دکھائی ہے۔ نثری نظم، معریٰ نظم اور پابند نظم وغیرہ کہیں کہیں ان کے یہاں ناپید ہے۔ البتہ اسلم حبیب نے کم و بیش تمام نظمیہ اصناف میں لکھا ہے اور اس میں بھی ایک نیا تجربہ کرتے ہوئے گیت نما نظمیں لکھیں۔ نیز ان گیت نما نظموں میں بھی وہ نظمیہ شاعری کے حسن کو زائل نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ تخلیقی حسیت، فکر و شعور اور عصری آگہی کے احساس نے ان کی نظموں کو دلچسپ اور معنی آفرین بنا دیا ہے۔ اسلم حبیب اپنے آس پاس کے ماحول اور زندگی کو موضوع بناتے ہیں۔ وہ اپنے احساسات کو بڑی سادگی، متانت اور شستگی کے ساتھ تخلیقی روپ عطا کرتے ہیں۔ نہ وہ موضوع کا انتخاب کرتے وقت بھٹکتے ہیں اور نہ ہی اپنے ہدف سے چوکتے نظر آتے ہیں۔ وہ راست بازی اور سبک روی کے ساتھ نرم و ملائم لہجے میں اپنے خیالات اور فکر کی ترسیل کرتے ہیں۔ اسلم حبیب کی ایک نظم ''بے نور نگاہوں کو'' میں شاعر مشرق علامہ اقبال کی رباعی ''جوانوں کو میری آہِ سحر دے'' جیسی فکر و احساس کی سی جلوہ گری ملتی ہے:

بے نور نگاہوں کو اب نورِ سحر دے دے
بھٹکے ہوئے قدموں کو منزل کی خبر دے دے
کب تک یونہی بھٹکوں گا ان جاگتی سڑکوں پر
مجھ کو بھی کہیں یارب اک چھوٹا سا گھر دے دے

(بے نور نگاہوں کو)

اسلم حبیب اور علامہ اقبال کی نظم میں فرق صرف اتنا ہے کہ علامہ اقبال نوجوانانِ ملت کے لیے خدائے ذوالجلال کی بارگاہ میں دعا گو ہیں جب کہ مذکورہ بالا نظم میں شاعر اللہ تعالیٰ سے اپنے بھٹکے ہوئے قدموں کو منزل عطا کرنے، بے نور نگاہوں کو صبح کی مانند روشنی بخشنے، آرزؤں کی تکمیل کرنے، راہ راست دکھانے، کٹھن منزلوں کو آسان کرنے اور اُن منزلوں کی متلاشی آنکھوں کو سکون و قرار مہیا کرانے کی خاطر دعا مانگتا ہے جس کے لیے شاعر حیران و سرگرداں اور بے چین و مضطرب حالت میں نظر آتا ہے۔ اسلم حبیب کی نظمیں عشق اور پیار و محبت

کے رس میں گھلی ہوئی ہیں جن میں رومانی عناصر کی وہ جھلک ملتی ہے جو انسان کو بھٹکاتی نہیں بلکہ زندگی اور حسن سے قربت کے علاوہ دنیا کے فطری حسن کو مؤثر انداز میں محسوس کراتی ہیں۔ اس رومانی حس اور اظہار کی آزادی کے لیے وہ پھولوں، گلوں، کلیوں، ستاروں، گلستانوں، بادلوں، سمندروں، پروں، آسمان، چاندنی وغیرہ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ ان حسین خواہشوں کی تکمیل میں روڑے اٹکانے والوں سے بھی اپنی بات بے حد شگفتہ اور نازک انداز کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ غرض عشق کی انتہا کو وہ اس کمال تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ ''رکھے زمانہ یاد ہماری مثال کو'' کے مصداق ٹھہرے۔ اسلم حبیب کی ایسی نظموں میں ''ہونٹوں کو پھول''، ''تم ہو''، ''گوری اترے''، ''سوروپ بھرے''، ''میری بیوی''، ''کھیل یہ کیسا''، ''جیون سے''، ''بے وفا'' وغیرہ شامل ہیں۔ بعض نظموں کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

ہونٹوں کا پھول، آنکھ کو تارا کیا کریں
آچاندنی میں گھل کے تماشا کیا کریں
کلیوں کو اپنے پیار کے قصے سنائیں ہم
آکاش کے یہ دیپ سبھی توڑ لائیں ہم
اور بادلوں میں چل کے ذرا گنگنائیں ہم
آ اَب سمندروں کو کنارا کیا کریں
(ہونٹوں کو پھول)

محبت کی عطا تم ہو، عبادت کی ادا تم ہو
جو میرے لب پہ آئی ہے، میرے دل کی دعا تم ہو
(تم ہو)

اسلم حبیب نے جہاں رومانیت سے معمور اور عشق و مستی کی اُمنگوں سے ممیز نظمیں تخلیق کی ہیں، وہیں انھوں ماں، بیوی، بیٹی، بیٹے کی بڑی خوبصورت انداز میں ترجمانی کی ہے۔ جس طرح شاعر نے نظم ''میری ماں'' میں ایک ماں کے پاکیزہ احساسات اور بچے کی تئیں اس کی شفقت کو اُبھارا ہے۔ اسی طرح نظم ''میری بیوی'' میں بیوی کی اُلفت اور قربت،

اس کی جوانی اور تازگی، اس کی وفا شعاری اور پاکبازی کے گیت گاتے ہیں۔ اسلم حبیب نے ''گڑیا رانی''، ''بیٹی بوجھ بڑا ہے''، ''تو اللہ کا نور ہے''، ''میں پاپا کی بیٹی ہوں''، ''تجھے لوری سناؤں''، ''میں اسکول چلی''، ''آ بھی جاؤ! پاپا''، ''مجھے پیار نہ کر''، ''میں بھارت ماں کی بیٹی ہوں'' وغیرہ جیسی جذباتی اور فرحت انگیز نظمیں لکھ کر صحیح معنوں میں بیٹوں کی اہمیت اور ان کی عظمت کا احساس دلایا ہے۔ جو لوگ بیٹوں کی ناقدری کرتے ہیں، ان کو اپنے لیے بوجھ تصور کرتے ہیں، ان کا استحصال کرتے ہیں، ان کے حقوق چھینتے ہیں، ان کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کی اہلیت سے منہ موڑتے ہیں۔ اسلم حبیب کی نظمیں ایسے لوگوں کا منہ توڑ جواب ہیں۔ ''میں پاپا کی بیٹی ہوں'' سے ایک بند ملاحظہ فرمایئے

میں پاپا کی بیٹی ہوں، میں طوفانوں سے کھیلوں گی
اپنی ہمت سے مٹھی میں، چاند ستارے لے لوں گی
نیت اپنی صاف ہے پاپا، خواہش سیدھی سادی ہے
قسمت کی کچھ بات نہیں ہے، قسمت اپنی باندھی ہے
اپنی تدبیروں کے بل پر، میں قسمت سے کھیلوں گی
(میں اپنے پاپا کی بیٹی ہوں)

اسلم حبیب نے اپنی نظموں کے ذریعے ماؤں، بہنوں، ہم سفروں، بیٹوں، بچیوں، یتیموں اور بے سہارے معصوم بچوں کے تئیں سماجی اور معاشرتی بیداری کی جو مہم شروع کی ہے وہ ان کی ہمدردی اور دردمندی کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے۔ بیٹیاں کس قدر اپنے والدین سے پیار کرتی ہیں، اُنھیں خلوص اور محبت کا پیکر سمجھتی ہیں، اس کا اظہار مذکورہ نظموں سے واضح ہوجاتا ہے۔ وہ اتنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ اپنی عالی ہمتی اور عزم و حوصلے کے ساتھ بڑے بڑے کارنامے انجام دے کر والدین کی سربلندی کا موجب بھی بنتی ہیں۔ اسلم حبیب کی ایک نظم ''میں پہلا آدم ہوں'' ایک آدم کی دوسرے آدم کے لیے انسانی ہمدردی اور تہذیبی بقا کی سرشاری موجود ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلم حبیب کی نظمیں متنوع موضوعات اور فکری جہات کی حامل ہیں۔

زاہد ابرول مشرقی پنجاب کے ایک مقبول شاعر ہیں۔ان کا اصل نام وجے کمار ابرول ہے لیکن ادب میں زاہد ابرول کے نام سے مشہور ہوئے۔وہ اگرچہ ہماچل پردیش میں پیدا ہوئے تاہم ملازمت کے باعث انھیں پنجاب میں ہی زندگی گزارنی پڑی اور یہیں سے ان میں شاعری کا ذوق پروان چڑھا۔زاہد ابرول اپنی تخلیقی سرگرمیوں کی وجہ سے دورِ حاضر کے متحرک وفعال شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ان کے اب تک چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جن میں ''اندھا خدا'' (نظمیں)1978، ''ایک صفحہ پُرنم'' (نظمیں)1986، ''دریا دریا ساحل ساحل'' (غزلیں)2014اور ''خوابوں کے پیڑ تلے'' (نظمیں، قطعات، دوہے، گیت) 2015شامل ہیں۔نظم نگاری کی طرف انھوں نے خاصی توجہ دی اور یہی وجہ ہے کہ اس صنف میں اب تک ان کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔یوں کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ زاہد ابرول بنیادی طور پر نظم کے ہی شاعر ہیں۔

زاہد ابرول کا دو برس قبل ایک شعری مجموعہ ''خوابوں کے پیڑ تلے'' شائع ہوا۔جس میں زیادہ تر ان کی نظمیں شامل ہیں۔جن کو پانچ مختلف عنوانات ''روزنامچہ''، ''محبت''، ''زندگی''، ''ایک صفحہ پُرنم'' اور یادِ رفتگاں'' کے تحت ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔جب کہ اس شعری مجموعے کا آخری یعنی چھٹا باب ''قطعات'' پر مشتمل ہے۔پہلے باب میں ''ماں یشودھا''، ''روز بہ روز''، ''تین قدموں کا سفر''، ''صدائے بازگشت''، ''خواب پریشاں''، ''کافی ہاؤس''، ''قرض''، ''کارل مارکس''، ''کون ہو تم''، ''تماشائی''، ''شامِ افسردہ'' وغیرہ جیسی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔دوسرا باب ''اختتام''، ''تجسس''، ''پہلی نظر''، ''بہت خوبصورت ہو تم''، ''دریا دریا ساحل ساحل''، ''سہاگ رات''، ''ایک پہیلی''، ''سرگزشت''، ''جسم کی دھوپ''، ''شکست''، ''ردِعمل''، ''وہ اک لڑکی''، ''چھوٹی چھوٹی باتیں''، ''الجھن''، ''ستیم شیوم سندرم''، ''جانِ من'' وغیرہ نظموں پر مشتمل ہے۔''سانپ اور سپیرے''، ''ایمرجنسی''، ''میرے بھائی''، ''بیراگ''، ''سمندر منتھن''، ''غم''، ''اجنبی''، ''سدھ پو''، ''وہ پیڑ''، ''جنسیات''، ''بازیچۂ اطفال''، ''آب و ہوا''، ''خود فریبی''، ''اجنبی ہم سفر''، ''ملالہ یوسف زئی کے نام''، ''لکا چھپی''، ''ذاتیات''، ''دیوالی مبارک'' وغیرہ تیسرے باب میں شامل نظمیں ہیں۔چوتھے باب میں

جو نظمیں ہیں ان میں ''ایک صفحہ پُرنم''، ''اب بھی وقت ہے صحن گلزار بنا آتش زار''، ''کہیں وہ بھی''، ''قومی ترانہ''، ''اندھیر نگری''، ''باغبانی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد پانچویں باب میں ''کرشن ادیب''، ''آزاد پرندہ''، ''وہ مسکراتا سا ایک چہرہ''، ''آگ میں لپٹا ہوا'' اور ''سپنوں کا سوداگر'' نظمیں ہیں۔

''خوابوں کے پیڑ تلے'' میں شامل زاہد ابرول کی اولین قسم کی یعنی روزنامچہ کے تحت لکھی گئی نظمیں ماضی کی چند خوش گوار جھلکیوں کے ساتھ عہدِ حال کا نوحہ کرتی ہوئی ملتی ہیں۔یہ نظمیں اس ماحول اور دور کی تصویر کشی کرتی ہیں جو آج کی انسانی زندگی کا حاصل ہے۔ موجودہ عہد کا المیہ یہ ہے کہ زندگی کی قدر، معنویت اور خوشی کے متلاشی انسان کے ہاتھ صرف سسکتی، گھٹتی، دم توڑتی اور اذیت و خوفناک تہذیبی قدریں لگتی ہیں۔جہاں انسان نے اجگر کا روپ اختیار کیا ہو، اندھی قدروں کی پرستش ہوتی ہو، ظلم و بربریت انتہا کو پہنچی ہو، حقیقت اور سچائی انصاف کو ترستی ہو اور جہاں انسان تنہا، خود فریب و بُت بن گیا ہو ایسے معاشرے میں خوشحال زیست کی تمنا کیسے کی جا سکتی ہے۔نظم ''ماں یشودھا'' سے ایک بند قارئین کے ذوق نذر:

دن چڑھے گھر سے نکل کر
پھانکتا ہے دُھول اور پیتا ہے تلخابِ حیات
رات کو جب لوٹتا ہے گھر وہ دنیا بھر کا ٹھکرایا ہوا تو سوچتا ہے
اب کے کھلوایا جو ماں نے منہ تو کہہ دوں گا اُسے
زندگی کے اس مہابھارت میں اُس کا کرشن کب کا کھو چکا ہے
اب وہ جیتا جاگتا اِک بت ہے
جو اندر سے خالی ہو چکا ہے

(ماں یشودھا)

جیسا کہ مذکور ہوا ہے کہ زاہد ابرول نے روزنامچہ کے ذیل میں لکھی گئی نظموں کا آغاز بے حد خوش گوار انداز میں کیا ہے تاہم ان کا اختتام کراہیت آمیز زندگی کی عمدہ مثال

ہے۔زاہد ابرول اپنی نظموں کے ذریعے یہ بھی سمجھانا چاہتے ہیں کہ بچپن کا زمانے میں وہ دنیا کی پریشانیوں اور جھمیلوں سے بےفکر و بے پرواہو کر زندگی کا لطف اٹھاتا رہا۔مگر جونہی اس کی سوچ وفکر کو مہمیز مل گئی یعنی وہ وقت آگیا جب اسے زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا تھا تو وہ بے سروسامانی کے عالم میں حیران و پریشان نظر آیا جس کا ذمہ دار پوری طرح ہمارا موجودہ ماحول ومعاشرہ ہے جس نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔زاہد ابرول کے حصہ روزنامچہ کی یہ نظمیں زندگی کے دو مرحلوں کا پتہ دیتی ہیں۔زاہد ابرول کے مطابق زندگی کے ایک مرحلے کا رخ یہ ہے:

آج کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے
دوستوں کے درمیاں
پھر چلی تھی زندگی کی بات
زندگی، جس کو جیا ہم نے
سنہرے خواب بُن بُن کر
سجایا اپنا اپنا گھر
امیدوں، آرزوؤں، حسرتوں کے پھول چُن چُن کر
ہر ایک کے غم کو سہلا کر
ہر اِک کے درد کو سُن کر

(کافی ہاؤس)

جس نے زندگی کے ایک رخ میں اتنا حسین خواب سنجویا ہو، اتنے مہربان اور ہمدرد دوست پائے ہوں اور امیدوں، آرزوؤں اور حسرتوں کی اتنی خوبصورت مالا پروئی ہو۔اس کی زندگی کا دوسرا رخ دیکھ کر صحیح معنوں میں تعجب ہوتا ہے، آیئے اس دوسرے رخ سے آپ کو بھی شناسا کرائیں:

یہ سوچا بھی نہ تھا ہم نے
کہ جب خوابوں کی چادر اوڑھ کر ہم گھر سے نکلیں گے

تو ہر اک گام پر ہم کو
سوا ذلت، ریا کاری کے کچھ حاصل نہیں ہوگا
سبھی تھے بے خبر اس بات کی کڑوی حقیقت سے
زمانہ تیز آندھی ہے

(کافی ہاؤس)

زاہد ابرول کی باقی نظمیں بھی مادیت پرستی اور نفس کشی کے عناصر کو بڑی خوبی سے اجاگر کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ شاعر کی دوسری رنگ کی نظمیں بھی بہت پُر اثر اور معنویت سے لبالب ہیں۔ بعض نظموں میں وہ تخئیلاتی سطح پر اپنے محبوب کا چہرہ تراشتے ہیں اور اس سے اپنے عشق کے مسحور کن تجربات کا دلکش انداز میں اظہار کرتے ہیں۔ ایسی نظموں میں ''اختتامِ تجسس''، ''پہلی نظر''، ''ستیم شیوم سندرم''، ''اے میرے ہم نشیں'' شامل ہیں۔ دورانِ عشق وہ کن کیفیات سے گزرتے ہیں اس کا احساس ان کی نظموں سے ہوتا ہے۔ زاہد ابرول کے شعری مجموعے ''خوابوں کے پیڑ'' میں ایک باب زندگی کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ ''سانپ اور سپیرے'' ایک علامتی نظم ہے، جسے دورِ حاضر کے حالات کی بہترین علامت کہا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں معصوم و بھلے نوجوان سانپوں کو مکار اور چالباز سپیروں کے شکنجے میں آتے دکھایا گیا ہے۔ جو اپنے اندرون کی آواز کو محسوس کر اور سپیروں کی سُر کے شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ البتہ شاعر کہتا ہے کہ بین کی آواز ہمارے اندر آج بھی ہے اس لیے باہر کی آواز نہ سن کر اپنے بین کی سنیں۔ کیونکہ سپیروں کی صرف نسلیں بدلی ہیں ان کے اعمال نہیں بدلے۔ یہ سپیرے ہمارے بیچ مختلف شکلوں اور کرداروں میں موجود ہیں۔ ''میرے بھائی'' ایک حب الوطنی نظم ہے۔ جس میں سیاست کے سبب پیدا ہوئی آپسی منافرت کی دیواروں کو مٹانے کی تلقین ہے اور بغض و عداوت کے بجائے بھائی چارگی کو فروغ دینے کی سعی کی گئی ہے۔ ''ذاتیات'' ''دیوالی مبارک'' اور ''جنسیات'' بھی بے حد عمدہ نظمیں ہیں۔

زاہد ابرول کی بہت ساری آزاد نظمیں علامتی انداز کی ہیں جن میں استعاراتی نظام کا بھی خوب عکس ہے۔ موصوف کو نظمیہ شاعری پر گہرا عبور حاصل ہے۔ انھوں نے عصری

موضوعات کو بہت غیر جانبداری سے نظم کیا ہے۔معاشرے میں پھیلی بدکاری،نفرت کی سنڈاس ہوا،ریاکاری اور ظلمت کا گھناؤنا کھیل،دہشت زدگی اور قوم دشمن عناصر وغیرہ کے خلاف زاہد ابرول نے دلیرانہ انداز میں لکھا ہے۔ان کی شاعرانہ زبان اور اسلوب نہایت رواں اور شگفتہ ہے جس میں متانت اور پہلوداری کی خوبی اس قدر موجود ہے کہ قاری ان سے بہ آسانی مانوس ہو جاتا ہے۔

سالک جمیل براڑ مشرقی پنجاب کا جواں ہی نہیں بلکہ بہت ہونہار شاعر ہے جنھیں بیک وقت کئی اصناف میں شعر کہنے کا وصف حاصل ہے۔انھوں نے اردو کی بیشتر اہم اصناف شاعری،افسانہ،تنقید اور تحقیق وغیرہ میں اپنے فنی جوہر دکھائے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ موصوف نوجوان شاعر کی اب تک درجنوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔سالک جمیل براڑ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں لیکن جس قدر انھوں نے شاعری،تنقید اور تحقیق و تالیف میں دلچسپی دکھائی ہے۔اس سے یہ اندازہ لگانا انتہائی مشکل ہے کہ وہ کس صنف میں فنی مہارت رکھتے ہیں۔ سالک کے اب تک دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جس میں ''غموں کی دھوپ'' اور ''دل ذرا ڈرنے لگا'' قابلِ ذکر ہیں۔اول الذکر مجموعہ نظموں اور غزلوں جب کہ آخر الذکر مجموعہ آزاد نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔یہ دونوں مجموعے اکیسویں صدی میں ہی منظر پر عام آ چکے ہیں اور ان کی شعری و ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی بھی ہوئی ہے۔حالیہ برسوں میں سالک نے نظمیں،غزلیں،قطعے،دوہے اور گیت وغیرہ بے دھڑک لکھے ہیں۔ان کی نظموں کی قرأت کے بعد شاید ہی کوئی قاری یہ کہے کہ شاعری موصوف کا اصل میدان نہیں۔ کیونکہ ان کی آزاد نظمیں دلآویزی،تخلیقی آمیختگی اور فنی پختگی سے مالامال ہیں۔ان کی بعض نظموں میں ''عبادت''،''اے مرے مولا''،''قتل''،''اُڑنے دو''،''ہمیں لڑنا ہے''، ''جنگل راج''،''معیار''،''دوڑ''،''جب بھی میں''،''احساس کی موت''،''وہ ایک آواز''، ''لمحہ لمحہ یاد آؤں گا''،''لمحہ لمحہ پیاس''،''اے پرندو''،''ماضی کا عکس''،''حسین خواب''، ''تخلیق کا کرب''،''زندگی نامہ'' وغیرہ اہم ہیں۔

سالک جمیل براڑ کی نظمیہ شاعری میں باطنی کیفیات کا عمل دخل ہے۔وہ سطحی اور

جذباتی شاعری کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ان کی نظموں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شاعری کے لیے خارجی ماحول سے مواد حاصل کرتے ہیں اور زندگی پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو قبول کر کے ان کے تدارک کا سوچتے ہیں۔فکری حسیت اور تخیلی جدت ان کی شاعری کو پختہ اور رچاؤ کا حامل بنانے میں معاون و کارگر ثابت ہوئی ہے۔سالکؔ کی نظموں میں محسوساتی رنگ ہے جس میں شاعر آزاد فضا میں سانس لیتا نظر آتا ہے، یہ نظمیں مثبت فکر اور سوچ کی حامل ہیں۔نظم ''عبادت'' اس کا خوبصورت نمونہ ہے جس میں شاعر مثبت فکری عمل سے پورے ماحول کو معطر کر دیتے ہیں۔یہ کہنے میں کیسی ہچکچاہٹ کہ سالکؔ کی مذکورہ نظم زندگی جینے کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔انھوں نے جس چیز کو محسوس کیا اسے علامتی انداز میں بڑی فن کاری کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اتارا، گویا جسے شاعر ''عبادت'' سے تعبیر کرتا ہے۔نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

اُسے دیکھنا/کبھی/خوشبو بکھیرتی کلیوں میں/رنگ
برنگی چنچل تتلیوں میں/مست ہواؤں کے جھونکوں
میں/اوس کے ننھے قطروں میں/ریت کے چمکتے
ذروں میں/گاتی فضاؤں کے نغموں میں/آسمان
کے آنگن میں جھلملاتے تاروں میں/بکھرتی ترنگوں
میں/ہاں یہی عبادت ہے۔۔۔

''اے میرے مولا'' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر کی دردمندی اور فکرمندی کا پہلو پوشیدہ ہے۔ایک ننھا سا مسافر جو انجان منزل کی خوشبو کے جنوں میں سرگرداں پھر رہا ہے۔جس کو زندگی کی تیز آندھیوں کو سر کر کے سفر کا آغاز کرنا ہے، کہیں اس حالت میں وہ منزل سے بھٹک نہ جائے اس واسطے شاعر متجسس نظر آتا ہے۔شاعر اس ننھے پرندے، اس ننھے مسافر کے تئیں اپنے خلوص کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

زندگی کی/تیز آندھیوں میں/ابھی ابھی/اک ننھا
پرندہ/اُڑا ہے/انجان منزل کی خوشبو کے جنوں

میں/ یہ ننھا مسافر/ کہیں/ اُڑتے اُڑتے/ تھک نہ
جائے/ کہیں اپنے راستے سے بھٹک نہ جائے/ کسی
بدنظر کا شکار نہ ہو جائے۔۔۔

سالک جمیل کی نظم ''اُڑنے دو'' کو مذکورہ نظم کی توسیع کہا جا سکتا ہے۔ جس میں اُس ننھے پرندے کی پرواز کے حدود کو دکھانے کی سعی کی گئی ہے۔ ''اے میرے مولا'' میں شاعر اپنے مولا سے ننھے پرندے کی پرواز بلند کرنے، اس کو اونچی چٹانوں کا شاہین اور کردار کا غازی بنانے کے علاوہ آدابِ زندگی سکھانے کی دعائیں مانگتا ہے۔ جب کہ ''اُڑنے دو'' میں شاعر اس ننھے پرندے کی سچی سوچ کی اڑان پر پہرے لگانے والوں، رسوم و رواج، رنگ و نسل، ذات پات، چھوا چھوت، دھرم کے ٹھیکداروں، مکار سیاستدانوں کو اس بنیاد پر طنز کا نشانہ بناتا ہے کہ وہ اس معصوم اور بھلے پرندے کی سوچ کو زنجیروں میں نہ جکڑے بلکہ اس کو اپنی سرحدوں کو عبور کرنے دیں تا کہ وہ کھلی ہوا میں سانس لے کر اپنے عزم کو تکمیل تک پہنچائے۔ اس میں لگن، یقین اور اعتماد کی جو کرن نظر آ رہی ہے وہ قوموں کی ترقی کا نشانِ امتیاز کہلائے گی۔ اسی نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

اے رنگ و نسل اور سرحدوں میں بٹے انسانو!/
محدود نہ کرو اس کی پرواز کو/ چڑھاؤ نہ اس پر اپنی
مخصوص سوچ کا رنگ/ بانٹو نہ اِسے فرقوں میں/
اُڑنے دو/ اِسے اس رنگ برنگے مہکتے گلوں کے
چمن میں/ نئے جذبوں، نئی ترنگوں میں۔۔۔

سالک جمیل کی اس نوعیت کی دیگر نظموں ''دوڑ''، ''وہ ایک آواز''، ''اے پرندو''، ''ماضی کا عکس'' اور ''میں اُسے دیکھتا ہوں'' وغیرہ میں اسی کیفیت کے احساس پنہاں ہے۔ مگر ''قتل''، ''ہمیں لڑنا ہے''، ''جنگل راج''، ''احساس کی موت'' وغیرہ نظموں میں انقلابی لب و لہجے کی گھن گرج سنائی دیتی ہے۔ ان میں شاعر نے باغیانہ اور احتجاجی روّیہ اپنایا ہے۔ چونکہ وہ ادیب ہے اس لیے وہ لفظوں کے وار کرنے میں یقین رکھتا ہے۔ مثلاً لفظوں کا

وار حکومت کی ظالمانہ پالیسیوں پر، بغاوت رشوت خوری اور بے ایمانی کے خلاف، احتجاج قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ اور عیاری و مکاری کے خلاف اور ظلم و جبر کرنے والوں اور شرپسندیوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی التماس وغیرہ۔ یہ سب مذکورہ نظموں کی خصوصیات ہیں۔ ''وہ ایک آواز تھی'' سے ایک بند ذہن نشین کیجیے:

وہ ایک آواز تھی / حق، سچائی، رشوت خوری، بے
ایمانی / ظلم اور جبر کے خلاف / اُٹھی آواز تھی / مگر؟؟ /
یہ کیسا شور ہے؟......؟ / یہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ /
اس کے پیچھے کون ہے؟

''جب بھی میں''، ''لمحہ لمحہ یاد آؤں گا''، ''لمحہ لمحہ پیاس''، ''حسین خواب'' اور ''کوئی آیا'' وغیرہ نظمیں شاعر کی رومان پروری اور جمالیاتی حس کی دلالت کرتے ہیں۔ ان نظموں میں جس حسین دنیا کا خواب دیکھا گیا ہے وہ یقیناً اس انتشار اور افراتفری کے ماحول سے الگ ہے۔ جہاں انسان کو جینے کی آزادی ہو، جہاں کی گلیاں الفت سے روشن ہو، جہاں قدرتی مناظر کی چیر پھاڑ نہ ہوتی ہو اور جہاں کی زندگی میں نور ہی نور ہو وغیرہ۔ غرض سالک کی نظمیں انسانی اُمنگوں، جذبوں، حوصلوں، تمناؤں کو اُبھارتی ہیں اور زندگی کو تصور ہی تصور میں مہکانے کا کام انجام دیتی ہیں۔ ان کی نظمیہ شاعری موضوعاتی اعتبار سے بہت پیوست ہے۔ جن میں کافی حد تک آپسی مماثلت ہے۔

وشال کھلر مشرقی پنجاب کے نوجوان و معاصرین اور غیر مسلم شاعروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جس میں ''دھند میں اماں'' اور ''خواب پلکوں میں'' قابلِ ذکر ہیں۔ اولین مجموعے کی مقبولیت کا اندازہ ساہتیہ اکادمی کے یُوا پرسکار ایوارڈ سے لگایا جاسکتا ہے جو انھیں 2011 میں ملا۔ وشال کھلر کے مذکورہ دونوں مجموعے بہترین غزلوں اور نظموں کا گلدستہ کہے جا سکتے ہیں۔ ''دھند میں اماں'' کے متعلق یہ تاثر ملتا ہے کہ اس مجموعہ میں شاعر نے نئے استعاروں اور نئی امیجری کا استعمال

کیا ہے جس نے قارئین کو بہت پر متاثر کیا ہے۔ جس میں کہیں یادیں ہیں تو کہیں ذاتی اور سماجی کشمکش۔ اس مجموعے کو اردو شاعری میں خاص اضافہ قرار دیا گیا ہے۔ وشال کھلر نے نئی صدی کے بالکل آغاز میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا جس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''میرا ادبی سفر 2001 میں شروع ہوا جب میری اولین غزل ''شاعر'' میں شائع ہوئی۔ اس سے قبل میری ملاقات 2000ء میں پروفیسر عزیز پریہار سے ہوئی جنھوں نے نہ صرف اردو زبان سے روشناس کرایا بلکہ ادب تخلیق کرنے کے لیے لازمی رموز ونکات کے تئیں بھی ٹریننگ فراہم کی۔''
>
> (''خواب پلکوں میں'، فلیپ کور)

ادب کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد وشال کھلر نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ ان کی تخلیقات متواتر منظر عام پر آتی رہیں یہی وجہ ہے کہ اتنے قلیل عرصے میں ان کے دو ضخیم مجموعوں کی اشاعت ممکن ہوئی۔ ایسا نہیں کہ وشال کھلر نے محض غزل کی طرف توجہ کی ہو بلکہ انھوں نے نظم کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ آج کے بعض شاعروں نے ماورائی شاعری نہیں کی بلکہ انھوں نے دنیا کو اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کے کرب کو محسوس کیا ہے اور دنیاوی ہلچل کو اپنی شاعری میں برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وشال کھلر بھی ایک ایسے ہی شاعر ہیں جنھوں نے اپنی آزاد اور نثری نظموں کے ذریعے اس عنصر کی ترجمانی کی۔ وشال کی شاعری تشکیک، انتشار، ذات کی کشمکش، بے چینی اور غیر یقینی کے دور دورہ کا بیانیہ ہے۔ ''لمحۂ آمد''، ''لہو بورہا ہے''، ''خواب ماورا ہے''، ''خون جلتا ہے''، ''خواب نامہ''، ''دعوت''، ''دستک'' وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ شاعر نے بعض نظموں میں خوابوں کی دنیا سجائی ہے کیونکہ اب دنیا میں انسانی خواہشات محض خوابوں تک ہی سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ اندرونی خلفشار کا جنم لینا، فساد کا برپا ہونا، لہو کا بہنا، درد کا پنپنا، آرزوؤں کا دبنا اور امیدوں کے سہارے جینا وغیرہ کے اردگرد بھی موصوف کی شاعری گردش کرتی نظر آتی ہے۔ وشال کی نظم ''لمحہ'' سے ایک بند ملاحظہ کیجیے:

ابھی اک شاخ رہنتے ہوئے/اک پھول کی خوشبو/
جو ٹوٹی ہے/اُسی نے موسموں کو/راگ کی تعلیم بخشی
ہے/اُسی نے درد کو/تاثیر میں بہنا سکھایا ہے/مگر
اک خواب جو/ریشم کے دھاگوں میں/کہیں الجھا
ہوا سا ہے/اسے جاگتے سوتے/سُروں سے/
گنگناتا ہوں/اسے میں روشن/آئینے میں/دیکھ لیتا
ہوں۔۔۔۔

وشال کھلر نے محبت سے سرشار نظمیں بھی تخلیق کی ہیں۔جس میں ''اے محبت! میں تجھے راس بہت آؤں گا'' اور ''مراجعت'' وغیرہ قابل ذکر نظمیں ہیں۔ان نظموں میں محبت کی چاہت بیان ہوئی ہے کہ محبت سے شاعر کا دل بہت مانوس ہے بشرطیکہ اسے پیار و محبت سے کہیں واسطہ پڑے۔''اے محبت! میں تجھے راس بہت آؤں گا'' میں محبت کی انتہا جھلکتی ہے۔اس میں محبت کی جو تعریفیں بیان ہوئی ہیں وہ قابلِ رشک ہیں۔ایک بند ملاحظہ ہو:

اے محبت!
میں تجھے راس بہت آؤں گا
میں ترے پھول سے ہونٹوں کو جہاں چوموں گا
میں ترے گیت کی ٹہنی پہ جہاں جھوموں گا
میں ترے روپ کی سرگم کو جہاں چھیڑوں گا
میں ترے رنگ کی لالی سے جہاں کھیلوں گا

وشال کھلر کی نظموں میں ایک دلنشین احساس کی لَو ہے۔ان میں سچائیاں منعکس ہیں، کچھ اندرونی کیفیت کا اظہار بھی ہے، کچھ نظموں میں شگوفے پھوٹے ہیں، کچھ میں درد کا بیان بھی ہے، کچھ جیتی جاگتی حقیقتیں ہیں اور کچھ میں حق و باطل کا راز منکشف ہے۔وشال کی نظموں میں جدت آمیزی ہے۔وہ اپنی خاموش طبیعت سے بھی نظم کو معنی آفرین اور پُر اثر

بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وشال کھلر کا لب ولہجہ اپنے عہد کے شاعروں سے بالکل جداگانہ رنگ کا ہے اور یہ چیز بھی انھیں ممتاز کرتی ہے۔

مشرقی پنجاب کے دیگر نظم نگار شاعروں میں ڈاکٹر محمد رفیع، روبینہ شبنم، ڈاکٹر سلیم زبیری، روپا صبا، محمد عمر فاروق، امرت پال سنگھ شیدا، سنجے سوداگر، ساجد اسحاق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام شعرا مشرقی پنجاب میں اردو نظم کی روایت کو فروغ دینے نمایاں کام انجام دے رہے ہیں۔

☆☆☆
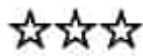
# اردو زبان میں سائنسی صحافت

## (صورتِ حال، تقاضے اور امکانات)

اردو میں مجلّاتی صحافت، اخباری صحافت اور برقی صحافت ایک مقبول موضوع ہے لیکن سائنسی صحافت کے موضوع کی کمی ہندوستان میں آج بھی کھلتی ہے۔ ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ اتنی بھی پرانی نہیں ہے کہ اس کا احاطہ نہ کیا جا سکے اور اتنی نئی بھی نہیں ہے کہ اس کے موضوع کو سمیٹنا آسان ہو۔ یہاں انیسویں صدی کی دوسری دہائی ہی سے اردو اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے اور تب سے آج تک سینکڑوں کی تعداد میں اخبارات اور رسائل و جرائد شائع ہوئے ہیں جو مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے۔ بہت سارے اخبارات اور رسائل موقوف بھی ہوئے اور بعضوں پر قدغنیں بھی لگائی گئیں مگر وقفے وقفے سے ان کی جگہ نئے اخبارات اور جریدے عوام میں متعارف ہوتے رہے۔ یوں اردو صحافت کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا جس کا صحافتی سفر آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں ہے۔ ہندوستان میں اردو صحافت کی تشہیر اور ترقی و ترویج میں اخبارات و رسائل بہت بڑے اور بنیادی وسائل تصور کیے جاتے ہیں، جنھوں نے اردو کے مختلف موضوعات کی ترسیل و ابلاغ میں ایک نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ہندوستان میں اردو صحافت کے ماقبل کا زمانہ ہو یا اس کے بعد کا زمانہ۔ گویا ہر دور میں سیاسی، معاشی، اقتصادی، تعلیمی، اصلاحی، اخلاقی اور سائنسی پیمانے پر انقلابی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ وہ چاہے 1857 کی جنگ آزادی کا زمانہ رہا ہو یا آزادی کے بعد کا زمانہ، وہ چاہے انیسویں صدی کے حالات و واقعات ہوں یا بیسویں صدی کے یا

موجودہ صدی کے تقاضے ہوں اردو صحافت نے ان تمام کو خود میں ضم کر کے تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے۔

ہندوستانی اخبارات و جرائد میں مختلف موضوعات کا خزینہ ہوتا ہے۔ بعض اخبارات میں موضوعات مختص رکھے جاتے ہیں۔ان اخبارات میں قومی اور بین الاقوامی سیاسی خبریں، انسانی زندگی سے متعلق تمام خبریں، سیاست، تہذیب وتمدن، اداریے، تعلیم، ملازمت، پیدائش و موت، تقریب یوم پیدائش، جرائم، کارٹون، اشتہارات، مضامین، سیاسی، سماجی اور معاشی خبریں، ادبی و مذہبی مضامین، طب، سائنس، ٹکنالوجی، فلموں اور کھیلوں کی خبریں، شہروں اور مختلف اضلاع کی سرگرمیاں، زرعی خبریں، سیمینار، جلسے، موسم کے حالات، تجارت اور صنعت وحرفت کی خبریں وغیرہ شائع ہوتی ہیں۔غرض کہ اخبارات میں زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں کا ذکر ملتا ہے۔لیکن اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اردو صحافت وہ چاہے اخباری صحافت ہو یا مجلاتی صحافت، میں سائنسی موضوعات کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔لیکن ایسا بھی نہیں کہ اردو صحافت سائنسی مضامین سے یکسر خالی ہے۔چنانچہ جس قدر قارئین اور لکھنے والوں کا سائنسی موضوعات کی جانب رجحان ہونا چاہیے تھا اُس میں کمی دیکھنے کو مل رہی ہے۔سائنسی موضوع کو علمِ ریاضی کی طرح خشک موضوع سمجھا جاتا ہے اس لیے شاید سائنسی موضوع میں کم دلچسپی کی یہ بھی ایک وجہ رہی ہو۔تاہم اخبارات میں شاذ و نادر ہی سہی سائنسی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔سائنسی مضامین جن ہندوستانی اخبارات میں نظر سے گزرتے رہتے ہیں ان میں انقلاب، راشٹریہ سہارا، کشمیر عظمیٰ، میرا وطن، قومی تنظیم، ہمارا سماج، نیا نظریہ، اخبار مشرق، سیاست، منصف، صحافی دکن، اودھ نامہ، آگ، صحافت، تاثیر، سیاسی تقدیر وغیرہ شامل ہیں۔یہ بات ذہن نشین کرانا بہت ضروری ہے کہ ہندوستان میں سینکڑوں کی تعداد میں اس وقت بھی اردو اخبارات چھپتے ہیں اس لیے یہاں پر تمام اخباروں کے نام گنانا طوالت کے سبب مشکل ہے۔راقم الحروف کے مشاہدے میں آیا ہے کہ بیرونی ممالک میں سائنس کے حوالے سے جو تحقیق ہوتی رہی ہے اُس کی رپورٹیں بعد میں اُن ممالک کے سفارت خانوں کے توسط سے یو این آئی، آر این آئی اور دیگر نیوز ایجنسیوں کے ذریعے ہندوستانی

اردو اخبارات میں ترجمے کے ساتھ شائع ہوتی آئی ہیں۔اس کے علاوہ ماحول، صحت، جغرافیۂ طبعی، غذا، امراض، آلودگی، شکاریات، جنگلاتی وسائل، توانائی، آب وہوا، آبی ذخائر، سائنسی ایجادات، کیمیات، طبعیات، حیاتیات، نباتات، ریاضی، قدرتی فلسفہ اور دیگر کارآمد سائنسی معلومات سے متعلق مضامین بھی اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔اب بعض اخبارات نے دیگر موضوعات کی طرح سائنسی موضوع کے لیے بھی اخبار کا ایک صفحہ مختص کرلیا ہے۔

ہندوستان میں گذشتہ دو صدیوں سے نہایت کثیر تعداد میں رسائل و جرائد شائع ہوتے رہے ہیں۔ان رسالوں کی نوعیت علمی وادبی، مذہبی، سیاسی، سماجی، معاشی، اصلاحی، تہذیبی، ثقافتی، فلمی اور سائنسی وغیرہ ہوا کرتی ہے۔اگر اردو میں سائنسی صحافت کے حوالے سے بات کی جائے تو یہاں بھی صورتِ حال زیادہ بہتر نہیں ہے۔البتہ کچھ مخصوص رسالے سائنس کے حوالے سے شائع ہوتے ہیں جن سے سائنسی صحافت کو فروغ ملا اور سائنسی میدان سے تعلق رکھنے ادیبوں اور قلم کاروں کو سائنس کے مختلف النوع موضوعات پر لکھنے کی ترغیب ملی۔اس قسم کے رسائل و جرائد میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کا ماہ نامہ سائنس، سائنس کی دنیا، اسلم پرویز کی ادارت میں شائع ہو رہا رسالہ سائنس، ہمدرد صحت، رسالہ ہندوستانی، رسالہ خدنگِ نظر، روحانی سائنس، سائنس کی کائنات، رسالہ طبعی سائنس، رسالہ خاتون، رسالہ کیمیکل سوسائٹی، طبیہ کالج میگزین، رسالہ حیوانیات (شعبہ حیوانیات علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی)، سائنس اور کائنات ٹائمز، سائنس اور کائنات، آیات وغیرہ شامل ہیں۔

ہندوستان کے وہ قدیم اردو رسائل جن میں سب سے پہلے سائنسی مضامین شائع کیے جاتے تھے اور ترجیح دی جاتی تھی اس میں پندرہ روزہ رسالہ ''فوائدالناظرین'' بھی قابلِ ذکر ہیں جس کے ایڈیٹر دہلی کالج کے استاذ اور علم ریاضی کے امام ماسٹر رام چندر تھے۔ ''فوائد الناظرین'' میں علمی، تاریخی اور سائنسی مضامین شائع ہوتے تھے۔اس میں سلسلہ مضامین طبعیات، بیان پن چکی کا، علم ہئیت، بیانات حیوانات کا، انسان کی عقل کا بیان، حال جانوروں عجیب کا، معرفت طبعی، مقناطیس بنانے کی ترکیب، حال ستارہ مشتری کا، مریخ ستاروں کا بیان، وجود کیڑوں کا پانی میں وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت مضامین کی اشاعت ہوتی رہتی

تھی۔رسالہ ''خیر خواہ ہند اور محبِ ہند'' کو بھی ابتدائی رسائل میں سائنس صحافت کے حوالے سے اولیت حاصل ہے۔اس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر ہی تھے۔''محبِ ہند'' میں بھی سیاسی،تاریخی اور سائنسی معلومات کے علاوہ ہم عصر شعرا اور اساتذہ کا منتخب کلام ملتا ہے۔

اردو کی ادبی صحافت ہو یا سائنسی صحافت سرسید احمد خاں کے نام کے بغیر نامکمل ہے۔سرسید احمد خان کا نام اردو کی سائنسی صحافت کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے سائنس جیسے سنجیدہ اور بہت ہی مفید موضوع کو عام کیا۔یہ رسالہ دسمبر 1870 کو جاری ہوا۔''تہذیب الاخلاق'' میں علمی،مذہبی،اخلاقی،تمدنی،سائنسی نیز دیگر مضامین کے شائع ہونے سے اردو صحافت میں انقلاب پیدا ہوا۔اس رسالے میں سائنسی علوم وفنون پر مضامین کو اہمیت کے ساتھ جگہ دی گئی اور اس موضوع پر لکھنے والوں میں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ،عنایت اللہ،محمد ابوالحسن وغیرہ شامل تھے۔یکم ربیع الثانی سن 1312ھ کے شمارے میں عنایت اللہ کا سائنسی موضوع پر لکھا گیا ایک مضمون بعنوان ''نیچرل سینٹر کے عجائبات'' کے تحت شائع ہوا۔جس کا مندرجہ ذیل میں ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

> ''ہم اپنی دور بینوں کے ذریعہ سے جواب کمال کے ذریعے کو پہنچ گئی ہیں چاند کی مفصل کیفیت اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں اور اس کا ایسا امتحان کر سکتے ہیں جیسے زمین پر کسی دور کی چیز کو دیکھیں۔اس لیے ہم ایک خاص حد تک اس کی طبعی کیفیت (جیالو) کو بخوبی معلوم کر سکتے ہیں۔''1

''تہذیب الاخلاق'' کے سائنسی موضوعات اور مواد کے حوالے سے پروفیسر شافع قدوائی لکھتے ہیں:

> ''تہذیب الاخلاق کا اجراء مسلمانوں کی جدید سائنس کی جانب بے رغبتی کو ختم کرنے کے لیے ہوا اور اس نے سائنسی اصولوں اور نئی دریافتوں سے متعارف کروایا۔اس کا سائنسی دریافتوں پر اصرار لمبے وقفے تک مسلمانوں میں سائنس وٹکنالوجی کے تئیں رغبت پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔

تہذیب الاخلاق کے مطابق سائنسی علوم سے روشناسی تعلیمی، تہذیبی اور دانشوری کو نئی زندگی عطا کرنے میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔'' 2

سرسید کی کاوشوں اور سائنس کے تئیں ان کی عملی جستجو سے تہذیب الاخلاق باضابطہ طور پر پہلا رسالہ بنا جس میں سائنسی تعلیم اور سائنس سے متعلق کئی اہم موضوعات پر مضامین شائع ہونے لگے۔ ہندوستان کے سربرآوردہ اردو شاعر اور معروف سائنسی صحافی پنڈت گلزار زتشی دہلوی اپنے ایک تحریر کردہ مضمون ''اردو سائنسی صحافت ایک سرسری جائزہ'' میں سرسید کی سائنسی صحافتی خدمات کا اعتراف نہایت ہی نفیس اور شائستہ الفاظ میں کرتے ہیں:

''آخر 'مردے از غیب بروں آید' کی مِصداق سرسید احمد خاں' اس بسیط صحرائے ادب میں نخلستانِ سائنس کی دریافت کو نکل کھڑے ہوئے اور انھوں نے اس ضمن میں اُس دور کے حالات و وسائل اور اقدار و روایات، عقیدے اور نظریوں کے موجود ہجوم میں اور توہم پرستی کے دور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ کچھ کتابیں سائنسی علوم پر تصنیف و تالیف کرائیں۔ کچھ تراجم ہوئے، چند سائنسی مضامین لکھے گئے اور ان کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' میں سائنسی موضوعات و علوم پر کچھ قلم آزمائی کی گئی۔ اس طرح سید احمد خاں نے اردو والوں کو ایک نئی ڈگر پر ڈالا اور سائنسی تحریروں پر کچھ توجہ کرنے کی بسم اللہ ہوئی۔'' 3

گلزار دہلوی نے اس مضمون میں ماقبل آزادی اور بعد از آزاد ہندوستان کی سائنسی صحافت کے بارے میں ہر ممکن تحقیقی جانکاری فراہم کردی ہے جو کسی بھی محقق کے لیے بہت معاون و مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ انھوں نے دونوں وقتوں میں ہندوستان میں سائنسی صحافت کی صورتِ حال سے مکمل طور پر آگہی دلائی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ 1917 سے لے کر 1947 تک سائنسی صحافت کے تعلق سے نظام حیدرآباد کے ایماء پر دارالترجمہ اور دارالاشاعت' حیدرآباد فرخندہ باد سے ایک منظم، اعلیٰ پیمانے اور بلند معیار کی ایک اہم پہل ہوئی۔ جہاں زبان و فلسفہ کے علمی و ادبی، عالی دماغ جمع کیے گئے، وہیں اِس کے ساتھ ساتھ

سائنسی علوم و کتب کا ترجمہ اور اصطلاحاتِ سائنس کا ترجمہ بڑے پیمانے پر عمل پذیر ہوا۔ کیمیا، طبعیات، نباتات، ادویات، نجوم، ہیئت، ریاضی، حساب و ہندسہ، جغرافیہ، علم الارض، علم الحیوانات، انجینئرنگ وغیرہ بے شمار علوم کے نصابی ترجمے کیے گئے اور اصطلاح سازی ہوئی۔ آٹھویں سے ایم۔اے تک بلکہ پی۔ایچ۔ڈی تک اردو ذریعہ تعلیم کا کامیاب ترجمہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ مختلف اخبارات اور رسائل میں سائنسی مضامین لکھے جانے کی روایت کا آغاز ہوا اور ملک کو اور اردو معاشرے کو اردو سائنسی صحافت اور اردو سائنسی ذریعہ تعلیم و مطالعہ کی طرف راغب کیا گیا۔

ماسٹر رام چندر، سر سید اور نظام حیدرآباد کے بعد سائنسی صحافت کو فروغ دینے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خدمات کو بھی قطعی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی کے ساتھ مشترکہ اور غیر منقسم ہندوستان میں پہلے اورنگ آباد اور حیدرآباد اور پھر 1939-1938 سے 1947 تک انجمن ترقی اردو (ہند) دلی سے اردو میں سائنس کا کام کیا اور ایک خالص سائنسی رسالہ ''سائنس'' شائع کیا۔ جس کے ذریعے بہت عرصے تک سائنسی مضامین شائع کیے گئے اور دیگر سائنسی علمی و ادبی سرگرمیوں کی اشاعت و تشہیر ہوتی رہی۔ آزاد ہندوستان میں اردو سائنسی صحافت کی با قاعدہ شروعات مجلّہ ''سائنس کی دنیا'' سے ہوئی۔ جس کا پہلا شمارہ 20/ جون 1975 میں شائع ہوا اور راشٹر پتی بھون میں اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند کے بدست اس کا اجرا عمل میں آیا۔ ''سائنس کی دنیا'' سہ ماہی رسالہ ہے جس کے پہلے مدیر پنڈت ز تشی گلزار دہلوی تھے۔ یہ ایک سائنسی رسالہ ہے۔ جس میں اردو داں عوام و طلبہ کے لیے مفید عوامی اور دلچسپ سائنسی معلومات، سائنس و تکنیکی ترقیاں، نئی نئی ایجادوں، عام طالب علموں اور جستجو کاروں کے لیے بہترین مضامین شائع ہوتے ہیں۔ سائنسی خبریں، عوام کی سائنس، سائنسی مشغلے، جرائم اور سائنس، سائنسی کہانیاں، سائنسی ادارے اس کے موضوعات ہوتے ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں بہترین سائنس داں، دانشور، ماہر تعلیم، ریسرچ کرنے والے اور سائنسی فکر کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ یہ مجلّہ آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔

ماہ نامہ ''سائنس'' دہلی سے اسلم پرویز کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ گذشتہ پچیس برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے نے جو سائنسی خدمات دی ہیں وہ نا قابل فراموش ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز اس سائنسی جریدے کے بانی و مدیر ہیں اور یہ رسالہ انہی کی فکر اور سوچ کا نتیجہ ہے جو اتنے برسوں تک بغیر کسی سرکاری معاونت کے شائع ہو رہا ہے۔ اس جریدے میں ہر قسم کے سائنسی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اردو سائنسی صحافتی سرگرمی کو برقرار رکھنے اور اسے جاودانی عطا کرنے میں ماہ نامہ ''سائنس'' ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے ''سائنس'' کے پچیس سال مکمل ہوتے ہی ڈاکٹر محمد کاظم کی کتاب ''اشاریہ ماہنامہ سائنس'' کے اجرا کے موقعے پر غالب اکادمی، دہلی میں رسالے کے اغراض و مقاصد کے حوالے سے کہا تھا کہ یہ ایک ماہ نامہ ہی نہیں بلکہ اردو میں سائنس کو فروغ دینے کی ایک اہم تحریک ہے جس کا مقصد مکمل علم اور دین کی دعوت دینا ہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کی سائنسی علوم سے دوری پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ قرآن کی چند آیتوں ہی کو مکمل اسلام سمجھے ہوئے ہیں۔ جب کہ قرآن مسلمانوں کو کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ جب قانون دین میں شامل ہے تو قانونِ فطرت علم دین سے الگ کیسے ہو سکتا ہے؟۔ اسلم پرویز نے اپنی تقریر میں علم کی نافع اور غیر نافع کی تقسیم کو غیر ضروری قرار دیا، اُن کے مطابق سبھی علوم فائدے مند ہیں، خرابی اِن کے غلط استعمال میں ہے۔ ڈاکٹر عزیر اسرائیل نے ''اشاریہ ماہنامہ سائنس'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد کاظم کا اقتباس نقل کیا ہے جس سے قارئین ''سائنس'' کے موضوعات و مشمولات سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہ اقتباس یہاں پر بھی پیش کیا جا رہا ہے:

> ''سائنس اور ماحولیات سے متعلق ایسے کون سے موضوعات ہیں جن پر یہاں مضامین شامل اشاعت نہیں ہوئے۔ بلکہ روزمرہ میں پیش آنے والی بیماریوں کی وجوہات اور ان کا علاج، ہمارے ماحول کا بدلتا مزاج اور اس کے اثرات، سائنس خبرنامہ، سائنس کوئز، ستاروں کی دنیا، روشنی کی باتیں، روشنی کا جھکاؤ، روشنی کی واپسی، روشنی کی نظر بندی،

زمین کے اسرار، سفیران سائنس، عظیم ایجادات، سمندری حیات، مچھلیوں کی دلچسپ باتیں، جانوروں کی دلچسپ کہانیاں، جانوروں کی عادات و اطوار، بلیک ہول، قرآن اور سائنس، نفسیاتی مسائل ورک شاپ، وزن کے مسائل، ماحول واچ، انسانی حس اور اس کا اظہار، مشینوں کی بغاوت، صفر سے سو تک، علم کیمیا کیا ہے؟ علم نجوم، غذا میں چکنائی، غذا کی اہمیت، ہمارا جسم، طب، ریاضیات، پانی، زراعت، معلومات عامہ، کمپیوٹر، مقناطیسیت، کیا آپ جانتے ہیں؟ کب کیوں اور کیسے؟ سوال و جواب اور اس طرح کے بہت سارے موضوعات اور مسائل پر نہ صرف ایک سے زیادہ مضامین اور اندراجات موجود ہیں بلکہ وقفے وقفے سے ان موضوعات پر سلسلہ وار مضامین شائع ہوتے رہیں گے۔''4

اس اقتباس سے اردو کے عہد ساز ماہ نامہ ''سائنس'' کے مزاج و منہاج کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اِس رسالے کی سائنسی صحافتی خدمات کو تاریخ کے سنہرے پنوں میں مرقوم و محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ اردو میں اس کے علاوہ متعدد ادبی و نیم ادبی رسالے ہیں جن میں بسا اوقات سائنسی مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں آجکل، اردو دنیا، بچوں کی دنیا، امنگ، نیا کھلونا، تعمیر فکر، ذہن جدید وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماہ نامہ ''آجکل'' ایک معیاری اور مستند رسالہ مانا جاتا ہے۔ اس میں سائنسی مضامین کے شائع ہونے کی روایت سے متعلق مشہور سائنسی صحافی محمد خلیل ایک مضمون ''آجکل میں سائنسی ادب'' کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''جب ایک معیاری مشہور رسالہ جو ادبی ہوتے ہوئے سائنسی ادب کو شائع کیا ہے، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ مقبول سائنسی مضامین 1975 سے شائع ہونا شروع ہوئے۔ اس مشہور رسالہ کے بارے میں مجھے سب سے پہلے مرحوم چچا جان (پروفیسر محمد شفیع عالمی شہرت یافتہ جغرافیہ داں) نے

بتایا اور اس میں مجھے سائنس پر لکھنے کی توجہ دلائی۔ اُس زمانہ میں اردو کے کئی
رسالے کھلونا، پیام تعلیم، گل بوٹے کئی اور بچوں کے مشہور رسالے تھے۔
جب کہ 'آجکل'، 'یوجنا'، 'نیا دور'، 'سب رس'، 'کتاب نما'، 'قومی راج' بڑوں
کے لیے تھے۔ لیکن اُن میں کبھی کبھی کوئی مضمون سائنس پر بھی ہوتا تھا۔ اس
طرح سائنس کے مواد کو آجکل اردو نے شروع سے ترجیح دی ہے۔ اسی
زمانہ میں مدیر شہباز صاحب کی ادارت میں اکتوبر۔نومبر 1978 کا خصوصی
شمارہ ''جنگلی جانوروں'' پر شائع ہوا تھا جو رمیش بیدی، ڈاکٹر سالم علی، نند
کشور وکرم، ریحان احمد عباسی اور کئی دوسری شخصیات کے مضامین سے
آراستہ تھا۔ جسے اردو قارئین نے بے حد سراہا تھا۔''[5]

محمد خلیل کے مضمون سے لیا گیا درج بالا اقتباس اس بات کا ثبوت ہے کہ آجکل میں بھی سائنسی مضامین کے اشاعت کی روایت رہی ہے۔ یہ بھی کہ آجکل میں ایک اہم سائنسی موضوع جنگلی جانوروں کے بعنوان خصوصی شمارہ بھی شائع ہوا تھا۔ آجکل کے ڈائمنڈ جوبلی نمبر میں محمد خلیل کا مضمون ''آجکل میں سائنسی ادب'' میں مذکورہ خصوصی شمارے کے تقریباً تمام مضامین کا بے حد عمدگی اور شائستگی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں درجنوں طبی رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں جن کے موضوعات عموماً سائنسی ہی رہتے ہیں نیز جنھوں نے سائنسی فکر و رجحان کو عام کیا۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی کی مرتب کردہ کتاب ''طبِ یونانی اور اردو زبان و ادب'' میں حکیم احتشام الحق قریشی کے مضمون بعنوان ''اردو زبان وادب کے فروغ میں طبی رسائل و جرائد کا حصہ'' سے طبی اردو رسائل و جرائد کا اچھا خاصا علم ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اس مضمون میں بیسویں صدی کے کچھ ایسے رسائل کا تذکرہ کیا ہے جن سے اردو زبان و ادب کو فروغ ملا اور دوسری خاص بات یہ کہ ان رسائل کے سائنسی موضوعات کا تعین بھی اچھی طرح ہوتا ہے۔ جن میں ''معین الاطباء''، ''معین الشفاء''، ''جالینوس''، ''شفاء کاملہ فیض آباد''، ''ہمدرد صحت''، ''ماہنامہ الطبیب''، ماہنامہ مشیر الاطباء''، ''حکیم حاذق''، ''ماہنامہ لقمان''، ''ماہنامہ حکیم دکن''، ''رہنمائے دکن''، ''رسالہ تکمیل الطب''

قابل ذکر ہیں۔اس مضمون میں ان علمی وطبی اور سائنسی جرائد پر اچھا خاصا تجزیہ بھی ملتا ہے۔ جس سے ان رسالوں کی نوعیت کا ادراک ہو جاتا ہے۔اتنا ہی سائنسی صحافت میں منظوم طبی رسائل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جس کثرت سے اردو اخبارات اور رسائل و جرائد میں دیگر علمی وادبی اور سیاسی و سماجی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں یا بحث و مباحثے ہوتے ہیں، برعکس اس کے سائنسی میدان میں فی الوقت تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔سائنس، ٹکنالوجی، انجینئرنگ، ریاضی، کیمیا، خلائی سائنس، نیوکلیرانیرجی، بعض مہلک بیماریوں اور آلودگیوں وغیرہ سے متعلق ہمارے یہاں کتب کی عدم دستیابی پریشانی کا ایک بڑا سبب ہے۔اس لیے ہندوستان کے سائنس دانوں اور سائنسی علوم کے ماہرین کو اس ضمن میں پیش قدمی کرنی چاہیے تاکہ اس شعبے میں موجود خلا کو رفع کیا جا سکے۔راقم الحروف نے اس مضمون میں جن سائنسی رسائل کا نام لیا ہے۔ ان میں بیشتر کی مدتِ اشاعت زیر دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

اردو کی سائنسی صحافت کا اہم اور قابلِ ذکر پڑاؤ برقی صحافت کا ہے۔جس میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن ایک نا قابلِ فراموش کردار ادا کر رہا ہے۔ان دونوں نشریاتی اداروں کے ذریعے مختلف موضوعات پر اردو کے سائنسی پروگرام ٹیلی کاسٹ کیے جاتے ہیں۔جس سے سائنس کی معلومات سماج کے ہر فرد تک بذریعہ ٹی۔وی اور ریڈیو کے مختلف چینلوں اور اسٹیشنوں کی وساطت سے پہنچ جاتی ہے۔ان دونوں کے توسط سے صحت، معاش، زراعت، ٹکنالوجی اور سائنس کے مختلف شعبہ ہائے جات سے متعلق آگہی اور معلومات کی ترسیل عام و خاص دونوں طبقوں تک بہ آسانی ہو جاتی ہے۔مزید ان دونوں مذکورہ نشریاتی اداروں سے ڈاکٹر آن لائن، کرشی درشن، ڈسکوری چینل، ماہرین کے مختلف سائنسی موضوعات پر لکچرز، صحت اور امراج سے متعلق مختلف پروگرامز وغیرہ براڈ کاسٹ کیے جاتے ہیں۔یہ تمام پروگرام اردو میں بھی ہوتے ہیں اور دوسری زبانوں میں بھی۔اس طرح ان تمام کے ذریعے سائنسی پیغامات اور سائنسی جانکاری کی کامیاب ترسیل ممکن ہو پاتی ہے۔

اردو کے جن سائنسی صحافیوں نے سائنسی معلومات کو عام کیا اور اپنی زندگی سائنس

کی تشہیر و تبلیغ میں گزار دی اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے اپنی زندگی وقف کردی ان میں ماسٹر رام چندر، سرسید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، گلزار دہلوی، ڈاکٹر اسلم پرویز، محمد خلیل، منظوالامین، پروفیسر عبدالمعز شمس، ڈاکٹر عبید الرحمان، اسعد فیصل فاروقی، احمد علی برقی اعظمی (سائنسی نظمیں)، انیس الحسن صدیقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

## حوالہ جات

1) بحوالہ :علی گڑھ کے جرائد کا تاریخی اور صحافتی مطالعہ از اسعد فیصل فاروقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، طبع دوم 2017، ص 39۔

2) ایضاً

3) اردو صحافت از مرتب انوار دہلوی، مشمولہ اردو کی سائنسی صحافت از گلزار زتشی دہلوی، اردو اکادمی دہلی، طبع چہارم 2009، ص 285۔

4) بحوالہ: اردو ریسرچ جرنل، جلد 3، شمارہ 10، جنوری تا جون 2017، ص 67۔

5) بحوالہ ماہنامہ آجکل، ڈائمنڈ جوبلی نمبر، جلد 75، شمارہ 12، جولائی 2017، ص 24۔

# کتاب نما اور بعض اہم خصوصی شمارے

بیسویں صدی میں سرزمینِ ہند پر وقتاً فوقتاً سینکڑوں رسائل و جرائد کی اشاعت عمل میں آئی۔ تقسیمِ ہند سے پہلے بالعموم اور آزادی کے بعد بالخصوص رسائل و جرائد کی اشاعت کے عمل میں شدت سے اضافہ دیکھنے کو ملا۔ تقسیم سے قبل جن ادبی جریدوں کے ناموں کی گونج بہت سنائی دیتی تھی ان میں ''مخزن''، ''زمانہ''، ''اردوئے معلیٰ''، ''زبان''، ''عصمت''، ''ہمدرد''، '' الناظر''، '' الہلال''، '' معارف''، ''علی گڑھ میگزین''، ''ہمایوں''، ''اردو''، ''نگار''، ''ادبی دنیا''، ''نیرنگِ خیال''، ''ساقی''، ''شاعر''، ''ادبِ لطیف''، ''شاہکار''، ''سب رس''، ''آجکل''، ''نئی کتاب''، ''افکار''، ''نیا دور'' وغیرہ خاص طور پر نمایاں تھے۔ آزادی کے فوراً بعد منظر عام پر آنے والے ادبی جریدوں میں ''سحر''، ''فانوس''، ''کائنات''، ''چراغِ راہ''، ''سویرا'' وغیرہ وہ رسائل ہیں جنھوں نے ملک کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اپنا تخلیقی سفر بھی جاری کیا اور ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔ 1960 کی دہائی کے بعد ہندوستان میں ادبی رسائل کی اشاعت میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ خاص کر 1960 اور 1970 کی دہائی کے درمیان نہایت کثیر تعداد میں رسائل و جرائد شائع ہوئے۔ جن میں ''کتاب نما''، ''فکر و نظر''، ''شعور''، '' پیامِ تعلیم''، ''نیا شعور''، ''صبح''، ''انیس ادب''، ''شہپر''، ''شاخسار''، ''شب خون''، ''خاتون''، ''تحریر''، ''نگینہ''، ''شجر''، ''ادبیات''، ''گفتگو'' وغیرہ کا شمار ہندوستان کے معروف رسائل میں ہوتا ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان رسائل و جرائد میں اکثر و بیشتر اب موقوف ہو چکے

ہیں۔ لیکن بعض رسائل آج بھی تواتر اور طمطراق کے ساتھ شائع ہوتے ہیں جو خاصے مقبول بھی ہیں۔ ''کتاب نما'' کا شمار معروف رسائل میں ہوتا ہے جو سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رسالہ بن کر اُبھرا ہے۔ ''کتاب نما'' دہلی سے شائع ہونے والا ہندوستان کا ایک اہم اور موقر جریدہ تصور کیا جاتا ہے جو گذشتہ چھیالیس برس سے اردو ادب کے تخلیقی اور تحقیقی و تنقیدی میزان کی عمدہ پہچان بن گیا ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ایک اشاعتی ادارہ ہے جس کی ایک شاخ ممبئی میں بھی ہے۔ یہ ادارہ اشاعت کے ضمن میں سالہا سال سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتا آیا ہے۔ اس ادارے کا قیام 1922 میں عمل میں آیا تھا۔ اب تک اس ادارے کی جانب سے ہزاروں کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں شعر و ادب، تنقید و تحقیق اور تخلیق و ترجمہ وغیرہ ہر موضوع کی مطبوعات شامل ہیں۔ اس ادارے سے 1960 میں ''کتاب نما'' کے نام سے ایک ادبی پرچہ جاری کیا گیا، جس کے مدیر ریحان احمد عباسی تھے۔ مشہور شاعر غلام ربانی تاباں کی زیر سرپرستی اس ادبی مجلّے نے خوب شہرت پائی۔ وہ اس کے مینجنگ ایڈیٹر تھے۔ اس کے سرورق پر ''نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب'' لکھا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ نظریاتی اور اصولی اختلاف کے شور شرابے میں اپنی غیر جانبداری کو محفوظ رکھنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ''کتاب نما'' نے اس سلسلے میں بڑی جگر کاوی کا ثبوت دیا۔ کتابی سائز میں علمی و ادبی مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے عرصۂ دراز سے اردو ادب کی خدمت کرنا ہی اس مجلّے کا شیوہ رہا ہے۔ ابتدا میں یہ رسالہ نئی مطبوعات سے روشناس کرانے کا مقصد لئے ہوئے تھا۔ بعد میں یہ پرچہ کتابوں کی دنیا میں قطب نما بن کر سامنے آیا۔ اس کی بساط برسوں محض کتابوں پر تبصرے تک محدود رہی یا پھر مکتبہ یا دیگر اداروں کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں کے بارے میں اطلاعات کی فراہمی تک۔ مگر بعد میں اس نے ایک باقاعدہ ادبی ماہ نامے کی صورت اختیار کر لی اور اس میں تنقید و تحقیق اور شعر و ادبی تخلیقات جیسے مضامین، گفتگو، خاکے، طنز و مزاح، انشائیہ، شاعری، افسانے، خطوط، یادیں، مانگے کا اجالا اور جائزے وغیرہ عنوانات کے تحت مختلف النوع تحاریر شائع ہوتی رہیں۔ اس کے قلم کاروں میں نئے

ناموں کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق شاعروں، ادیبوں اور ناقدوں کے نام بھی شامل تھے۔ ''کتاب نما'' میں شائع ہونے والے مضامین نے قارئین کے ادبی ذوق کی صرف تسکین ہی نہیں کی، بلکہ تحقیق کے طلبا کے لیے راستہ ہموار کیا اور تنقید کے شعبے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔تنقید نگار ادیب اور تخلیق دونوں کی قد وقامت کا جائزہ لیا۔

اس معیاری مجلّے کو عظیم شاعر، ادیب اور صحافیوں وغیرہ کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اس کے مینجنگ ایڈیٹر شاہد علی خاں، حامد علی خاں اور عملۂ ادارت میں ولی شاہجہان پوری، ظفر ہمایوں ادیب، خالد محمود اور عمران احمد عندلیب وغیرہ شامل رہے۔''کتاب نما'' میں ایک اور خوش گوار تبدیلی اس وقت آئی جب 1987 سے اس میں ''مہمان اداریے'' کا سلسلہ شروع کیا گیا۔اس سلسلے کے تحت بعض نامور ادیبوں کو مہمان مدیر کا اعزاز دیا گیا۔رسالے کو ترتیب دینے کے علاوہ اداریہ کے طور پر ابتدائی مضمون بھی مہمان مدیر ہی تحریر کرتا تھا۔پہلے پہل اداریہ کو ''اشاریہ'' کے عنوان سے تحریر کیا جاتا تھا لیکن اب اداریہ ہی لکھا جاتا ہے۔چند مہمان مدیران میں آلِ احمد سرور، علی سردار جعفری، حامدی کاشمیری، رفعت سروش، آفاق حسین صدیقی، عبدالقوی دسنوی، خلیق انجم، ظہیر احمد صدیقی، وارث علوی، عبدالمغنی، صغریٰ مہدی، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی وغیرہ شخصیات بھی شامل تھیں۔مہمان مدیران کی تصویریں بھی متعلقہ پرچوں کے سرورق کی زینت بنی۔

''کتاب نما'' رسالہ'' آجکل''،'' نقوش''، ''نگار''، ''سب رس''،'' علی گڑھ میگزین''،''ایوانِ اردو''،''شیرازہ'' وغیرہ کی راہ پر چلتے ہوئے خصوصی شماروں میں ان سے بھی آگے نکل گیا ہے۔''کتاب نما'' کے خصوصی شمارے دیگر رسالوں کی بہ نسبت اس لحاظ سے قدرے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کو صرف رسالے تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے انھیں الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا ہے۔اس کے برعکس اگر قاری باقی رسالوں کے کسی مخصوص شمارے کو حاصل کرنا چاہے تو اسے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے کیونکہ اوّل تو کسی بھی رسالے کی پوری فائلیں ایک جگہ مل پانا بہت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔دوّم یہ کہ اگر شمارہ مل بھی جاتا ہے تو نہایت ہی بوسیدہ حالت میں۔جس کی فوٹو

کاپی کرنا تک محال ہوتا ہے۔اس لحاظ سے ''کتاب نما'' کو بڑی فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ مکتبہ جامعہ نے اس رسالے کے تمام خصوصی شماروں کو جو بوسیدہ حالت میں تھے ساتھ ہی نایاب بھی ہو چکے تھے،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے ازسرِ نو شائع کیا۔

''کتاب نما'' میں اب تک پچاس سے زائد خصوصی شمارے شائع کیے گئے ہیں۔ ماہ نامہ'' آجکل'' کے بعد'' کتاب نما'' کو ہندوستان میں دیگر رسالوں کے اعداد وشمار کے مطابق سب سے زیادہ خصوصی شمارے شائع کرنے کااعزاز حاصل ہے۔اس کے شائع شدہ خصوصی شماروں میں نئی نظم نمبر، یادگار جوش ملسیانی نمبر، سلامت علی دبیر نمبر، محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی نمبر، عرش ملسیانی نمبر، پریم چند نمبر، سید عابد حسین نمبر، لغت نویسی کے مسائل نمبر، محمود احمد ہنر نمبر، اجمل اجملی نمبر، آل احمد سرور نمبر، خلیق انجم نمبر، فرمان فتح پوری نمبر، اختر سید خاں نمبر، نثار احمد فاروقی نمبر، عابد علی خاں نمبر، خواجہ احمد فاروقی نمبر، اردو افسانہ ممبئی میں 1970 کے بعد، مغیث الدین فریدی نمبر، صالحہ عابد حسین نمبر، محبوب حسین جگر نمبر، علی سردار جعفری نمبر، حامدی کاشمیری نمبر، جمنا داس اختر نمبر، ابوسلمان شاہجہانپوری نمبر، رشید حسن خان نمبر، حنیف ترین نمبر، خواجہ حسن نظامی نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، شاد عظیم آبادی نمبر، صوفیا کا بھگتی راگ نمبر، شمس الرحمٰن فاروقی نمبر، ابوالکلام قاسمی نمبر، مشفق خواجہ نمبر، عبدالستار دلوی نمبر، مجتبیٰ حسین نمبر، غلام ربانی تاباں نمبر، جگن ناتھ آزاد نمبر، عبداللطیف اعظمی نمبر، عبدالوحید صدیقی نمبر، شاد عارفی نمبر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

سطور بالا میں رسالہ'' کتاب نما'' میں شائع شدہ خصوصی شماروں میں اردو کی جن باوقار شخصیات پر زیر نظر مضمون میں ذکر کرنا مقصود ہے۔ان میں ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر اجمل اجملی اور خواجہ احمد فاروقی، شاد عارفی شامل ہیں۔یہ سبھی شخصیات اردو زبان وادب کے مختلف شعبۂ ہائے جات میں کارہائے نمایاں انجام دے چکے ہیں۔

''ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر'' ماہ نامہ'کتاب نما' کی ایک اہم اور کارآمد پیش کش ہے۔ کرنل بشیر حسین زیدی کی نگرانی میں مہمان ایڈیٹر ڈاکٹر صغرا مہدی نے صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر

شمیم حنفی اور ولی شاہجہانپوری جیسے صلاح کاروں کے تعاون سے اس خصوصی نمبر کو پورے خلوص اور انہاک کے ساتھ ترتیب و تزئین سے خوبصورت بنادیا ہے۔اس وقت ''کتاب نما'' کے مینجنگ ایڈیٹر ڈاکٹر شاہد علی خاں تھے۔یہ نمبر 8 راگست 1981 کو شائع ہوا تھا اور اس کے بعد اسی سال نومبر 1981 میں اس کو کتابی صورت میں الگ سے شائع کیا گیا تا کہ ادب کے ہر قاری تک اس کی رسائی ممکن ہو سکے۔اس خاص نمبر میں ڈاکٹر سید عابد حسین پر 15 مشاہیرِ ادب کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔چونکہ یہ رسالہ مکتبہ جامعہ سے شائع ہوتا ہے اور موصوف اس ادارے سے کافی عرصے تک منسلک رہے تھے۔مکتبہ جامعہ 1922 میں قائم ہو چکا تھا اور عابد صاحب کا براہِ راست تعلق مکتبے سے 1926 میں شروع ہوا۔اس طرح مکتبہ جامعہ کا عابد صاحب سے براہِ راست کا رشتہ رہا ہے۔بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مکتبہ جامعہ کے قیام کے سلسلے میں عابد صاحب نے اہم رول ادا کیا۔1947 کے دگرگوں حالات کے سبب مکتبہ جامعہ کو بھی زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔تب عابد صاحب کے مشوروں اور مساعی نے مکتبے کو ایک نئی لمیٹڈ کمپنی کی شکل عطا کرنے میں غیر معمولی رول ادا کیا۔آپ اُس وقت کے اوّلین ڈائریکٹروں میں شامل تھے اور مکتبے کے اشاعتی منصوبوں نیز علمی اور تعلیمی مقاصد کا بہت وسیع شعور رکھتے تھے۔حامد علی خاں، غلام ربانی تاباں اور شاہد علی خاں مکتبہ جامعہ کے اشاعتی و دیگر سرگرمیوں کے حوالے سے عابد صاحب سے ہمیشہ مشورہ لیتے رہے۔موصوف اپنی زندگی کے آخری وقت تک جو کہ باون برسوں پر محیط ہے متواتر مکتبہ جامعہ کے ساتھ ذہنی اور جذباتی وابستگی قائم رکھی۔اس ادارے سے شائع ہونے والے دونوں ماہ ناموں ''کتاب نما'' اور ''پیامِ تعلیم'' کے ساتھ ان کا رشتہ ہمیشہ استوار رہا۔جامعہ ملیہ اسلامیہ سے عابد صاحب کا جو رشتہ تھا وہ جامعہ ملیہ کی نا قابلِ فراموش تاریخ کا ایک شان دار باب ہے۔جس سے سب ہی واقف ہیں۔لیکن اس کا علم کم ہی لوگوں کو ہوگا کہ مکتبہ جامعہ سے بھی انھیں گہرا تعلق تھا جو جامعہ ملیہ سے ان کی وابستگی سے کم نہیں تھا۔مکتبے نے اپنے ادبی ترجمان ''کتاب نما'' کا ''ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر'' شائع کر کے حق شناسی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین اردو کے ان بزرگ مصنفین میں تھے جن کی ادبی و علمی خدمات

کا دائرہ تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ ادبی مسائل پر لکھنے کے علاوہ انھوں نے قومی وملّی مسائل پر جس استدلال سے اظہار خیال کیا ہے اس کی مثال اردو میں کم ہی ملتی ہے۔ تعلیمی مسائل پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی اور ذاتی زندگی میں بھی وہ بلند کردار، بلند اخلاق اور حسنِ سلوک کی اعلیٰ قدروں کے مالک رہے۔ اس شمارے میں ان تمام موضوعات کا احاطہ غیر جانبداری سے کیا گیا ہے۔

''کتاب نما'' کے اس خصوصی نمبر میں عابد صاحب کے دیرینہ رفیقوں، نئے ہم سفروں اور جدید نیاز مندوں کے علاوہ ان کے شاگردوں کے مضامین بھی نظر آتے ہیں۔ کرنل بشیر حسین زیدی کے ''عرض حال'' تحریر کرنے کے بعد پہلا مضمون پروفیسر محمد مجیب نے ''عابد صاحب: چند یادیں'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ مضمون نگار کی ملاقات عابد صاحب سے یورپ میں طالب علمی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ یورپ میں ہندوستان واپس آنے تک مسلسل جاری رہا۔ جہاں دونوں ایک دوسرے کے رفیق رہے اور پھر زندگی کے آخری لمحے تک ان کا رشتہ اٹوٹ رہا۔ مجیب صاحب نے صرف قیام یورپ ہی کے زمانے کی یادیں قلم بند کی ہیں جو اس اعتبار سے اہم اور قابلِ قدر ہیں کہ ان کی وساطت سے عابد صاحب کے ابتدائی دور کی اس انسان دوستی اور مرنجا مرنجی کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ جو اُن کی شخصیت کا طرۂ امتیاز تھی۔ چونکہ دونوں کی علمی، ادبی، اصلاحی اور تعمیری جدوجہد کا سفر ہندوستان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی جاری وساری رہا۔ جس کا مذکورہ مضمون میں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ عبدالسلام قدوائی ندوی نے ''ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم'' کے عنوان سے دوسرا مضمون تحریر فرمایا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں عابد صاحب کے تئیں اپنی عقیدت اور ان کی شفقت کا والہانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔ عابد صاحب کی تحریری خوبیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''وہ محض مترجم نہ تھے، بلکہ انھوں نے بہت سی کتابیں خود بھی لکھی ہیں۔ ان کی تحریر میں زبان کی صحت وشستگی، روانی وبرجستگی اور لطافت وحلاوت کے ساتھ زورِ بیان اور قوتِ استدلال بھی بہت ہے۔ وہ معلم بھی رہے ہیں،

اس لئے ان کے اندر تفہیم کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ وہ اپنی بات کو دل میں اُتارنے اور ذہن نشین کرنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں۔ زبان پر ایسی قدرت ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو عام فہم بنا دیتے ہیں، مگر عامیانہ انداز کو پاس نہیں آنے دیتے۔ ان کی سلاست رکاکت سے پاک ہوتی ہے اور لطفِ بیان کہیں سے کلام کے وزن اور وقار کو گرنے نہیں دیتا بلکہ دل آویزی میں اضافہ کر دیتا ہے۔"

(ڈاکٹر عابد حسین نمبر، کتاب نما، نومبر 1981، ص11)

عبدالسلام قدوائی نے اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب اور حکیم اجمل خاں کے ساتھ عابد صاحب کے تعلقات، ان کے ذاتی صفات اور ان کے ادبی اور سیاسی افعال کا خوب جائزہ لیا ہے اور مذکورہ شخصیات کی روشنی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ پر ہلکی پھلکی روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون میں عابد صاحب کی اپنے دوستوں، رفیقوں، قرابت داروں اور اہلِ خانہ کے ساتھ لی گئی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ عابد صاحب ملک و ملّت کی خدمت سے کبھی غافل نہیں رہے بلکہ اس کی بقا کے لیے اپنا تن، من اور دھن سب کچھ مصرف کر دیا تھا۔ زبان و قلم کے ذریعے تو عمر بھر اصلاحِ حال کی تدبیر کرتے رہے۔ اپنی تصنیفات و تراجم اور رسائل "جامعہ"، "نئی روشنی"، "اسلام اور عصر جدید" اور انگریزی میں "اسلام اینڈ موڈرن ایج" کے ذریعے انھوں نے باشندگانِ ملک اور ابنائے ملّت کے ذہن کی تعمیر اور خیالات کی اصلاح کے لیے بڑا کام کیا۔ اس مضمون میں موصوف کی پیدائش سے وفات تک سرسری طور پر پوری سوانحی کوائف سے روشناس کرایا گیا ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی اپنے مضمون "مرحوم عابد صاحب (1896-1978)" میں ان کی ادبی خدمات اور ذاتی صفات کو تحسین آمیز الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں کہ عابد صاحب اپنی تقریر اور تحریر میں دہراتے رہے کہ ملک و ملّت کی سچی خدمت یہ ہے کہ نوجوانوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ ان میں خوداعتمادی اور خودداری پیدا ہو اور وہ اُن اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامی اور مبلغ بن جائیں جنھیں حکمائے حق،

صداقت، حسن اور عدل سے تعبیر کیا جائے اور جنھیں انبیاء علیہم الصلواۃ والسلام نے ''خیر کثیر'' کہا ہے۔ مراز ادیب کا مضمون ''ایک صاحبِ بصیرت اور صاحبِ کردار شخصیت'' مختصر ہونے کے باوجود اہم ہے۔ چونکہ عابد حسین نے گوئٹے کے مشہور ڈرامے فاؤسٹ کا اردو ترجمہ کیا تھا جس کی انفرادیت اور افادیت یہاں پر واضح کی گئی ہے۔ معین الدین حارث کا مضمون ذاتی تاثرات پر مشتمل ہے جس میں جامعیہ ملیہ اسلامیہ سے عابد صاحب کے تعلقات کو بیان کیا گیا ہے۔ ''اسلام اور عصرِ جدید کے اداریے'' کے عنوان سے پروفیسر مشیر الحسن نے معلوماتی اور بھرپور مضمون لکھا ہے۔ جس میں عابد صاحب کے ذہن و فکر کے بہت سے گوشے نمایاں ہوئے ہیں۔ اس رسالے میں مشیر الحسن، عابد صاحب کے معاون بھی رہے ہیں۔ انور صدیقی کا مضمون ''نثر کا عارف'' بھی ایک پُر مغز اور فکر انگیز مقالہ ہے جس میں صنفِ نثر پر عابد صاحب کی دسترس کے ثبوت پیش کیے گئے ہیں۔ موصوف اردو نثر کو شعری اظہار کے وسائل اور مزاج سے آزاد کرانے کی چاہت رکھتے تھے اور اس کے شعوری جدوجہد کی بیداری پر زور دیتے رہے ہے۔ نثر میں اسلوبِ نگارش میں ان کی بیشتر خوبیوں کا اس مضمون میں ذکر کیا گیا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے مختصر سا تاثراتی نوعیت کا مضمون بعنوان ''ڈاکٹر عابد حسین مرحوم۔ ایک اور انسان مرگیا'' تحریر کیا ہے۔ ''عابد صاحب کی یاد میں'' ڈاکٹر شمیم حنفی کا مضمون عالمانہ ہے اور انھوں نے عابد صاحب کے مخصوص اندازِ فکر و عمل کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس خاص نمبر میں سید عابد حسین کی رفیق زندگی صالحہ عابد حسین کا مضمون ''دِگر دانائے راز آید کہ ناید'' شامل ہے۔ موصوفہ نے اس مضمون نے عابد صاحب کی زندگی کے آخری دور کی تصویر کھینچی ہے۔ ''ڈاکٹر عابد حسین بحیثیت طنز و مزاح نگار'' ڈاکٹر مظفر حنفی کا ایک مبسوط مقالہ ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں عابد صاحب کے مضامین میں طنز و مزاحیہ عناصر کا بڑی عرق ریزی سے جائزہ لیا ہے اور طنز و مزاح سے متعلق ان کے مخصوص نظریے کی بھی نشاندہی کی ہے۔ احمد علی علوی کا مضمون ''استاذی ڈاکٹر سید عابد حسین'' بھی تاثراتی نوعیت پر ہی مبنی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر صغریٰ مہدی اپنے مضمون ''توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا''

میں خود اپنے ہی الفاظ میں عابد صاحب کی رحلت پر آئے ان کے رشتہ داروں، عزیزوں، شاگردوں، عقیدت مندوں اور چاہنے والوں کے خطوط کا ایک ایسا انتخاب پیش کیا ہے جس سے عابد صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کی کچھ اہم جھلکیاں سامنے آسکیں۔ حیات لکھنوی اور سیدہ فرحت نے اپنی نظموں بالترتیب ''ڈاکٹر سید عابد حسین'' اور اشکِ عقیدت'' میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس خاص نمبر کے آخر میں عابد صاحب کی طالب علمی کی کچھ تخلیقات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جن میں ان کے خطوط اور بعض اہم مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ اس خصوصی اشاعت میں جو کمیاں راہ پا گئی ہیں وہ یہ کہ صرف دو ایک مضامین کو چھوڑ کر باقی سب کے سب تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ جب کہ عابد صاحب کی علمی، ادبی، تعلیمی اور قومی و ملی خدمات کا دائرہ محدود نہیں بلکہ بہت وسیع اور متنوع ہے، جس کے حوالے سے بات ہونا ضروری تھی۔ جیسے ان کی حیات پر بھر پور مضمون تحریر کیا جانا چاہیے تھا۔ ان کے رسائل پر ایک نظر ڈالنی چاہیے تھی وغیرہ۔ الغرض عابد صاحب پر ''کتاب نما'' میں شائع کیا گیا یہ خصوصی نمبر ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ اب یہ نمبر خصوصی دستاویز کی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

ماہ نامہ ''کتاب نما'' نے 1992 میں ڈاکٹر اجمل اجملی پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا۔ جس کو بعد میں اسی سال نومبر 1992 میں کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ اس خاص نمبر کے مہمان ایڈیٹر علی احمد فاطمی تھے جس میں ان کے معاون محترمہ عذرا نقوی تھیں۔ جب کہ اس خصوصی شمارے کے ایڈیٹر بھی شاہد علی خاں ہی تھے۔ جب مذکورہ شمارہ شائع کیا گیا تب اجمل اجملی بسترِ علالت پر تھے اور شب و روز کے لمحات موت و زیست کی کشمکش میں گزار رہے تھے۔ شاہد علی خاں نے اپنے زیر سرپرستی رسالے میں کئی ادبا کی خدمات کو نمایاں کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ اردو ادب میں اجمل اجملی کی اصل پہچان شاعری کی وجہ سے ہے۔ اگر چہ ان کی تخلیقی اور فنی مہارت دیگر اصنافِ سخن میں بھی ہے۔ لیکن شاعری ان کے پورے فن کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے زندگی بھر ترقی پسندی کی حمایت کی اور اس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کا پورا تخلیقی سرمایہ ترقی پسند تحریک کا مظہر ہے۔ مرتبہ خصوصی شمارہ علی احمد فاطمی اداریہ میں لکھتے ہیں کہ:

"وہ ایک عالی قسم کے ترقی پسند مفکّر اور ساتھ ہی تحریک کے اتنے بڑے مجاہد اور سپاہی ہیں کہ ان کو شاعر کم انجمن ترقی پسند مصنفین کا سرگرم رُکن اور متشدد ترقی پسند دانشور زیادہ سمجھا گیا۔"

انھوں نے اداریہ میں اجمل اجملی کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی، ان کی شاعری میں ترقی پسند عناصر کی نمائش و افزائش اور اس کے خصوصی اوصاف سے متعارف کرانے کی اچھی کوشش کی ہے۔ اس نمبر کے آغاز میں اجمل اجملی کی سوانحی کوائف کا مختصر ساخاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جس سے محسوس ہوتا ہے کہ موصوف اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ ایک کامیاب صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین استاد بھی تھے۔ انھوں نے کئی ممالک کا سفر کیا، انعام و اکرامات سے نوازے گئے، شاعری، ترجمہ اور صحافت میں بھی انھیں فنی استعداد حاصل تھی۔ پروفیسر عنوان چشتی "کتاب نما" کے "اجمل اجملی نمبر" میں ان کی شخصیت پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

"اجمل اجملی اردو کے اُن جیالے فن کاروں میں شامل ہیں۔ جنھوں نے واقعی زندگی اور ادب کی خدمت میں اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ صرف کردیا ہے۔ ان کے کارنامے ترجمے، صحافت اور شاعری پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ انھوں نے ہر جگہ اپنی بصیرت کا ثبوت مہیا کیا ہے، لیکن "شاعری" میں ان کا تخلیقی جوہر کِھلتا اور کُھلتا ہوا نظر آتا ہے۔"

(کتاب نما، مارچ 1993، ص 65)

اس خصوصی نمبر کے مشمولات میں کل پندرہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اکثر مضامین تاثراتی نوعیت کے ہیں اور کچھ میں موصوف کے فکر و فن پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ پہلا مضمون غلام ربانی تاباں کا "ڈاکٹر اجمل اجملی" تحریر کردہ ہے۔ جس میں انھوں نے اجمل اجملی سے اپنے تعلقات اور ان کی نظم ونثر پر ہلکی پھلکی روشنی ڈالی ہے۔ بھیشم ساہنی کا مضمون "اجملی میرے دوست میرے رفیق" میں مضمون نگار نے اجمل اجملی سے اپنے دوستانہ اور ادبی مراسم کے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے موصوف کی زندگی کے حالات و واقعات، روزگار و معاش اور غیر موزوں طبیعت کے بارے میں سرسری طور پر

تذکرہ کیا ہے۔ پروفیسر سید محمد عقیل کا لکھا ہوا مضمون ''سفرزاد۔ایک تجزیہ'' اور ڈاکٹر صغرا مہدی کا مضمون ''سفر زاد۔ایک جائزہ'' دونوں قابلِ مطالعہ ہیں۔اول الذکر مضمون میں اجمل اجملی کے شعری موضوعات کے علاوہ نظموں اور غزلوں کا بڑی جاذبیت سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر موصوف ان کی شاعری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''اجمل اجملی کے اس مجموعے میں ترقی پسند دورِ شاعری کی تقریباً تمام خوبیاں موجود ہیں۔ رومانیت اور اس کی تلخیاں، فکر میں خارجی اظہاریت، عزم اور آہنگِ انقلاب، سماجی ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد اور پھر صبح کا انتظار جس میں انسانوں کی دنیا بدلے گی اور ان صورتوں کے اظہار کے لئے نظم کا سانچہ۔ میرا خیال ہے کہ اجمل کی شاعری کی یہی محبوب صورتیں ہیں۔ان کی شعری کیفیات کو بلندی ان کی نظموں سے ہی ملتی ہے۔''
>
> (ڈاکٹر اجمل اجملی نمبر، کتاب نما، نومبر 1992، ص18)

متذکرہ بالا مضمون کے علاوہ صغرا مہدی نے بھی اپنے مضمون میں انھیں بنیادی طور پر نظم کا شاعر قرار دیا ہے۔ دونوں مضامین میں اجمل اجملی کی مسلسل نظم ''بازگشت'' پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''اجمل اجملی: اک شعلہ آ گہی'' میں قمر رئیس نے موصوف شاعر کے فکرمند ذہن، سادگی و صفائی، درویشانہ و صوفیانہ اطوار، دانشمندی و اخلاص مندی اور تخلیقی وجدان پر مدلل تبصرہ کیا ہے۔ مزید ان کے تراجم کی خوبیوں اور نظموں و غزلوں پر اپنی ناقدانہ اور بصیرت افروز آرا بھی پیش کی ہے۔

اجمل اجملی کی متعالی اور متصف شخصیت کا خاکہ عبداللہ ولی بخش قادری نے مضمون ''اجمل اجملی: توفیقِ اضطراب کو ایماں بنا دیا'' میں کھینچا ہے۔ ''اجمل اجملی: چند تاثرات'' کے بعنوان علی احمد فاطمی کا اس خصوصی نمبر میں سب سے مبسوط اور بلیغ مضمون ہے۔ جس میں اجمل اجملی کے خاندانی پس منظر، دورانِ طالب علمی کا زمانہ، اساتذہ، ان کی شعری فکر انگیزی، انسان اور وطن دوستی، ادبی انجمنوں، کالج کی تنظیموں اور ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی، سجاد ظہیر کے ساتھ مل کر صحافتی سرگرمیوں میں ان کی شمولیت، ان کے افتادِ طبع خیالات اور ان

کی شعری وفکری عظمت کو بیان کرتا یہ مضمون دلچسپی کا موجب ہے۔سراج اجملی نے ان کی غزل گوئی پر لکھا ہے،تو وہیں خود موصوف نے ''میری شاعری'' کے عنوان سے مضمون قلم بند کیا ہے۔جس میں انھوں نے ایمانداری، بے باکی اور منصفانہ انداز میں اپنی شاعری کے حوالے سے قارئین کو کئی گونا گوں پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے۔اس نمبر کے دیگر مضمون نگاروں میں جوگندر پال، ڈاکٹر جاوید اشرف، عذرا نقوی بھی شامل ہیں۔آخر میں ڈاکٹر اجمل اجملی سے علی احمد فاطمی کی گفتگو کے علاوہ ان کی نظموں اور غزلوں کے انتخاب کو بھی شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

فروری 1993 میں ''کتاب نما'' میں ''خواجہ احمد فاروقی نمبر'' کی اشاعت عمل میں لائی گئی۔خواجہ صاحب اس وقت بقیدِ حیات تھے،جب اس خصوصی نمبر کا اہتمام کیا گیا۔اس نمبر کو بعد میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی کے اشتراک سے بھی 2011 میں نہایت ہی آرائش وزیبائش کے ساتھ دوبارہ شائع کیا گیا۔اس خصوصی شمارے کے مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ہیں۔جب کہ مکتبہ جامعہ کے اس وقت کے مینیجنگ ڈائریکٹر خالد محمود تھے۔اس خصوصی نمبر میں خواجہ احمد فاروقی کی شخصیت اور فکروفن پر اردو زبان کی ممتاز اور معروف ترین شخصیات نے جو کہ ان کے معاصرین بھی رہے ہیں، مبسوط اور بلیغ مضامین رقم کر کے خواجہ صاحب کو گلہائے عقیدت پیش کیا ہے۔خواجہ احمد فاروقی ایک اعلیٰ پایہ کے محقق، نقاد، خاکہ نگار،صفِ اول کے انشا پرداز اور مکتوب نگار تھے۔میر تقی میر پر اردو میں پہلا باقاعدہ تحقیقی مقالہ انہی کا لکھا ہوا ہے،جس کے بعد میر شناسی کی روایت نے طول پکڑ لیا۔غالب کی فارسی کتاب ''دستنبو'' کی پیچیدہ نثر کا انگریزی میں فاروقی صاحب نے ہی بہت شاندار ترجمہ کیا۔ وہ اعلیٰ درجے کے منتظم اور اردو تحریک کے علمبردار تھے۔پروفیسر امیر عارفی سابق صدر، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی اردو کی بقا کے تئیں ان کی کاوشات کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

> ''جب اردو کے خلاف تیز وتند آندھیاں چل رہی تھیں اور اردو کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا تو فاروقی صاحب نے دہلی یونی ورسٹی میں اردو کی بقا کے لئے ایک ننھا سا دیا روشن کیا،جس نے ان کے خلوص،لگن اور غیر

معمولی جدوجہد سے بہت جلد مہر نیم روز کی شکل اختیار کر لی۔"

(بیسویں صدی کی ممتاز شخصیت: خواجہ احمد فاروقی، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند،

نئی دہلی، 2000، ص9)

ایک وقت تھا جب پوری اُردو دنیا میں دو تین ہی نام گونجتے تھے۔ ان میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا نام بھی شامل تھا اور دانش گاہوں کی دنیا میں تو یہ نام سرفہرست تھا۔ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیے ان کی خدمات اور کاوشات کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ پہلے اس یونی ورسٹی میں اردو، فارسی اور عربی کا مشترکہ شعبہ تھا، بعد میں اُردو کو الگ شعبے کی حیثیت دلانے میں انھوں نے بھرپور رول ادا کیا۔ پیلیو گرافی (مخطوطہ شناسی) کا ایک سالہ کورس انھوں نے ہی شروع کیا تھا اور آج بھی ہندوپاک میں صرف اسی شعبے کو یہ فخر حاصل ہے۔ متنی تنقید پر پہلی باضابطہ، باقاعدہ اور معتبر کتاب لکھنے کی تحریک خلیق انجم میں خواجہ صاحب نے ہی پیدا کی تھی۔ اس کے علاوہ تحقیقی، طباعت اور ترجمے کے کاموں کی ابتدا، رسالہ اردوئے معلیٰ کا اجرا، عظیم الشان سیمیناروں، کانفرنسوں، پُروقار تقریبوں کا انعقاد ان کی زیر سرپرستی میں عروج پر تھا۔ دہلی یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو واحد شعبہ ہے جس کے سیمیناروں میں اس وقت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے شرکت کی۔ "خواجہ احمد فاروقی نمبر" مرتبہ از ڈاکٹر خلیق انجم "کتاب نما" کے اداریے میں ایسی بہت سی باتوں کا نہایت ہی عمیق انداز میں تذکرہ کرتے ہیں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے خواجہ احمد فاروقی پر ماہ نامہ "ادبی دنیا" میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون "اردو کے خواجہ: خواجہ احمد فاروقی" میں ان کی شخصیت کے متعلق یوں تحریر کیا ہے:

> "خواجہ کے لفظی معنی خداوند، صاحب، مالک، آقا، سردار کے ہوتے ہیں۔
> غور کیجیے تو خواجہ احمد فاروقی کی 'خواجگی' ان کی حیات میں اور مرنے کے بعد
> بھی باقی ہے۔ لیکن ان کو یہ مقام یا مرتبہ اس لئے نہیں ملا کہ وہ کسی متمول
> خاندان میں پیدا ہوئے تھے یا پوتڑوں کے رئیس تھے بلکہ انھوں نے اپنی
> قوم، زبان اور ادب کے لئے ایسے پائیدار اور مستحکم کام کیے جنھیں 'صدقہ

جاریہ' کی حیثیت حاصل ہے جن سے تادور آفتاب ان کا نام زندہ رہے گا۔"

(ماہ نامہ ادبی دنیا، نئی دہلی، جلد 1، شمارہ 2، ص 6)

اسی مضمون میں پروفیسر ارتضیٰ کریم ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"خواجہ احمد فاروقی عملی انسان بھی تھے اور علمی وقار کے حامل بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اگر ایک طرف اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے ٹھوس کام بھی کیے تو دوسری جانب کئی یادگار تصنیفات اور تالیفات، مضامین اور دیگر تحریریں بھی دیں۔"

اس خصوصی نمبر میں کل پندرہ مشاہیرِ ادب کے مضامین شامل ہیں۔ اداریہ کے بعد خواجہ صاحب کے سوانحی کوائف کا اندراج کیا گیا ہے۔ جس میں ان کی پیدائش، تعلیم (اردو، انگریزی، عربی، فارسی میں ایم۔ اے، بعد میں اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی)، درجنوں تصنیفات وتالیفات جیسے "مرزا شوق لکھنوی"، "کلاسیکی ادب"، "مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا"، "ذوق و جستجو"، "نئی شاعری"، "چراغِ راہ گذر" وغیرہ۔ مخطوطات کی ترتیب و تدوین میں "تذکرۂ سرور یا عمدۂ منتخبہ"، "کربل کتھا: فضلی کی قدیم نثر"، "گنج خوبی"، "دیوان بقا"، "دیوان میر" وغیرہ۔ کتابوں کے لیے خاص ابواب، انعام و اکرام، درجنوں بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت، خصوصی اور توسیعی خطبات، درجنوں علمی و ادبی انجمنوں سے تعلق، علمی اسفار، تحقیقی اور تنقیدی مقالے جو ان کے متعلق لکھے گئے وغیرہ کا اس میں مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کو پروفیسر ایمی ری ٹس بھی بنایا گیا۔ موصوف اپنی زندگی میں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ہندوستانی ادب کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے انھوں نے کئی بیرونی ممالک ماسکو، تاشقند، فرانس، مغربی جرمنی وغیرہ کا سفر کیا۔

"خواجہ احمد فاروقی نمبر" کا پہلا مضمون پروفیسر خلیق احمد نظامی کا بعنوان "خواجہ احمد فاروقی" ہے۔ خواجہ صاحب ان کے معاصرین میں بھی شامل تھے اور ان سے بہت قربت بھی رکھتے تھے۔ خلیق احمد نظامی نے ان کے بچپن، ان کی طالب علمی کے دور کا ذکر، ان کی تعلیمی قابلیت، ذہنی اور علمی ذکاوت، تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت، خیالات اور فکر و احساسات

وغیرہ سے خوش اسلوبی سے روشناس کرایا ہے۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

"خواجہ صاحب ماضی کے سرمایے کے قدردان اور حال کے صحت مند رجحانات کے ہمدرد ہیں۔ ان کی آنکھوں میں حال کا عزم اور مستقبل کا نور ہے۔ جو لوگ ماضی سے خفا اور حال سے بیزار ہیں۔ ان کے لیے خواجہ صاحب کی تنقید صبح عید کی نوید ہے۔"

(خواجہ احمد فاروقی نمبر، کتاب نما، فروری 1993، ص 16)

پروفیسر خلیق صاحب کا مضمون مختصر لیکن بے حد مفید اور کارآمد اور ہے۔ جس میں انھوں نے خواجہ صاحب کی تعمیری کاموں کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ دوسرا مضمون "شائستگی کے ڈھانچے میں ڈھلا انسان" سید حامد کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں بھی خواجہ صاحب کی بحیثیت ایک منتظم، ایک ادیب اور ایک استاد کے ان کی خدمات اور کاوشات کا ذکر ملتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن کا مضمون "اردو خواجہ" معنی آفرین مضمون ہے۔ جس سے خواجہ صاحب سے متعلق بہت سی نجی باتوں کا علم ہوتا ہے۔ انھوں نے خواجہ صاحب سے دوسرے دوستوں کے توسط سے ملاقاتیں اور کبھی براہِ راست ہوئی ملاقاتوں کا ذکر، دلی کالج سے اپنی وابستگی، ان کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں کا منظر نامہ، ان کے اسلوب، ان کی برگ و بار شخصیت کا حوالہ، ان کے حیرت انگیز تجربات، ان کی وسیع النظری اور کشادہ دلی اور اردو کے فروغ کے تئیں ان کی جدوجہد وغیرہ کے متعلق اثر انگیز تحریر مرقوم کی ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے مضمون کا ایک اقتباس خواجہ صاحب کے آفاقی نظریے کو سمجھنے میں ہماری بھرپور رہنمائی کرتا ہے:

"خواجہ صاحب کے یوں تو بہت سے کارنامے ہیں لیکن سب سے بڑا اور سب سے اہم کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے اوّل تو 1947 کے بعد کی خون آشام دہلی میں اردو کے برگ و بار پھر سے لگائے اور انھیں پروان چڑھایا اور دوسرے انھوں نے اردو کو عالمی پیمانے پر دیکھنے دکھانے کی کوشش کی اور اسے عالمی سیاق سباق اور آفاقی نظر بخشی اور یہ کام جس طرح ان سے سرانجام پایا اور کسی سے نہیں ہوسکا۔" ("خواجہ احمد فاروقی نمبر"، کتاب نما، فروری 1993، ص 27)

''خواجہ احمد فاروقی نمبر'' نمبر کا اگلا مضمون ''یادنامہ: ایک مطالعہ، ایک تجزیہ'' پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ خواجہ صاحب کے ساتھ دلّی کالج کے ابتدائی اساتذہ میں ان کا نام سرفہرست آتا ہے اور ان کے پہلو بہ پہلو شعبے کے کاموں میں مصروفیت اور مشغولیت کا شرف بھی انھیں حاصل ہے۔ اپنے معاصرین میں خواجہ صاحب کی اس قدر قربت شاید ہی کسی دوسرے استاد سے رہی ہو، جتنی کہ ظہیر صاحب کے ساتھ تھی، موصوف انھیں بہت عزیز تھے۔ خواجہ صاحب مہمان پروفیسر کی حیثیت سے بدیش گئے تو صدر شعبے کی بھاگ ڈور انہی کے ہاتھوں میں تھی۔ انھوں نے خواجہ صاحب پر ایک قابلِ تعریف خاکہ قلم بند کیا ہے جو ان کتاب ''فکری زاویے'' میں بھی شامل ہے۔ قومی کونسل کے ماہ نامہ رسالہ ''اردو دنیا'' کے دسمبر 2015 شمارے میں خواجہ صاحب کو یاد کرتے ہوئے اس خاکے کو دوبارہ شائع کیا گیا۔ زیرِ نظر مضمون میں انھوں نے خواجہ صاحب کے خاکوں پر مشتمل کتاب ''یادِ یارِ مہرباں'' کا بہترین مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصے بعنوان ''یادنامہ'' میں سترہ مرحومین کے خاکے لکھے گئے ہیں۔ ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مضمون کے آغاز میں صنفِ خاکہ کے اوصاف پر روشنی ڈالی ہے اور بعد میں خاکہ نگار کے فن اور اسلوب کے ذیل میں آنے والی جابجا خوبیوں پر اپنی مدلل آرا سے مستفید فرمایا ہے۔ چونکہ موصوف کو خود بھی فنِ خاکہ نگاری پر دسترس حاصل ہے۔ اس لیے خاکے میں پائے جانے والی خوبیوں اور خامیوں پر ان کی بصیرت افروز نظر ہے۔ ظہیر احمد صدیقی ''یادِ یارِ مہرباں'' میں خواجہ صاحب کی خاکہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''یادِ یارِ مہرباں' میں جو گرفت کردار نگاری اور حسنِ بیان پر ہے وہ اس عہد میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس میں جو خاکے ہیں ان کو اگرچہ خواجہ صاحب نے قریب سے دیکھا ہے مگر ان کی بزرگی نے بے تکلفی کی بجائے کو درمیان میں لا کھڑا کیا ہے۔ مگر اس عقیدت میں غیریت اور اجنبیت نہیں بلکہ محبت اور خلوص شامل ہے۔ اس کے برخلاف 'یادنامہ' کے تمام کردار خواجہ صاحب کے لئے ہم نشین کی حیثیت رکھتے ہیں اور خواجہ صاحب کو

ع 'جمال ہم نشیں در من اثر کرد' کا اعتراف بھی ہے۔ مگران کرداروں پر وہ
گرفت نظر نہیں آئی جو 'یادیار مہرباں' کا طغرائے امتیاز ہے۔''

(''خواجہ احمد فاروقی نمبر''، کتاب نما، فروری 1993، ص40)

متذکرہ بالا اقتباس کی روشنی میں قارئین پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی ناقدانہ اور فن کارانہ مہارت سے قارئین بخوبی واقف ہو گئے ہوں گے کہ کس طرح اور کس زاویے سے انھوں نے خواجہ صاحب کے فنِ خاکہ کی خصوصیت کو سنجیدگی سے پرکھا ہے۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کا مضمون ''خواجہ احمد فاروقی کی ادبی خدمات پر ایک نظر'' تین صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں مضمون نگار نے سوا دو صفحات میں خواجہ صاحب کے ساتھ آزادی کے فوراً بعد اپنی پہلی ملاقات، تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال، دلّی میں اردو پر پنجابی کے اثرات، اردو اخباروں کی صورتِ حال، ہندوستانی دستور میں اردو کا مقام، ادیبوں، صحافیوں اور سیاست دانوں کا اردو کی بحالی میں رول، مرحوم دلّی کالج کا سرسری ذکر اور اس سے معروف ہستیوں کے تعلق وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ جب کہ آخر کی بیس سطروں میں خواجہ صاحب کی ادبی خدمات کے طور پر صرف چند کتابوں کے نام گنوائے ہیں۔ یقین کے ساتھ ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس مضمون سے خواجہ صاحب کی ادبی خدمات کے ساتھ مکمل انصاف نہیں کیا سکا ہے۔

''پروفیسر خواجہ احمد فاروقی: جیسا میں نے انھیں پایا'' ڈاکٹر اسلم پرویز کا تحریر کردہ مضمون ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز دلّی کالج میں شعبۂ اردو کے اولین طلبا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا داخلہ دلّی کالج میں خواجہ احمد فاروقی کے زمانے میں ہوا تھا۔ انھوں نے اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ بھی خواجہ صاحب کی نگرانی میں ہی مکمل کیا تھا۔ اس تاثراتی نوعیت کے مضمون میں انھوں نے خواجہ صاحب کی شخصیت اور سیرت، لیکچرر سے ریڈر بننے، ریڈر سے پروفیسر اور پھر سبکدوش ہونے تک، تقریریوں کے عمل میں ان کے کردار، محنتی اور مشفقانہ شخصیت کا اثر وغیرہ کے کئی پہلوؤں سے آشکار کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ''خواجہ احمد فاروقی صفِ اوّل کے مکتوب نگار'' کے عنوان سے ایک بیش قیمتی مضمون تحریر فرمایا ہے۔ ان کے مطابق:

''خواجہ صاحب بنیادی طور پر محقق اور نقاد ہیں، لیکن ان میں ایک تخلیق کار

چھپا ہوا ہے۔ ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے
خطوط اور خاکوں کا مطالعہ کیجیے۔ خواجہ صاحب اگر انشائیہ نگاری اور خاکہ نگاری
کی طرف توجہ کرتے طرف توجہ کرتے تو صفِ اول کے انشائیہ نگاروں اور
خاکہ نگاروں میں ان کا نام ہوتا۔"

(خواجہ احمد فاروقی نمبر، کتاب نما، فروری 1993، ص 71)

''خواجہ احمد فاروقی'' نمبر کے دیگر مضامین بھی معلومات سے مزین ہے۔ ان مضمون نگاروں میں عزیز قریشی، سید ضمیر حسن دہلوی، محمد نفیس حسن، ایم حبیب خاں شامل ہیں۔ اس نمبر میں ڈاکٹر آصفہ زمانی کی خواجہ صاحب سے گفتگو، شمیم جہاں کا مضمون ''خواجہ احمد فاروقی ادیبوں کی نظر میں'' اور نمونے کے طور پر خواجہ احمد فاروقی کے مختلف مشاہیرِ ادب کو لکھے گئے خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔

رسالہ ''کتاب نما'' میں ''شاد عارفی نمبر'' فروری 2014 میں شائع کیا گیا۔ جس کی اشاعت ابھی کتابی صورت میں عمل میں نہیں لائی گئی۔ اس وقت اس رسالے کے مدیرِ اعلیٰ خالد محمود اور مدیرِ اعزازی شہپر رسول جب کہ معاون مدیر کے فرائض محمد محفوظ عالم انجام دے رہے تھے۔ شاد عارفی بیسویں صدی کی بالکل ابتدائی دہائی میں پیدا ہونے والے ایک معروف شاعر ہیں۔ شاد عارفی کی پہچان، شہرت اور مقبولیت میں ان کے شاگردِ عزیز پروفیسر مظفر حنفی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ جنھوں نے شاؔد عارفی سے صرف ان کی زندگی کے آخری چودہ پندرہ مہینوں یعنی ان کے انتقال تک بذریعہ ڈاک اصلاح لی۔ یہ بات دوٹوک اور وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر شاد عارفی کو مظفر حنفی جیسا ہونہار اور صالح شاگرد نصیب نہ ہوتا تو شاید ہی آج کی نسل ان کے نام سے واقف ہوتی۔ پروفیسر مظفر حنفی نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ ''شاد عارفی: شخصیت اور فن'' پر لکھا۔ کئی خاردار راستوں کو طے کرنے کے بعد اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس دوران انھوں نے شاد عارفی پر کئی اور کتابیں بھی تصنیف کیں۔ موصوف شاد عارفی پر اب تک تقریباً آدھی درجن سے زائد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ انھوں نے اردو کی بیشتر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ بقول مظفر حنفی:

''اردو ادب کی تقریباً مختلف اصنافِ سخن میں شاد عارفی نے جو کارنامے انجام دیے ہیں اور اضافے کیے ہیں اُن کی نوعیت، انفرادیت، افادیت اور مقدار کو ذہن میں رکھیے تو شاد کے ہاں میدانی دریا کا سا پھیلاؤ اور پہاڑی ندی کا ساز ورشور نظر آتا ہے۔''

(مونوگراف، شاد عارفی از مظفر حنفی، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، 2016، ص 1)

متذکرہ بالا اقتباس سے شاد عارفی کی شعری اور تخلیقی وسعت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہونا چاہئے۔ انھوں نے شاعری میں بعض ایسی اصطلاحات وضع کیں جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے جدّت، ندرت، طرزِ انداز، قوت فکر اور غیر معمولی تجربات کے سبب اپنی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں آن دی۔ جب کہ آج کے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں اس کو خوبیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں پروفیسر خالد محمود لکھتے ہیں:

''صاحب طرز شاعر کی پہچان یہ ہے کہ اس کے اشعار پڑھتے ہی قاری کہہ اٹھے کہ یہ فلاں شاعر کا کلام ہے۔ صاحب طرز ہونا آسان نہیں۔ مجتہد ہونے جیسا ہے۔ اسی لئے صاحب طرز شعرا کی تعداد ہر زبان میں کم ہوتی ہے اردو میں بھی کم ہے مگر جتنے بھی ہیں، ان میں شاد عارفی کا نام جلی حروف میں لکھا جاتا ہے۔''

(شاد عارفی نمبر، کتاب نما، فروری 2014، ص 5)

خالد محمود نے اس نمبر کے لیے بہت ہی معنی خیز اداریہ تحریر فرمایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ شاد عارفی ایک غیور، خوددار اور سادہ لوح انسان تھے۔ بے نیازی نے انھیں جری بنا دیا تھا۔ ایسی کج کلاہ شخصیتیں کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ شاد صاحب نے زندگی کی کڑوی کسیلی سچائیوں کی یلغار کو طنز کے تیروں پر رکھ لیا تھا اور یہ مشکل کام وہ آسانی سے انجام دیتے رہے۔ اس خصوصی نمبر میں شاد عارفی پر سات مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ مشمولات سے صاف اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر مولیٰ بخش کے مضمون ''غزل سے طنز کا شاد عارفی نے کام لیا'' کو چھوڑ کر باقی سب مضامین پہلے سے شائع شدہ ہیں۔ کیونکہ جن قلم کاروں کی تحریریں

شامل اشاعت ہیں وہ سب ان کے معاصرین تھے۔

اداریہ کے بعد مظفر حنفی نے اس خصوصی شمارے کا ''ابتدائیہ'' مختصر لیکن جامع اور مفصل تحریر کیا ہے۔ابتدائیہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاد عارفی کے تلامذہ کی تعداد چالیس کے اوپر ہے جس میں موصوف کو ان کے آخری تلامذۂ خاص کا شرف حاصل ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری سے چھٹی دہائی تک برِ صغیر ہند میں اردو کے تمام مقتدر جریدوں اور رسالوں میں شاد عارفی کی نگارشات مسلسل شائع ہوئیں اور سرحد کے دونوں جانب اردو شاعری کے جتنے بھی لائقِ ذکر انتخابات چھپے، کم و بیش سبھی میں کلام شاد کو نمایاں جگہ ملی ہے۔شاد عارفی طنزیہ شاعری کے لیے بہت مشہور ہیں اور ان کے طنزیہ کلام میں جذبے کی شدت اور حقیقی غم و غصے کے لاوے کا وہ اُبال اور ایسی حرارت ہے کہ اس کی نظیر اردو شاعری میں کم ملتی ہے۔لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو کے اس جری، نڈر، بے باک، جرأت پسند اور جرأت اظہار، ممتاز، نامور فن کار کو اس کے مقامی ہم عصر شاعروں اور ادیبوں نے طرح طرح سے پریشان کیا۔ کیونکہ ان میں بیشتر اس کے طنزیہ شاعری کے اہداف تھے۔ نتیجے کے طور پر شاد عارفی کو زندگی بھر عُسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ لیکن اس کے باوجود بھی انھوں نے اپنی وضع داری اور خودداری کو حد درجہ قائم رکھا اور اس پر آنچ نہیں آنے دی۔ پروفیسر مظفر حنفی کی کتابوں اور مضامین سے ان کے زندگی اور فن کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

''کتاب نما'' کے اس خصوصی شمارے کا پہلا مضمون خلیل الرحمٰن اعظمی کا ''شاد عارفی کی یاد میں'' تحریر کیا ہوا ہے۔ یہ مضمون ان کے مجموعہ مضامین ''مضامینِ نو'' میں بھی شامل ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا شمار شاد عارفی کے تلامذہ میں بھی کیا جاتا ہے۔اس مضمون میں موصوف نے شاد عارفی کی سادگی، خودداری، بے ریائی، غیرت مندی، شرافت، شگفتہ طبیعت، خوش مزاجی، روشن خیالی، راست کرداری وغیرہ کو عمدہ اور غیر جانبداری سے مرقوم کیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے اس مضمون سے ہمیں شاد عارفی سے متعلق بہت سی ایسی نجی باتوں سے آگہی حاصل ہوتی ہے جن کا علم نہ کسی شخص کے ذریعے سے حاصل ہوسکتا ہے اور نہ ہی غالبًا ان کا ذکر موصوف کے بیان کرنے سے پہلے دوسری کتابوں میں کیا گیا ہوگا۔ جیسے ایک صاحب شاد

صاحب کو خط میں لکھتے ہیں کہ میں آپ کی شاعری کا بڑا معترف ہوں اور آپ پر مضمون لکھنے کا خواہاں ہوں۔ اس لیے آپ کے جو شعری مجموعے چھپ چکے ہیں یا جن رسائل میں آپ کی خاص خاص نظمیں ہوں وہ مجھے عاریتاً بھیج دیں۔ موصوف کے مطابق شاد صاحب نے اس خط کا جواب یہ دیا کہ ''میاں صاحبزادے تم نے کتابیں اور رسالے حاصل کرنے کی خوب ترکیب نکالی۔ یاد رکھو میں ان شاعروں میں نہیں ہوں جو اپنی تعریف میں مضمون لکھوا کر خوش ہوتے ہیں۔ لکھنے والوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ میری شاعری کے بارے میں اپنے طور پر جو چاہیں لکھیں یا بُری بھلی رائے چاہیں قائم کریں لیکن اس بات کا مجھ سے کیا سروکار، مجھے اپنے اوپر مضمون وضمون نہیں لکھوانا۔'' چونکہ خلیل الرحمن اعظمی نے شاد عارفی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس لیے شاد عارفی اپنے کلام کے بارے کیسی رائے رکھتے تھے اور دوسروں سے کس رائے کی توقع کرتے تھے، اپنے کلام کی معنویت اور خوبیوں کو کن شعرا کے ہم پلہ گردانتے تھے، ان کے تلامذہ میں کون لوگ شامل تھے، ان کے شعری محاسن، ان کی نظموں، ان کے مکتوبات، ان کے بیانیہ اور مکالموں کی اہمیت، ترقی پسندوں سے ہمدردی وغیرہ کی شناسائی اسی مضمون کے ذریعے ہوتی ہے۔

''خطوطِ شاد عارفی'' میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں کہ شاد عارفی کے خطوط کا کل سرمایہ ان کی زندگی کے آخری دس سالوں پر یعنی 1946 سے 1954 پر محیط ہے۔ جنھیں ان کے لائق وفائق اور قدرداں شاگرد مظفر حنفی نے ''شاد عارفی: شخصیت اور فن'' میں شامل کیا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین کرانا ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ مضمون غالباً ستائیس، اٹھائیس سال پہلے کا لکھا ہوا ہے جب کہ اب مظفر حنفی نے شاد عارفی کے مکتوبات کو الگ سے پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک جلد میں شائع کر دیا ہے۔ شاد عارفی کی فنِ مکتوب نگاری کے خصائص اور اوصاف پر اس مضمون میں عالمانہ اور فن کارانہ انداز میں پروفیسر موصوف نے بہت ہی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اس مضمون سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ شاد عارفی کی مکتوب نگاری کسی بھی قدر اہمیت اور وقعت کی حامل ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے ہمیں نہ صرف شاد عارفی کے خطوط نگاری کے فن سے آگاہی ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی طبیعت،

سادگی، بے باکی، نرمی، گرمی، سختی کا علم ہوتا ہے اور ان کی فطرت، مزاج، میلان، رجحان، دلچسپی، شغل سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کی دھوپ چھاؤں سے ہی آگاہی نہیں ہوتی بلکہ بعض ایسی حقیقتیں بھی روشن ہو جاتی ہیں جن کا علم عام طور سے نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ وطن عزیز یعنی ہندوستان سے کس قدر محبت کرتے تھے لیکن اہلِ وطن نے ان کی قدر نہیں کی وغیرہ۔ بقول مصنف:

> ''اگرچہ یہ خطوط ان کی زندگی کے آخری دس سال کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں لیکن ان کے مطالعہ سے ان کی زندگی کے مختلف دور کے واقعات، حادثات، خاندان، پیدائش، تعلیم، ملازمت، معاشقہ، شادی، مفارقت، سفر، حضر، بیماری، صحت یابی، پنشن وغیرہ سے بھی آگاہی ہوتی ہے جن کی وجہ سے بھی یہ خطوط بہت زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔''

(شاد عارفی نمبر، کتاب نما، فروری 2014، ص 19)

پروفیسر موصوف نے مختلف خطوط کے اقتباسات کی روشنی میں شاد عارفی کی مکتوب نگاری کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ جیسا کہ مذکور ہوا ہے کہ شاد عارفی کو طنز نگار کی حیثیت سے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ پروفیسر فرمان فتح پوری نے اپنے مضمون ''شاد عارفی: ایک طنز نگار غزل گو'' میں موصوف کی غزلیہ شاعری میں طنزیہ پہلوؤں کی عکاسی کرنے کی خوب سعی کی ہے۔ فرمان فتح پوری کے مطابق چونکہ شاد عارفی کے شخصیت ڈھکی چھپی، ٹیڑھی ترچھی یا مبہم و پیچیدہ نہیں بلکہ سیدھی، صاف، کھلی ہوئی اور سادہ ہے۔ اس لیے ان کے فن کو بھی ان کی شخصیت کا عکس کہنا چاہیے۔

اس شمارے میں شامل ڈاکٹر مولیٰ بخش کا مضمون ''غزل سے طنز کا شاؔد عارفی نے کام لیا'' بھی موصوف کی غزلیہ شاعری میں طنزیہ عناصر کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یہ مضمون معلوماتی اور مفید ہے۔ میراجی کا مضمون ''کلامِ شاؔد کا تجزیہ'' بھی اس شمارے کی زینت بڑھاتا ہے۔ اس مضمون سے ہماری دلچسپی کا ایک خاص عنصر یہ بھی ہے کہ یہ مضمون شاد عارفی کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ کیونکہ میراجی 1949 میں انتقال کر گئے تھے اور شاد عارفی

میراجی کے پندرہ سال بعد 1964 میں اس داعی اجل کو لبیک کہہ گئے تھے۔ پوری ادبی دنیا اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ میراجی کو نظموں کے تجزیے میں جو شرفِ قبولیت اور اعلیٰ درجہ کا کمال حاصل تھا وہ انہی کے فن کا خاصہ تھا۔اس تجزیاتی مضمون میں انھوں نے شاد عارفی کی دو نظموں ''جبر و قدر'' اور ''دسہرا اشنان'' بڑا خوب تجزیہ کیا ہے۔''شاد عارفی کا فن'' ترقی پسند تحریک کے علمبردار پروفیسر اختر انصاری کا تحریر کردہ مضمون ہے۔شاؔد نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں۔وہ زمانہ بہت سے شاعروں کی اُٹھان کا زمانہ تھا۔ان کے معاصرین میں بیسویں صدی کے بڑے بڑے شاعروں کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔لیکن ان کے دوش بہ دوش شاد عارفی نے بھی اپنے قلم سے کتنے ہی معروف رسائل کے صفحات کو سیاہ کر ڈالا۔ان کے منفرد شعری لہجے، اسلوب اور رنگ و آہنگ سے ان کی پہچان کرنا مشکل نہ تھا۔اختر انصاری نے مذکورہ مضمون میں ان کے کلام کے شاید ہی کسی پہلو سے ہمیں تشنہ رکھا ہوگا۔مضمون نگار یوں رقمطراز ہیں:

> ''شاد عارفی جس رنگِ سخن کے ساتھ بزم ادب میں داخل ہوئے تھے ان کی تازگی اور نئے پن کا راز دراصل غزل کے روایتی علامتی اسلوب سے علاحدگی اور بے تعلقی میں تھا۔اس بنیادی تغیر کے سایے میں شاد عارفی کی غزلیہ شاعری پھلی پھولی اور پروان چڑھی۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں دوسرے عناصر بھی جگہ پاتے گئے۔شاد صاحب کی انانیت اور مزاج کی شوریدگی نے ان کے کلام میں ایک تلخ حقیقت نگاری کو جنم دیا۔ان کی فطری جرأت، بے باکی اور صاف گوئی نے اس رنگ کو کچھ اور تیز کیا۔طبیعت کی جھلاہٹ اور برافروختگی سے کبھی تلخ گفتاری اور کبھی تضحیک، تمسخر اور استہزا کے اوصاف پیدا ہوئے۔''
>
> (شاد عارفی نمبر، کتاب نما، فروری 2014، ص 48)

اس شمارے کے تقریباً سبھی مضامین جامعیت، ہمہ گیریت اور معنی آفرینی سے لبریز ہیں۔ڈاکٹر راہی معصوم رضا کا مضمون ''ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں'' بھی انہی اوصاف

سے سرشار نظر آتا ہے۔ ’’شمع افروز زیدی نے شاد عارفی کی سوانح کوائف کو پیش کیا ہے۔ ’’شاد عارفی نمبر‘‘ کے اخیر میں ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔

الغرض ’’کتاب نما‘‘ کے خصوصی شمارے ادب کے میدان میں بیش بہا اضافہ کرتے ہیں۔ شخصیات پر خصوصی اشاعت میں اس رسالے نے اردو رسائل و جرائد کی دنیا میں ایک تاریخ رقم کی ہے۔ یہ بات ٹھوس شواہد اور معتبر دلائل کی بنیاد پر کہی جارہی ہے کہ شخصیات پر پچاس سے زائد شمارے شائع کرنے میں ’’کتاب نما‘‘ کا نام ابھی تک سرفہرست ہے۔

# ذہنِ جدید اور زبیر رضوی

بیسویں صدی کے اواخر میں سرزمینِ ہند پر اردو کا ایک ایسا عہد ساز رسالہ وجود میں آیا جس نے اپنے موضوعات، مشمولات، جدّتِ طرزِ فکر، وسعت اور معیار کی بنیاد پر نہ صرف اُس وقت کے رسائل و جرائد پر فوقیت حاصل کی بلکہ آج کل کے رسائل و جرائد کی دوڑ میں بھی یہ رسالہ سرِفہرست نظر آتا ہے۔ سہ ماہی ''ذہنِ جدید'' کے نام سے مشہور یہ رسالہ جہاں دیدہ اور فکرِ فردا شاعر زبیر رضوی کے کارہائے نمایاں کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ اس کے علاوہ اس دور میں اردو کے اور رسالے بھی شائع ہوتے تھے لیکن ان میں کوئی بھی رسالہ معتبریت اور استناد کے اعتبار سے ذہنِ جدید کے مقام کو نہ پہنچ سکا۔ رسالہ ''ذہنِ جدید'' کا پہلا شمارہ ستمبر تا نومبر 1990 میں منظرِ عام پر آیا تھا اور اس کا آخری شمارہ بھی اتفاقاً ستمبر کے مہینے میں ہی یعنی ستمبر تا نومبر 2015 میں مَنصّہ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اس طرح رسالہ ''ذہنِ جدید'' مسلسل چھبیس برسوں تک اردو زبان و ادب کی آبیاری کرنے میں مصروفِ عمل رہا۔ قارئین حضرات کے ذہن میں یہ سوال اُٹھ رہا ہوگا کہ راقم الحروف نے مذکوہ بالا میں اس کے آخری شمارہ ہونے کا تعین از خود ہی کیسے کرلیا۔ اس کا اندازہ ''ذہنِ جدید'' کی مدیر جمشید جہاں سے کی گئی راقم الحروف کی خصوصی بات چیت کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے بقول جمشید جہاں:

> ''بانی اور مرتب رسالہ ذہن جدید زبیر رضوی کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کے بعد اُن کے بہت سارے خیر خواہوں، ہمنواؤں اور

پیشواؤں نے ذہنِ جدید کو جاری رکھنے کا اصرار کیا اور رسالے کی اشاعت
کی ذمہ داری کا بیڑا اُٹھانے کا عزم بھی کیا۔لیکن اب ایسا بالکل بھی ممکن
نہیں ہے کیونکہ رسالے کا جو معیار مرحوم زبیر صاحب نے قائم کیا تھا اُس
معیار کو برقرار رکھ پانا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔اس لئے 71 واں شمارہ
ہی ذہنِ جدید کا آخری شمارہ قرار پایا ہے۔''

اردو کے باذوق قارئین کے لیے یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اب اس زندہ اور باثر رسالے کے مطالعے سے محروم ہوگئے ہیں لیکن برسوں تک رسالہ ''ذہنِ جدید'' نے ادب کی جو خدمت کی، اس کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔علاوہ ازیں ادبی صحافت کی تاریخ میں رسالہ ''ذہنِ جدید'' کا نام سنہرے لفظوں میں لکھے جانے کے مستحق ہے۔

ذہنِ جدید ایک ایسا رسالہ ثابت ہوا ہے کہ جس کا اوّل تا آخری ہر شمارہ جدید تھا اور یہ انفرادیت اس رسالے سے کبھی بھی ختم نہیں ہوئی۔زبیر رضوی مرحوم نے یہ رسالہ مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب کی یاد میں جاری کیا تھا۔یہ تحریر ''ذہنِ جدید'' کے ہر شمارے کے سرورق پر نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔اس سے ان کی حیدر آباد اور حیدر آبادی ادیبوں کے ساتھ عقیدت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ساتھ ہی اس رسالے کی ایک اور روایت یہ رہی ہے کہ اُس کے سرورق پر ''بڑی زبان کا زندہ رسالہ'' اور ''ادب، آرٹس اور کلچر کا ترجمان'' جیسے الفاظ بھی اس کو خوبصوت اور دیدہ زیب بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ادب، فنون، آرٹ، کلچر، تہذیب، ثقافت وغیرہ کی نمائندگی اور ترجمانی رسالہ ذہنِ جدید نے بڑی عمدگی سے کی ہے۔اب ہم قارئین حضرات کو رسالہ ''ذہنِ جدید'' کے پہلے اور آخری شمارے کے موضوعات کی جھلک دکھاتے ہیں تا کہ انھیں کو اندازہ ہو جائے کہ ''ذہنِ جدید'' نے جو راہ ابتدا میں اختیار کی تھی وہی روش اس کے آخری شمارے میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔'

'ذہنِ جدید'' کے پہلے شمارے کی ابتدا ایک بحث سے شروع ہوتی ہے۔بحث کا موضوع ''اشتراکی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے پیش نظر ترقی پسندی کی معنویت'' ہے۔ جس کے شرکاء میں بلراج کومل، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر قمر رئیس، دیوندر اسر اور وحید اختر جیسے

ادبا نے اظہارِ خیال کیا ہے۔اس بحث سے پہلے میخائیل گورباچوف کے اس نہایت اہم انٹرویو کا اقتباس دیا گیا ہے جو مشہور امریکی جریدے ''ٹائم میگزین'' نے ان سے لیا تھا اور جس کی اشاعت 4/ جون 1990 کے شمارے میں ہوئی تھی۔ بحث ہی کے باب میں باقر مہدی کے مضمون ''ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش'' کا دوسرا حصّہ بھی شریک ہے۔اس شمارے کا دوسرا موضوع افسانہ ہے۔ جس میں بانو قدسیہ، انور عظیم، سریندر پرکاش، جیلانی بانو، عوض سعید، عبداللہ حسین (ناولٹ کا ایک حصّہ) جیسے افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں۔اس کے بعد اس شمارے کے دیگر موضوعات میں طنزو مزاح، شاعری، فلسطینی ادب، ہندوستانی ادب، فلم، تھیٹر، کینوس، انٹرویو، مصوری، کتابوں کی باتیں، ڈرامہ اور ترسیل وغیرہ شامل ہیں۔ پہلے شمارے کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں ممتاز مفتی پر ایک خصوصی گوشہ شائع کیا گیا ہے جس نے پہلے شمارے کو اور زینت بخش دی ہے۔ ''ذہنِ جدید'' کا پہلا شمارہ 203 صفحات پر مشتمل ہے۔ چند ایک شماروں کو چھوڑ کر ''ذہنِ جدید'' کی ضخامت یا تو اس کے قریب رہی یا اس میں متواتر اضافہ ہوتا رہا، جب کہ ''ذہنِ جدید'' کا آخری شمارہ بھی 240 صفحات پر محیط ہے۔ زبیر رضوی نے صرف رسالے کی ضخامت بڑھانے کی غرض سے خانہ پُری نہیں کی ہے بلکہ اچھے، معتبر، مستند ادب اور تخلیقی تہذیب کو آگے بڑھایا ہے۔''ذہنِ جدید'' ایک ایسا رسالہ ہے جو زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔توازن ''ذہنِ جدید'' کا خاصّہ رہا ہے۔

جب ''ذہنِ جدید'' کے آخری شمارے پر نظر ڈالتے ہیں تو اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی شمارہ اوّل کا ہی تتبع کرتا نظر آتا ہے۔اس شمارے میں اردو نظم کے معمار شاعر اختر الایمان پر خصوصی گوشہ شائع کیا گیا ہے۔اس کے بعد باز خواں کے تحت مجتبیٰ حسین کی تین تنقیدی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔اس کے علاوہ نظمیں، غزلیں، عالمی ادب، تھیٹر، سنگیت، رقص، فلم، فوٹوگرافی، ردِعمل وغیرہ جیسے موضوعات کے تحت تحریریں شاملِ رسالہ ہیں۔ایسے اور اس طرح کے بہت سارے موضوعات سے رسالہ ''ذہن جدید'' جابجا مزین نظر آتا ہے۔

''ذہنِ جدید'' کے اوّل اور آخری شمارے کا ذکر کرنا یہاں اس لیے ضروری سمجھا گیا تا کہ قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ جدید طرز کا حامل رسالہ ''ذہنِ جدید'' ابتدا سے آخر تک جدید ہی

رہااوراس کے علاوہ اس میں کسی قسم کی بے جا تبدیلی نہیں کی گئی۔"ذہنِ جدید" کے موضوعات پر بات کی جائے یا اس کے مشمولات پر، معیار پر بات کی جائے یااس میں جگہ پانے والے تخلیق کاروں کے حوالے سے بات ہو،غرض یہ رسالہ اپنی شہرت کے باعث ہمیشہ سے ادب کی دنیا میں گفتگو کا موضوع بنا۔

بین العلومی اور بین الفنونی دلچسپی کا حامل رسالہ "ذہنِ جدید" کل بھی منفرد تھا اور آج بھی منفرد ہے۔اس میں معاصر بین الاقوامی فضا ملتی ہے۔جو آج کل کے بیشتر رسالوں میں مفقود نظر آتی ہے۔بلاشبہ ہندوستان میں ایسا رسالہ نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے۔وہ مردِ مومن شخص جس نے چھبیس برسوں تک مسلسل اپنے رسالے سے ادبی سرزمین میں زرخیزیت پیدا کردی، زبیر رضوی مرحوم ہی تھے۔جنھیں بحیثیتِ شاعر اعلیٰ مقام حاصل تھا، نہ صرف شاعری بلکہ ادب کے ہر میدان تنقید، تحقیق، تخلیق، ڈرامہ، آرٹ، فنونِ لطیفہ، تبصرہ نگاری، اداریہ نویسی، کالم نگاری، وغیرہ پر انھیں اچھا عبور حاصل تھا۔ان کی دلنشین آواز، اندازِ بیان، لب ولہجہ اور شکل وصورت کے ہزاروں پرستار تھے۔جس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ زبیر رضوی کو مختلف میدانوں سے تعلق رکھنے والے مشاہیر کے روبرو اور انٹرویو کرنے کا موقع نصیب ہوا۔آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کے دوران انھیں کئی ادبی اور فلمی و دیگر میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی ہستیوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا جسے انھوں نے "ذہنِ جدید" کے صفحات کی رونق بنایا اور قارئین کو اُن خوبصورت یادوں سے تروتازہ کیا۔آج کی دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی اکثریت ہے جو فلم اور فلمی لوگوں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے میں بڑے بے تاب نظر آتے ہیں۔اس طرح "ذہنِ جدید" ایسے قارئین کی تشنگی کو بھی دور کرنے میں کامیاب ہوا۔پروفیسر شہپر رسول کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں زبیر رضوی رسالہ "ذہنِ جدید" کے معیار و وسعت کاری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "ذہنِ جدید اپنے صفحات پر اور اپنے مزاج و معیار کے اعتبار سے کیسا ہو اس کا خیال مجھے ریڈیو پر رہ کر ہوا۔جہاں تنوع اور رنگارنگی ہی نشریات کا

حسن تھا، دوسرے ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ میں ادب کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ کا Coverage بھی ہوتا تھا۔ اس کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ جو بھی اِس وادیٔ پرخار کا مسافر بننے کا آرزومند ہو وہ نہ صرف ساؤنڈ میڈیا کا نبض آشنا ہو بلکہ ہندوستانی فنونِ لطیفہ کے خدوخال کو بھی پہچانتا ہو۔ اس کے تعارف اور تجزیے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بس اس خیال سے میں نے 'ذہنِ جدید' کے منفرد خدوخال کا تعین کیا اور اس کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا۔ تا کہ میرے رسالے کا نوجوان قاری اگر چاہے تو ساؤنڈ میڈیا کی دنیا کا حصّہ بھی بن سکے۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی تھا کہ اردو کی ادبی صحافت کو ایک ایسا چہرہ دیا جائے جو قومی ثقافت کے نقش و نگار سے آراستہ ہو اور اپنی مثال آپ ہو۔"

(متاعِ سخن از اسلم پرویز، ص198)

متذکرہ بالا انٹرویو کا صرف ایک اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ یہ انٹرویو ماہ نامہ "اردو دنیا" میں اگست 2009 میں شائع ہوا تھا۔ آج کے مبصرین حضرات عام اُدبا کے لیے بھی ہمہ جہت، ہمہ گیر، کثیر الجہات، متنوع شخصیت وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں تو جو شخص ان جیسے بہت سارے خصائص سے لبریز اور سرشار ہو اُس کے لیے کس نوعیت کے الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کی شاید ہی ضرورت محسوس ہو۔

زبیر رضوی نے اپنی زندگی میں "ذہنِ جدید" کی چھبیس جلدیں نکالیں، جو کل 71 شماروں پر مشتمل ہے۔ غرض اتنے اچھے اور معیاری رسالے کو عرصۂ دراز تک نکال پانا آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے مرتبِ رسالہ و بانیٔ رسالہ کو کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑے، یہ صبر آزما کام اُنہی کا سرمایہ اور اُنہی کا کلیجہ تھا۔ زبیر رضوی نے "ذہنِ جدید" میں کئی ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں، ناول نگاروں، ناقدوں، صحافیوں، ڈرامہ نگاروں وغیرہ پر خصوصی شمارے اور گوشے شائع کیے گئے۔ گوشے تو تقریباً اکثر و بیشتر شماروں میں پڑھنے کو ملتے تھے۔ "ذہنِ جدید" کے ان گوشوں اور خصوصی شماروں نے اپنے آپ میں ایک تاریخ رقم کی ہے۔

اب آیئے سرسری طور پر ''ذہنِ جدید'' کے شائع شدہ خصوصی شماروں اور گوشوں کا ذکر کیا جائے جیسے: افسانہ نگار ممتاز مفتی کا گوشہ، شمارہ نمبر 5، گوشۂ عزیز حامد مدنی اور گوشۂ شکیب جلالی، شمارہ نمبر 6، گوشۂ عصمت چغتائی اور فسادات پر گوشہ، شمارہ نمبر 7، گوشۂ منٹو، شمارہ نمبر 9، گوشۂ دیوندر ستیارتھی، شمارہ نمبر 10، گوشۂ فسادات، شمارہ نمبر 14، فسادات کے افسانے نمبر، شمارہ نمبر 16، گوشۂ مجاز، شمارہ نمبر 17، گوشۂ فراق، شمارہ نمبر 19، جدید نظم نمبر 1 (انتخاب نظم) اور گوشۂ اختر الایمان، شمارہ نمبر 20، جدید نظم نمبر 2 (نظموں کے تجزیے)، شمارہ نمبر 27، گوشۂ غالب اور فنونِ لطیفہ، شمارہ نمبر 29، گوشۂ ادب پیا، شمارہ نمبر 30، گوشۂ علی سردار جعفری، گوشۂ مجروح سلطان پوری، گوشۂ فاشزم اور ثقافت کے بحران، شمارہ نمبر 32، خصوصی مطالعہ سو برس اور دس افسانے، شمارہ نمبر 33، گوشۂ امن انسان کی ضرورت ہے، شمارہ نمبر 34، گوشۂ گجرات، شمارہ نمبر 36، گوشۂ یگانہ چنگیزی اور گوشۂ شکیب جلالی (تعارف و انتخاب)، شمارہ نمبر 37، گوشۂ ممتاز شیریں اور گوشۂ پریم چند، شمارہ نمبر 38، نازک الملائکہ پر گوشہ، شمارہ نمبر 39، گوشۂ پابلو نرودا، شمارہ نمبر 40، گوشۂ گبریل گارسیا مارکیز، شمارہ نمبر 41، گوشۂ احمد ندیم قاسمی، شمارہ نمبر 43، پریم چند کے افسانوں پر خصوصی شمارہ، شمارہ نمبر 48، سعادت حسن منٹو نمبر، شمارہ نمبر 49، گوشۂ مخدوم محی الدین، شمارہ نمبر 53، گوشۂ حبیب تنویر، شمارہ نمبر 54، گوشہ اردو شعراء، (امیر خسرو سے جاں نثار تک کے شاعروں کے کلام کا انتخاب اور احوال و افکار) شمارہ نمبر 56، پاکستانی خواتین افسانہ نگار نمبر (پاکستان کے نو کہنہ مشق خواتین افسانہ نگاروں کے نو افسانوں کا انتخاب)، شمارہ نمبر 58، گوشۂ ن۔م۔راشد، شمارہ نمبر 63، گوشۂ ضیا جالندھری، شمارہ نمبر 64، گوشۂ ہاجرہ مسرور، گوشۂ شفیق فاطمہ اور گوشۂ شہزاد احمد، شمارہ نمبر 65، گوشۂ ثمینہ راجہ اور علی ظہیر، شمارہ نمبر 67، گوشۂ وارث علوی اور گوشۂ محمد علی صدیقی، شمارہ نمبر 68، گوشہ پریم چند اور علی سردار جعفری، شمارہ نمبر 69، گوشۂ حلقۂ اربابِ ذوق، شمارہ نمبر 70، گوشۂ اقبال متین، شمارہ نمبر 71، گوشۂ اختر الایمان وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر گوشے ''ذہنِ جدید'' میں شائع ہوئے ہیں۔

''ذہن جدید'' کا ہر ایک شمارہ ایک نیا گوشہ، ایک نئی شخصیت، ایک نئے ادا کار و فن کار، ایک نئے مسئلے اور ایک نئے پہلو کو اُجاگر کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ مذکورہ بالا گوشوں

اور خصوصی شماروں کے علاوہ اس میں کئی ادبی وغیر ادبی اشخاص اور متنوع موضوعات کے خصوصی مطالعے پیش کیے گئے ہیں۔شائع شدہ خصوصی شماروں اور گوشوں میں چند ایسے ہیں جنھیں زبیر رضوی نے اپنے ''مکتبہ ذہنِ جدید'' سے شائع کرایا۔''ذہنِ جدید'' کا چودھواں شمارہ آزادی کے بعد ہونے والے فسادات پر لکھے گئے افسانوں پر مشتمل ہے۔اسے بعد میں مزید افسانوں کے ساتھ اردو اور بعد میں ہندی میں بھی کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔اسی طرح شمارہ نمبر 19 جدید نظم نمبر (1) پر مشتمل ہے۔یہ پورا شمارہ 1960 کے بعد نمایاں ہونے والے شاعروں کی نظمیہ شاعری کے انتخاب پر مبنی ہے۔اس کے علاوہ رسالے کا بیسواں شمارہ جدید نظم نمبر 2 کے حوالے سے شائع ہوا ہے۔جس کو دراصل پہلے شمارے کے تسلسل میں شائع کیا گیا۔اس میں جدید نظم پر مضامین اور تجزیے شامل ہیں۔بعد میں زبیر رضوی نے ان دونوں شماروں کو ملا کر ترمیم و اضافے کے ساتھ ''نئی نظم: تجزیہ اور انتخاب'' کے نام 433 صفحات پر مشتمل ایک مبسوط کتاب شائع کی۔ستائیسویں شمارے میں گوشہ ''غالب اور فنونِ لطیفہ'' شائع ہوا ہے۔یہ شمارہ غالب اور ہندوستانی فنون، فلم اور الیکٹرانک میڈیا پر غالب کے اثرات کے لیے مخصوص ہے۔اس میں شامل تحریریں بعد میں ''غالب اور فنونِ لطیفہ'' نامی کتاب میں اضافے کے ساتھ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی سے شائع ہوئی۔

''ذہن جدید'' کا انتیسواں شمارہ ''ادب پیا'' کے خصوصی نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں دس منتخب بہترین افسانے شائع کیے گئے ہیں۔دراصل ''ذہنِ جدید'' نے اردو زبان میں پہلی بار ایک ادبی سروے کیا جس میں دس افسانوں کو منتخب کیا گیا تھا۔ان افسانوں پر پورے برِ صغیر کی اردو دنیا میں بہت دنوں تک مثبت، منفی ردِ عمل سامنے آئے۔بعد میں 2001 میں اس شمارے کو کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔سترواں شمارہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں مرتب رسالہ نے ادب، تھیٹر، فلم، مصوری، سنگیت، رقص، کارٹون، فوٹوگرافی وغیرہ جیسے شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی پچیس مشہور و معروف شخصیات کے وقتاً فوقتاً لیے گئے انٹرویوز بعنوان چہرہ بہ چہرہ روبرو شامل کیے ہیں۔زبیر رضوی نے ''ذہنِ جدید'' میں فلم و سنیما کے حوالے سے ایک مخصوص گوشہ شائع کیا تھا جس میں دیگر قلم کاروں کے علاوہ

خود ان کے بہت سارے مضامین شائع ہوتے تھے جن کو بعد میں ترتیب دے کر انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ''ہندوستانی سنیما: سو برسوں کا سفر'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ چونکہ ''ذہنِ جدید'' ان کی بہت ساری تحریروں اور مضامین سے بھرا پڑا ہے، جو مختلف موضوعات کے تحت لکھے گئے تھے۔ انہی میں چند مضامین جمع کر کے انھوں نے ''اردو، ادب اور فنون'' کے نام سے کتاب شائع کی۔ اسی طرح ''عصری عالمی ادب کے ستون''، ''ترقی پسند اور ان کے معاصر پینٹر'' جیسی کتابیں بھی ''ذہنِ جدید'' کی ہی دین ہیں۔ علاوہ ازیں رسالہ ''ذہنِ جدید'' زبیر رضوی کی بے شمار تحریروں (شاعری و نثر) کا خزینہ ہے جن کی اشاعت اگر ممکن ہو تو زبیر رضوی کی مزید کئی اہم تحریریں شائقینِ ادب کے لیے قیمتی سرمایہ ثابت ہوں گی۔

''ذہنِ جدید'' میں جن موضوعات پر بحث و مباحثے ہوئے، ان میں تہذیبی اظہار کی آزادی، پچاس برسوں میں اردو کی فکشن کی تنقید اور روایت، ہندی کہانی کل اور آج، اردو فکشن، تنقید اور روایت، اب غزل میں بڑی شاعری کے امکانات ختم ہوئے، ادب کی موت، تخلیق یا تنقید بالادستی کس کی؟ وغیرہ پر مختلف مشاہیرِ ادب خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔ یہ مباحثے، مذاکرے، مکالمے، جائزے ہمیشہ قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں جس سے ادب کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا تھا۔

اردو کے ادبی رسائل کی صف میں ''ذہنِ جدید'' نے نہ صرف اپنی مختلف النوع کارکردگی کے مستحکم ثبوت مہیا کیے ہیں بلکہ سنجیدگی سے اردو زبان کے اس وسیع حلقۂ قارئین تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جو اب تک اکثر اردو رسائل و جرائد کے دائرہ کار سے باہر تھا۔ ''ذہنِ جدید'' کے ہر شمارے میں اردو زبان و ادب سے متعلق تخلیقی، معلوماتی، تجزیاتی اور تنقیدی تحریریں تو بہرحال شامل ہوتی رہیں۔ لیکن ''ذہنِ جدید'' کو جو خصوصیات اردو زبان کے اکثر ادبی جرائد سے ممتاز کرتی ہیں اُن میں مختلف اصنافِ ادب کے سلسلے میں ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ہونے والے تخلیقی اور تنقیدی، علمی اور فکری کام کی پیش کش، مختلف فنونِ لطیفہ کے رجحانات اور متعلقہ شخصیات کے مطالعے اور تجزیے، انتخاب و ترتیب کا بلند معیار اور

مضامین کا تنوع خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

''ذہنِ جدید'' میں ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے مضامین، نظم و نثر کے تراجم، مختلف اہم عصری، تخلیقی، ادبی، مسائل سے متعلق مباحث، تھیٹر، مصوری، کینوس، فلم، فنونِ لطیفہ، موسیقی، سنگیت، فوٹو گرافی، کارٹون، رقص، پینٹنگ، بت تراشی وغیرہ کے معلوماتی مطالعے، اردو اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تعارفی تبصرے اور جائزوں کے ساتھ ساتھ قومی و بین الاقوامی خبریں ''ذہنِ جدید'' کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس رسالے میں انگریزی، فلسطینی، عربی، کنٹر، ہندی، پنجابی، ڈوگری، تلگو، سندھی، اَوَدھی وغیرہ زبانوں کی تخلیقات کے تراجم اور ان زبانوں کے ادبی رجحانات کے عمومی جائزوں کے علاوہ عالمی ادب کے مشہور شخصیات کے مطالعے پیش کیے گئے ہیں۔ ''ذہنِ جدید'' میں شائع شدہ تخلیقات کے حوالے سے ہر شمارے کے آخر میں قارئین کو اپنے تاثرات پیش کرنے کی کھلی چھوٹ دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مختلف اہلِ ادب حضرات کے مرتب رسالہ کے نام خطوط کو بھی اس میں ایک اہم جگہ دی جاتی تھی۔ اس طرح ''ذہن جدید'' کا دائرہ نہ صرف شاعری، مضامین، کہانیوں، انشائیوں، خاکوں، مکتوبات، تحقیق و تنقید، اور تبصرہ وغیرہ تک محدود ہے بلکہ اردو رسائل میں ادب کی محدودیت کو زندگی کی رنگا رنگ جہات سے ہم آشنا کرنے کی پہل ''ذہنِ جدید'' کی پہچان ہے۔

''ذہنِ جدید'' میں مختلف اصنافِ سخن سے متعلق مختلف قلم کاروں کے شہ پاروں کی اشاعت عمل میں لائی جاتی تھی۔ جن میں کچھ پہلے سے ہی ادب کی دنیا پر چھائے ہوئے تھے اور کچھ اپنا مقام بنانے کی سعی میں تھے، اسی طرح کچھ ادیب ایسے تھے جنھیں ''ذہنِ جدید'' سے پہچان حاصل ہوئی۔ افسانہ لکھنے والے تخلیق کاروں میں انتظار حسین، غلام جیلانی، مظہر الاسلام، الیاس احمد گدی، مشرف عالم ذوقی، گلزار، شوکت حیات، شفق، شموئل احمد، مرزا حامد بیگ، اسرار گاندھی، حسین الحق، عبدالصمد، جیلانی بانو، اقبال مجید وغیرہ وغیرہ۔ شاعری میں بلراج کومل، ندا فاضلی، عزیز قیسی، کشور ناہید، بشر نواز، انور معظم، عرفان صدیقی، عمیق حنفی، مخمور سعیدی، باقر مہدی، کمار پاشی، رفعت سروش، انور سدید، ملک زادہ منظور احمد، شاہد کلیم، اسعد بدایونی، علی سردار جعفری، مظہر امام، راشد انور راشد، اختر الایمان، محمد علوی،

مظفر حنفی، نذیر فتح پوری، شہپر رسول، شاہنواز عاصم شبلی، رونق شہری، قمر صدیقی وغیرہ۔ طنز و مزاح میں یوسف ناظم، دلیپ سنگھ، نصرت ظہیر، مجتبیٰ حسین، دیوندر ستیارتھی، شفیقہ فرحت، معین اعجاز، پرویز اللہ مہدی وغیرہ۔ مضمون نگاروں میں وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، انور معظم، شمیم حنفی، عابد سہیل، شافع قدوائی، امتیاز احمد، سلام بن رزاق، وہاب اشرفی، ابوبکر عباد، ارجمند آرا وغیرہ۔ تھیٹر میں سیودھ لال، دیپا گہلوت، اشیش چکروتی، شمس الاسلام وغیرہ، رقص میں رشمی سہگل وغیرہ، جیسی شخصیات شامل ہیں۔ مزید ''ذہنِ جدید'' میں وہ ایسی شخصیات کا تعارف کراتے جن سے اردو دنیا تقریباً نابلد ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر انھوں نے (ذہنِ جدید، شمارہ نمبر 28، میں ہندوستان کے ایک لی جنڈ نیرد۔سی۔ چودھری پر بڑا چشم کشا مضمون شائع کیا تھا۔ وہ آکسفورڈ (لندن) میں رہتے تھے اوران کا انتقال 101 سال کی عمر میں ہوا تھا۔

''ذہنِ جدید'' کی ورق گردانی کرتے ہوئے باذوق، باشعور اور باصلاحیت قاری کو یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا کہ یہ رسالہ کسی بھی یورپی ادبی جریدے سے کم تر نہیں۔ اور بھی کہ یہ رسالہ ایک فردِ واحد کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زبیر رضوی اس رسالے کے پیچھے تنِ تنہا محنت کیا کرتے تھے۔ ''ذہنِ جدید'' کا کوئی بھی شمارہ زبیر رضوی کی تحریر سے خالی نہ رہا ہوگا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات پورے شمارے میں آدھی سے زیادہ تخلیقات زبیر رضوی کے زورِ خیز قلم کا نتیجہ ہوتی تھی۔ ''ذہنِ جدید'' کے اداریے ان کی حقیقت بیانی اور صاف گوئی کے مظہر ہوا کرتے تھے۔ اپنی تخلیقات کے لیے وہ کبھی اپنا نام ''زبیر رضوی'' اور کبھی اس کا مخفف لفظ 'ز۔ر' استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر و بیشتر تحریریں ''ذہنِ جدید'' کے مخفف لفظ 'ذ۔ج' کے نام سے لکھی ہیں۔ بڑی حق تلفی ہوگی اگر رسالے کی مدیر جمشید جہاں کا ذکر نہ کیا جائے۔ زبیر رضوی کی شریکِ حیات کا کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ رسالے کے تئیں اپنے فرائض اور خدمات بہ احسن خوبی انجام دیتی رہیں۔ اگر ان کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید ہی یہ رسالہ منزلِ جاوداں کی جانب گامزن ہوتا یا جاہِ منزلت کا عظیم مقام حاصل کر پاتا۔

ادب اور فنون کی متنوع جہات کا پہلا سمت نما جریدہ ''ذہنِ جدید'' ایک تحریک کا نام ہے اور زبیر رضوی نے اسے ایک تحریک کی مانند ہی چلایا ہے۔ اس رسالے نے نئی نسل کی ذہن سازی میں نمایاں کردار نبھانے میں سرگرم حصّہ لیا ہے۔

پاکستان کے ایک ادیب اکبر حمیدی لکھتے ہیں:

''ذہنِ جدید زندہ، جیتا جاگتا اور سانس لیتا ہوا، باتیں کرتا ہوا، ذہن سے مکالمہ کرتا ہوا پرچہ ہے۔''

ڈاکٹر شہاب اختر شہاب یوں رقمطراز ہیں:

''ذہنِ جدید بالکل ہی 'اندردھنش' کے رنگوں کی طرح ہے جو اپنی خوبصورتی سے سبھی کی نظروں کو اپنی اور کھینچ لیتا ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں خوشی بھر دیتا ہے۔ ایک سے ایک رنگ، ایک سے ایک خوبصورت، ساتوں میں کوئی کم نہیں جس کو دیکھیں وہ اچھا لگتا ہے۔''

سطور بالا میں پیش کیے گئے تاثرات راقم الحروف کو پسند آئے۔ اس لیے انھیں من وعن پیش کرنے کی سعادت کر رہا ہوں۔ اسی طرح ہزاروں قارئین ادب نے ''ذہنِ جدید'' پر قلم چلانا اپنا باعثِ افتخار سمجھا۔ اس کا پورا کریڈٹ (Credit) مرتب رسالہ کو ہی جاتا ہے۔ اس طرح زبیر رضوی ادبی صحافت کے بنیاد گزار صحافی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ جنھوں نے بقول ڈاکٹر وارث علوی کے ''نیاز فتح پوری کی طرح اپنے قلم کو پرچے کا ایندھن بنا دیا تھا۔'' جس طرح نیاز فتح پوری نے ''نگار'' محمد طفیل نے ''نقوش'' اور شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شب خوں'' کے ذریعے صحافت کے معیار کو بلندی عطا کی۔ اسی طرح زبیر رضوی نے صحیح معنوں میں ''ذہن جدید'' کے ذریعے ادبی صحافت کی بنیاد رکھی اور اس کے معیار کو وسعت اور بلندی عطا کی۔

''ذہن جدید'' کی طباعت و کتابت بھی بہت عمدہ اور اعلیٰ معیار کی ہوتی تھی۔ غلطیوں کی گنجائش سے پاک یہ رسالہ ہمیشہ قارئین کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب رہا۔ رسالے کا ہر شمارہ ایک مضبوط جلد، ایک نیا رنگ اور ایک نئی دلکشی ساتھ لے کر آتا۔ چند ایک شماروں کو چھوڑ کر ''ذہنِ جدید'' کے سرورق پر معروف شاعروں و ادیبوں، رقاصاؤں اور آرٹ وغیرہ

کی جاذبِ نظر تصویریں ہمیشہ قارئین حضرات کے دل کو موہ لیتی تھیں۔ جیسے رسالے کے دسویں شمارے کا سرورق بابری مسجد مسمار کرنے والوں کا پورا احوال بیان کرتا ہے۔ اس شمارے میں ایک گوشہ جلتے چراغ بجھانے والوں کی مذمت میں بعنوان ''ادیبوں نے کہا'' شامل کیا گیا ہے جس کا ایک صفحہ ادیبوں کے دستخط کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ ''ذہن جدید'' کی رسائی قارئین تک بڑی آسانی سے ہوتی تھی کیونکہ اس کی قیمت کبھی بیس، کبھی پچیس، کبھی چالیس، کبھی پچھتر اور کبھی سو روپے رہی۔ جو اس رسالے کی ضخامت اور اس کے معیار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ زیادہ نہیں تھی۔ رسالہ ''مکتبہ ذہن جدید'' سے آراستہ و پیراستہ ہوتا تھا۔ جو کہ خود مرتب رسالہ کا اپنا پبلشنگ ہاؤس تھا۔

مجموعی طور پر زبیر رضوی ''ذہن جدید'' کے ذریعے چھبیس برسوں تک ادبی تفریح کا سامان فراہم کرتے رہے، لیکن افسوس صد افسوس! قارئین حضرات کے ذہن و دل پر طاری ہونے والا رسالہ ''ذہن جدید'' اب انھیں پڑھنے کو نہیں ملے گا۔ کیونکہ رسالے کے بانی، رہنما، سرپرست، نگراں، مرتب زبیر رضوی اب ہمارے درمیان نہ رہے۔ 20 ر فروری 2016 کو اُنھوں اس جہانِ فانی کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔ اردو زبان و ادب کی آبیاری کرنے والے، آرٹ، ثقافت، تہذیب، فلم، تھیٹر، مصوری وغیرہ کے علمبردار کہلائے جانے والے اس لی جنڈ کے آخری الفاظ ذہن نشین کیجیے:

''میں سسکیاں لے کر رونے کا قائل نہیں، درد جب حد سے سوا ہوتا ہے تو آنکھیں نم کر لیتا ہوں۔''

# خواتین کی خودنوشتوں کے تجزیوں کا تجزیہ

اردو زبان وادب کے افق پر ابتدا سے ہی ایسے تابناک ستارے جنم لیتے رہے ہیں جنھوں نے زندگی بھر اس زبان کی آبیاری کی۔ انھوں نے اپنے مال ومتاع کو اس زبان کی نشو ونما کی خاطر لٹا دیا، قلمی تعاون کے ساتھ ساتھ وقت آنے پر اس کا دفاع بھی کیا۔ بعض اپنے پیچھے اتنا سرمایہ چھوڑ گئے کہ آج بھی لوگ اُس سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ چند اہلِ قلم ایسے تھے جن کے روشن مستقبل کی راہیں ہموار تھیں، جو زندگی کے کسی بھی میدان میں اپنا لوہا منوا سکتے تھے۔ لیکن اردو زبان کی محبت نے انھیں ہمیشہ کے لیے اپنا گرویدہ بنالیا۔ اس زبان میں انھیں آسودگی ملی اور روزی روٹی کے مسائل بھی حل ہوئے۔ اس طرح اردو زبان ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ اردو کے فروغ، ترقی اور اس کی بقا کے لیے اِن بزگوں نے کیا کیا جتن نہ کیے اور کون کون سے پاپڑ نہ بیلے۔ باوجود اس کے وہ اعلیٰ وارفع مقاصد کے لیے ہمیشہ ہمہ تن مصروف رہے۔ ان کے کارنامے اس قدر مہتم بالشان، لائقِ صد احترام اور قابلِ مستحسن ہیں کہ آج تک حلقۂ اربابِ سخن اور اہلِ بصیرت حضرات ان کی مثالیں پیش کرتے آئے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیچھے جو اثاثہ چھوڑا وہ ہماری تاریخ کا اہم سرمایہ ہے۔ ان کے علمی وادبی، تخلیقی وتنقیدی اور تحقیقی سرمایے سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ اردو زبان پر ان کے بہت احسان ہیں۔ پھر بھی غالبؔ کا یہ مصرعہ ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'' ان پر صادق آتا ہے۔ ہمارے متقدمین نے اپنا احسان اور حق جتانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ان کا محض ایک ہی نصب العین تھا اور وہ اردو کو روشن مستقبل کی طرف گامزن کرنا اور اس کی بحالی کے لیے عمر بھر کوشاں رہنا۔ ان کی

راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہوگئیں لیکن ان کے عزم واستقلال کے سامنے سب رکاوٹیں چکنا چور ہوئیں۔ کسی روشن خیال شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

حقیقتاً ایسے لوگوں کی خدمات ہمارے لیے قابلِ تقلید ہیں اور باعث افتخار بھی۔ آج بھی اردو زبان وادب میں ایسے معماروں کی کمی نہیں ہے۔ جی ہاں! حقانی القاسمی میری اس تمہیدی گفتگو سے قطعی الگ نہیں۔ ان کی شخصیت اور ان کے کارنامے متنوع ہیں اور ناقابلِ فراموش بھی۔

حقانی القاسمی کا نام عہدِ حاضر کے مشہور ومعروف ناقدین میں ہوتا ہے۔ تحقیق، تنقید، تخلیق اور ادبی صحافت میں وہ اہم کام انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی قابلیت، محنت، لگن اور جانفشانی سے ادبی صحافت کا بھرم قائم رکھا۔ حقانی القاسمی ''استعارہ'' کے معاون مدیر بھی رہے ہیں جو صلاح الدین پرویز کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ''بزمِ سہارا'' کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ آج کل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ادارتی شعبے سے ان کی وابستگی ہے۔ اس کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کے کئی رسائل وجرائد کے مجلسِ مشاورتی بورڈ کے ممبر اور سرپرست کی حیثیت سے بھی اپنی ذمہ داری خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

یہ کہنے میں کیسا باک کہ حقانی القاسمی ایک معتبر تنقید نگار کے ساتھ ساتھ ادب کے ایک اچھے کارگزار صحافی بھی ہیں اور ادبی صحافت میں انھیں ایک اچھا خاصا تجربہ حاصل ہے۔ جس طرح ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اسی طرح ان کے اور ادبی صحافت کے درمیان ایک مربوط، گہرا اور مستحکم رشتہ قائم ہے۔ اردو زبان کی فلاح و بہبود اور اپنے ذوق و شوق اور جنون کو پروان چڑھانے کی خاطر انھوں نے مزید ایک ایسے رسالے ''اندازِ بیاں'' کا اِجرا کیا جو یقیناً اپنے آپ میں ایک منفرد کارنامہ ہے۔ حقانی القاسمی کی ادارت میں شائع ہونے والا ایک موضوعی مجلّہ ''اندازِ بیاں'' کا اوّلین شمارہ جو ''خواتین کی خودنوشتوں کے

جائزے پر محیط'' ہے۔انھوں نے یہ مجلّہ ''صلاح الدین پرویز کی یاد میں'' جاری کیا ہے۔مدیر رسالہ کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کی کتابیں ہوں یا تحقیقی وتنقیدی مضامین،ان کے عنوانات بالکل انوکھے طرز کے اور ایک نئی روش اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ان کا ہر کام انفرادی نوعیت کا ہے۔کتاب ''ادب کولاژ'' ہو یا ''تنقیدی اسمبلاژ'' ہو یا ''طوائفِ دشت جنوں'' وغیرہ۔ایسے موضوعات قاری کو تجسس اور تذبذب میں ڈال دیتے ہیں،سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور ورق گردانی کے لیے اکساتے رہتے ہیں۔انتساب کے بعد ''باغِ شفقت''، ''شجرِ محبت'' اور ''شاخِ الفت'' جیسے عنوانات قائم کیے گئے ہیں جن پر تین صفحات سیاہ کیے گئے ہیں۔ان تین صفحوں پر ادبا وشعرا، ناقدین، محققین، مصنفین، مولفین، علما، فضلا، دانشواران، صحافی وغیرہ غرض اردو زبان کے کل 136 خدمت گزاروں کے نام گنوائے گئے ہیں اور اس فہرست کا انتخاب راقم الحروف کے مطابق تجربے اور عمر کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ان کا تعلق ہندوستان کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک سے ہے اور اپنی اپنی جگہ سب اردو زبان کے ہی پالن ہار ہیں۔اس طرح پہلے دوسرے اور تیسرے صفحے پر بالترتیب 46،46 اور 44 اشخاص کے نام مندرج ہیں۔ظاہر ہے کہ حقانی القاسمی کا یہاں پر ان ادبا کے نام گنوانا یا ان ناموں سے آشنا کرانا مقصد ومدّ عا نہیں بلکہ میرے خیال سے ان کے تئیں اپنی شفقت،محبت،قربت اور عقیدت کے پھول پیش کرنا بنیادی مقصد ہوگا۔

حقانی القاسمی نے فہرست مضامین کو ''دریچے'' کا عنوان دیا ہے اور یہ عنوان ایک نئی راہ کی صداقت بھی بیان کرتا ہے۔ادبی دنیا میں ابھی تک کوئی ایسا رسالہ وجود میں نہیں آیا ہے جس نے خواتین کی خودنوشت نگاری کے فن کی طرف توجہ دی ہو یا اس موضوع پر اتنا ضخیم خصوصی یک موضوعی شمارہ شائع کیا ہو۔اس سے پہلے محمد طفیل نے جون 1964 میں ''نقوش'' لاہور کا ایک ضخیم آپ بیتی نمبر نکالا تھا لیکن اس میں بھی خواتین خودنوشت نگاروں کو خاص نمائندگی نہیں ملی تھی۔اس اعتبار سے زیرِ نظر شمارہ خواتین فنِ خودنوشت نگاری کے باب میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔اس یک موضوعی مجلّہ کے اوّلین شمارے میں مقامی اور بین الاقوامی سطح کے مختلف خودنوشت نگاروں کی خودنوشتوں پر مشتمل چوبیس تجزیاتی مضامین کو

چھ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔فہرست میں دائرے کی علامت میں اس کے ابواب یا حصوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس شمارے میں ملک اور بیرون ملک کے قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں۔جن میں چند ایک نوآموز ہیں اور باقی عرصۂ دراز سے لکھتے رہے ہیں۔لیکن مضامین سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نیا ہو یا پرانا ہر مضمون نگار نے اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی کامیاب سعی کی ہے۔

شمارے کی ابتدا حقانی القاسمی کے وقیع اور پُر مغز اداریے ''جنوں زاویہ'' سے ہوتی ہے۔اداریہ کے آغاز میں ہی قاری کو اپنی فکر انگیز بصیرت سے حیرت و استعجاب میں ڈال دیتے ہیں، مدیر رسالہ لکھتے ہیں:

> ''کانٹے میرے لیے بہت معنی رکھتے ہیں کہ یہ زندگی کے تحرک کی علامت ہیں۔ان ہی سے زندگی میں امکانات کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور یہی نئی منزلوں سے آشنا بھی کرتے ہیں۔پھولوں کے درمیان زندگی تو ایک نقطہ انجماد پر ٹھہری جاتی ہے مگر کانٹے زندگی کے نئے راستوں کی جستجو کے لئے مہمیز کرتے ہیں۔''

حقانی القاسمی کے اس مذکورہ بالا اقتباس اور اس کے بعد کی کچھ سطور سے اس بات کا اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں ہوگا کہ موصوف نے انہی خاردار اور پُر پیچ راستوں سے گزر کر اپنی زندگی میں کامیابی کے پھول کِھلائے ہیں۔آج حقانی القاسمی کا گلستانِ ادب میں جو نام اور مقام ہے اس سے ہم نا آشنا نہیں۔ان کے ادبی کارنامے ہمارے لیے قابلِ رشک ہیں۔بارہ صفحات کے اپنے اداریے میں انھوں نے اولاً ''اندازِ بیان'' کے وجود میں آنے کے محرکات بیان کیے ہیں۔انھوں نے جس دانشمندی، ایمانداری اور وسیع و عمیق مطالعے کی بنیاد پر خواتین خودنوشتوں کا جائزہ لیا ہے وہ انہی کے مطالعہ کا خاصہ ہوسکتا ہے۔موصوف نے اس اداریے میں نہ صرف اردو خواتین خودنوشت نگاروں کی خودنوشتوں بلکہ ملکی اور غیر ملکی سطح پر مختلف زبانوں میں رقم کی گئی منظوم و منثور خودنوشتوں پر بھی مفصّل روشنی ڈالی ہے۔''اندازِ بیان'' کے یک موضوعی مجلّہ کا ابتدائی شمارہ ہی خواتین قلم کاروں سے منسوب کرنا اس بات کا بین

ثبوت ہے کہ حقانی القاسمی کو عورت ذات کے ساتھ ہمدردی ہے۔ وہ انھیں احساسِ کمتری سے نکال کر ان کی شعوری آگہی اور بیداری کی طرف لاتے ہیں اور معاشرے میں ان کے صحیح اور جائز مقام اور مرتبے کا اعلان کرتے ہیں۔ اس شمارے کے ذریعے مدیر موصوف نے عورتوں کی کھوئی ہوئی شناخت کو نمایاں کر کے ان کی حیثیت کو بحال کرانے کی عمدہ سعی کی ہے۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ تمام زبانوں میں لکھی گئی خواتین کی آپ بیتیوں کے حوالے سے گفتگو ہوتا کہ نسائی دکھ، استحصال، مزاحمت، مظلومی، لاچاری، ظلم و جبر اور حتجاج کے عالمی منظر نامے سے آگہی ہو سکے۔

اداریے کے بعد مضامین کے لیے مشترکہ طور پر ایک عنوان ''گلشن خیال'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس اولین شمارے میں فنِ خودنوشت نگاری، مختلف زبانوں میں خواتین قلم کاروں کی خودنوشت نگاری، خواتین خودنوشتوں کے تجزیے وغیرہ پر سیر حاصل مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ حقانی القاسمی تخلیقی اور اختراعی ذہن کے مالک ہیں اور مذکورہ سے شمارے میں ان کی تخلیقی ذہن کی اُپج خاص طور پر نظر آتی ہے۔ شمارے میں شامل ہر مضمون کے ابتدائی صفحے کے ایک حصے میں مدیر رسالہ نے مضمون نگار کا سرسری طور پر جس طرح تعارف کرایا ہے۔ اس سے ایک تو مضمون نگار کی اہلیت کا پتہ چل جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ اردو میں ان کی فعالیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ شمارے کا پہلا مضمون ''خودنوشت کا فن'' رحمت یونس کا تحریر کیا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے ابتداً چند خودنوشتوں اور ان کے تخلیق کاروں کے نام پیش کیے ہیں۔ جن میں ''اپنی تلاش میں'' (کلیم الدین احمد)، ''جہانِ دانش'' (احسان دانش)، ''زرگزشت'' (مشتاق احمد یوسفی)، ''آپ بیتی'' (عبدالماجد دریابادی)، ''ورودِ مسعود'' (مسعود حسین خان)، ''گھنگھرو'' (قتیل شفائی)، ''دیواروں کے بیچ'' (ندا فاضلی)، ''بری عورت کی کتھا'' (کشور ناہید)، ''گردشِ پا'' (زبیر رضوی) وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے مطابق ان میں اکثر آپ بیتیاں ایسی ہیں جو فکشن سے بھی زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھی گئیں اور آج بھی مطالعے کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ مقالہ نگار نے خودنوشت کی مختلف تعریفات پیش کرنے کے بعد کلی طور پر اس سے جو تعریف مُراد لی ہے وہ یوں ہے کہ ''خودنوشت سوانح حیات کسی

انسان کی وہ روداد ہوتی ہے جسے وہ خود لکھتا ہے۔ جس میں انسان کے نہاں خانے روشن ہوتے ہیں۔ اس کے پوشیدہ کوائف باہر آتے ہیں اور باہر سے دکھائی دینے والا شخص بدلا ہوا نظر آنے لگتا ہے۔'' رحمت یونس کا یہ مضمون معلومات سے پُر ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے کئی سوالات اٹھائے ہیں کہ کس کس پیمانے پر ہم خودنوشت سوانح حیات کی پرکھ کر سکتے ہیں۔ مزید کئی پہلوؤں کی طرف ہماری توجہ مرکوز کی ہے کہ خودنوشت ایک فن ہے۔ اس کے اپنے مقاصد، اپنے فنی تقاضے اور اوصاف ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر اسے خودنوشت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جب کہ ایک مصنف کی ڈائری میں، تذکروں اور یادداشتوں میں اپنی زندگی سے متعلق لکھے ہوئے حالات کو خودنوشت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ خودنوشت کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر نہیں لکھے جاتے ہر چند کہ اس میں خودنوشت کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ خودنوشت نگار خودنوشت لکھتے وقت اس صنف کے مقاصد کی پیروی کرے۔

مختلف خودنوشت نگاروں نے اپنی اپنی طرز پر خودنوشتیں تحریر کی ہیں۔ اگرچہ خودنوشت میں سوانح نگار کا اپنا مقصد و مدعا ہوتا ہے لیکن ہمیں ان کا مطالعہ مقصد کو تلاش کرنے کی غرض سے نہیں کرنا چاہیے۔ یہ فن صداقت کے بیان کا متقاضی ہے اور جب ادب زندگی کا ترجمان ٹھہرا تو اس میں حقیقت اور سچائی کا انکشاف ہونا لازم ہے۔ لیکن اپنی زندگی کی سچائی کو نمایاں کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ اکثر خودنوشت سوانح نگاروں نے اپنی زندگی کے تلخ تجربات کو بیان کرنے سے گریز بھی کیا ہے۔ بعض نے صرف مثالی اور مثبت پہلوؤں کو ہی اجاگر کیا۔ جس سے اگرچہ کچھ لوگوں کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے ہم اس شخصیت سے محروم ہو جاتے ہیں جو اس کی اصل ہوتی ہے۔ رحمت یونس کے مطابق جو خودنوشت نگار اپنی خودنوشت میں زندگی کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں سے نمایاں کرتے ہیں۔ وہ ان کے نزدیک اس صنف کا سب سے بہترین، مناسب، موزوں اور کامیاب انداز ہے۔ موصوفہ نے خودنوشت کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی وجوہات بھی بیان کی ہیں۔ ان کے مطابق خودنوشت میں فنی حسن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ جو خودنوشت سوانح ادیبوں اور تخلیق کاروں کے قلم سے نکلتی ہیں ان میں ادبی حسن یا فنی وصف اکثر و بیشتر

پایا جاتا ہے۔لیکن کچھ خودنوشت اس وصف سے عاری بھی ہوتی ہیں۔یہ ضروری نہیں کہ ادیب کی خودنوشت میں ہی فنی حسن مل جائے بلکہ بعض خودنوشت نگار ادیب نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی خودنوشت میں فنی حسن کا جادو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اس لیے خودنوشت چاہے جس کی بھی ہو اگر اس میں فن کاری نہیں اور لطف و انبساط کا سامان نہیں تو اس کو ادب کے زمرے میں رکھنا آسان نہیں ہوگا۔اس مضمون کے اخیر میں خودنوشت کے محرکات بھی بیان کیے گئے ہیں۔الغرض رحمت یونس کے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں خودنوشت کے فن پر جس گہرائی اور گیرائی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔اس سے اس فن کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے۔

''اندازِ بیان'' کا دوسرا مضمون پاکستان کے نامور محقق، ناقد اور منتظم راشد اشرف کا تحریر کردہ ہے۔خود نوشت کے حوالے سے ان کا کام بھی قابلِ ستائش ہے۔ ان کا مقالہ'' پاک و ہند کی خواتین قلمکاروں کی تحریر کردہ خودنوشتیں'' پر مشتمل ہے۔جس میں انھوں نے اپنی تحقیق کے مطابق ہند و پاک کی کم و بیش اکیاسی (81) خواتین خودنوشت نگاروں کی خودنوشتوں کے نام گنوائے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ان کے تخلیق کاروں کے نام، ناشرین کے نام اور اس کی سن اشاعت کا اندراج بھی ملتا ہے۔یہ مضمون اگر چہ نہایت مختصر ہے لیکن بے حد معلوماتی اور مفید ہے۔''خواتین کی خودنوشت سوانح عمریاں'' شبانہ سلیم کا تحریر کردہ مضمون ہے۔ حقانی القاسمی نے جس طرح مصنفہ کے ادبی بیک گراؤنڈ سے متعارف کرایا ہے اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ نے اپنا تحقیقی مقالہ خواتین کی خودنوشتوں کے حوالے سے ہی قلم بند کیا ہے۔اس مضمون میں جن خودنوشتوں کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں ''نیرنگ بخت'' از وزیر نواب سلطان جہاں بیگم، ''ایک ایکٹریس کی آپ بیتی'' از بملا کماری، ''پردے سے پارلیمینٹ تک'' از شائستہ سہروردی اکرام اللہ قابل ذکر ہیں۔مضمون کا آغاز موصوفہ نے نواب سلطان بیگم کی خودنوشت ''نیرنگ بخت'' سے کیا ہے۔یہ خودنوشت پہلی بار 1942 میں شائع ہوئی ہے۔اس خودنوشت کی مصنفہ کا تعلق بیگمات بھوپال سے ہے۔جن کی سرشت میں دینداری، پاکیزگی، سچائی، نفاست پسندی، بلند اخلاقی اور اسلامی ضابطہ اخلاق کی پیروی کا مزاج تھا اور اسی کے

باوصف دور دور تک ان کا شہرہ تھا۔ یہ خودنوشت تین خاندانوں کے باہمی رشتوں کی کہانی ہے۔ جو کتاب کی مصنفہ کی پوری زندگی نہیں بلکہ صرف ایک حصّے کا احاطہ کرتی ہے۔نواب سلطان بیگم نے اس کو تین حصّوں ''تزکِ سلطانی''، ''گوہر اقبال'' اور ''اختر اقبال'' میں منقسم کیا ہے۔ جس کے آخری حصّے میں مصنفہ کے حالات و کوائف نمایاں ہوتے ہیں۔ شبانہ سلیم نے ''نیرنگِ بخت'' کی مصنفہ کی ہمہ جہت شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کو اس مضمون میں سمیٹنے کی ایک کامیاب سعی کی ہے۔ بملا کماری عرف پریما کی خودنوشت ''ایک ایکٹریس کی آپ بیتی'' پر بھی موصوفہ نے کئی جذباتی اور اثرانداز کرنے والی باتیں رقم کی ہیں۔ جس میں انھوں نے اولاً فلموں میں کام کرنے والی اداکاراؤں اور آج کی اداکاراؤں سے متعلق انسانی سوچ کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کی عبرتناک زندگی کا بھی خاکہ کھینچا ہے۔خصوصاً بملا کماری کی عبرتناک کہانی جان کر انسان بے ساختہ طور جذباتی ہو جاتا ہے۔چھبیس صفحات کے اس مضمون میں موصوفہ نے چودہ صفحات شائستہ سہروردی اکرام اللہ کی آپ بیتی ''پردے سے پارلیمینٹ تک'' پر صرف کیے ہیں۔اس سوانحی خونوشت کی مصنفہ سیاسی، سماجی، قانونی اور اصلاحی میدانوں کی ایک بہترین خدمت گزار خاتون تھیں۔ جو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی و مذہبی تعلیمات سے بھی آراستہ تھیں۔اگرچہ انھوں نے ایک قدامت پسند ماحول میں آنکھیں کھولیں تھی لیکن ان کی جبلی صلاحیتوں کی بنیاد پر قدرت نے انھیں بے شمار ترقیوں سے نوازا۔جس کی وجہ سے آج ان کا نام اور مقام برصغیر کی بیسوں صدی کی خواتین میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہوگیا ہے۔موصوفہ نے مصنفہ کی خودنوشت کے مختلف اقتباسات کا حوالہ دے کر ان کی شخصیت، زندگی، خدمات اور بحیثیت ایک انسان بصیرت افروز معلومات فراہم کی ہے۔اس مضمون سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی شخصیت دنیا کی باقی خواتین خاص طور پر مسلم خواتین کے لیے باعثِ تحریک ثابت ہورہی ہے۔

محمد احمد سبزواری پاکستان کے ایک معزز، بزرگ اور معمر ترین قلم کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا اصل تعلق شعبۂ معاشیات سے ہے۔لیکن ادب کے ساتھ گہری اُنسیت رکھتے ہیں جس کا اندازہ ان کی اردو زبان پر لکھی گئی کئی کتابوں سے ہوتا ہے۔انھوں

نے بھی اپنا مضمون ''خواتین کی خودنوشت سوانح عمریاں'' پر لکھا ہے۔شبانہ سلیم نے بیگمات بھوپال کی جس خودنوشت پر تبصرہ کیا تھا۔موصوف نے اپنے مضمون میں اس کا تفصیلی تعارف پیش کر کے اُس کو اور واضح کر دیا ہے۔موصوفہ کی طرح انھوں نے بھی چار بیگمات بھوپال میں تین کو اردو زبان کا پروردہ قرار دیا ہے۔ پہلے نواب سکندر بیگم (تزکِ سکندری) پھر ان کی بیٹی نواب شاہجہاں بیگم (تاج الاقبال) اور آخر میں ان کی بیٹی نواب سلطان جہاں بیگم (تزکِ سلطانی، گوہر اقبال اور اختر اقبال) جیسے خودنوشت نگاروں کی خودنوشتوں پر موصوف نے دانشورانہ تذکرہ کیا ہے۔۔اس مضمون میں بیگمات کے کارناموں سے ایک قاری بخوبی روشناس ہو جاتا ہے۔جن خودنوشت نگاروں کی آپ بیتیوں کا مذکورہ مضمون میں ذکر کیا گیا ہے ان میں شائستہ سہروردی کی خودنوشت، اصغری بیگم کی خودنوشت، ادا جعفری کی خودنوشت (جو رہی سو بے خبری رہی) اور (ہم ساتھ تھے)، ڈاکٹر شاہ فاطمہ شاہ کی خودنوشت (سن شائنز اینڈ شیڈوز) پر سرسری روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب اول کے دیگر مضامین میں ''عربی زبان میں خودنوشت'' از ابرار احمد اجراوی اور ''مراٹھی زبان میں خودنوشت'' از صادقہ نواب سحر خودنوشت کے فن کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔اول الذکر مضمون میں عالمی شہرت یافتہ زبان عربی میں خواتین خودنوشت نگاروں کی آپ بیتیوں اور موخر الذکر میں مقامی سطح کی زبان مراٹھی میں تخلیق کی گئی آپ بیتیوں کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔اس طرح دونوں مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ابرار احمد اجراوی کے مطابق عرب ممالک میں فنِ خودنوشت نگاری باقی ممالک کی بہ نسبت بہت دیر میں وارد ہوئی اور عمومی طور پر مردوں کے ذریعے ہی یہاں اس صنف کا آغاز ہوا۔نوال السعدی پہلی عرب خاتون ادیبہ ہیں۔جنھوں نے 1965 میں ''مذکرات طبیبہ'' لکھ کر عرب میں خواتین خودنوشت نگاری کو تحریکی شکل دے کر اس کی سنگِ بنیاد رکھی۔فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون کی بنیاد جن عرب خواتین خودنوشت نگاروں پر رکھی ان میں ہدی شعراوی، نبویہ موسی، عائشہ عبدالرحمٰن، فدوی طوقان، داعیہ، زینب غزالی، نوال سعدادی، لیلیٰ عسیران، لیلیٰ عثمان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔موصوف لکھتے ہیں کہ مغربی ممالک کی خواتین کے

مقابلے میں عرب خواتین تخلیق کاروں کو اپنی زندگی کے سچے تجربات شیئر کرنے کے باوجود وہ پذیرائی نہ مل سکی، اس میں قصور ہمارے سماجی معیار اور صنفی تفریق کا ہی ہے۔ جب کہ عورتیں اپنے خیالات و جذبات کے اظہار میں مردوں سے زیادہ سچی اور کھری واقع ہوئی ہیں۔ وہ حقیقی خیالات کے ساتھ ملمع سازی نہیں کرتیں، ان کی خودنوشت حقیقت و صداقت اور فنی لوازم کا ایسا مجموعہ ہے، جنھیں ادب کی دنیا میں زیادہ بڑا مقام مل سکتا ہے۔ اور وہ ادب پارہ بننے کی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے۔ ان کا مذکوہ مضمون بہت فکر انگیز اور بلیغ ہے۔ صادقہ نواب سحر صاحبہ کا مضمون معنی آفرینی سے پُر ہے اور چونکہ مصنفہ اردو اور مراٹھی دونوں زبان کی مشہور و معروف ادیبہ ہیں۔ اس لیے مضمون کے ساتھ ان سے جس انصاف کی امید کی جا سکتی تھی، انھوں نے اُس سے زیادہ کا حق ادا کیا ہے۔

اس شمارے کے دوسرے باب میں تین مضامین شامل ہیں۔ اس باب کا پہلا مضمون ''نوائے زندگی: سوانحی و تخلیقی بیانیہ'' عشرت ظفر کا رقم کردہ ہے۔ ''نوائے زندگی'' پروفیسر ساجدہ زیدی کی 648 صفحات پر مبنی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ عشرت ظفر کے مطابق اس خودنوشت کے پانچ سو چھیانوے صفحات ایسے ہیں جو ساجدہ زیدی کے قلم سے طلوع ہوئے ہیں جب کہ اول و آخر کے کم و بیش پچاس صفحات ان کی بیٹی زویا زیدی نے لکھے ہیں جو کہ اس کی مرتب بھی ہیں، اس خودنوشت کو ساجدہ زیدی کی وفات کے بعد دہلی اردو اکادمی نے شائع کیا۔ ابتدا میں انھوں نے ساجدہ زیدی کے احوال و کوائف سے روشناس کرایا ہے۔ اس خودنوشت میں دو ابواب ہے جن میں کل 57 عناوین ہیں، پہلے میں 24 اور دوسرے باب میں 33 عنوانات جگہ پا گئے ہیں۔ مصنفہ چونکہ شاعری بھی کر چکی ہیں اور فکشن بھی لکھ چکی ہیں۔ اس لیے خودنوشت میں ان کے اس فنی ہنرمندی کی جلوہ گری خوب نظر آتی ہے۔ اس خودنوشت کے تجزیے میں مضمون نگار کی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت کی پرکھ کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ مختلف اقتباسات کی روشنی میں انھوں نے خودنوشت کے ساتھ حتی الامکان انصاف برتنے کی کوشش کی ہے۔ عشرت ظفر لکھتے ہیں کہ ''نوائے زندگی'' محض خودنوشت نہیں ہے، واقعات کا انبار عظیم نہیں ہے بلکہ مصنفہ کے احساسات اور نظریات کی جلوہ جگری بھی

ہے۔''موصوف نے اُن سبھی واقعات، حادثات، سانحات اور مصنفہ کی زندگی میں رونما ہونے والے خوش گوار لحات کا تجزیہ عرق فشانی سے کیا ہے۔زہرا داؤدی کی خودنوشت ''گرداب کی شناوری اورلذت صحرانوردی'' پر رضیہ حامد نے مضمون تحریر کیا ہے۔حقانی القاسمی کے ان پر تحریر کیے گئے تعارفی کلمات سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ کئی کتابیں تصنیف کرچکی ہیں اور رسالہ''فکروآگہی'' کے ادارتی فرائض بھی انجام دے چکی ہیں۔ جوعلم وادب کے میدان میں ان کے تجربے کونمایاں کرتا ہے۔موصوفہ نے زہراداؤدی کی خودنوشت پرمبسوط اور پُر مغز مقالہ تحریر فرمایا ہے۔جس میں انھوں نے زہرا داؤدی کا مختصر تعارف، ان کے خاندانی احوال،اس عہد میں اسکول میں لڑکیوں کی تعلیم کے حصول کے تئیں سماج کی تنگ نظری اور زہرا پر اس کا اثر،ان کی تعلیم وتربیت میں والدین اورشوہر کا کردار،شادی کی رسم، مارکسزم سے لگاؤ اور اس کی سرگرمیوں میں شمولیت،خودنوشت میں ماکسزم کا ذکر،شوہر اور بچوں کی ذمہ داری،شوہر کی پاکستان ہجرت،شوہر کا کینسر جیسی جان لیوا بیماری میں مبتلا ہونا، یکے بعد دیگرے شوہر،ماں اور بھائی کا انتقال،کالج میں لیکچرار کی نوکری، اشترا کی خیالات اور پیپلز پارٹی سے وابستگی کے سبب نوکری سے برطرف کیے جانے کا ذکر،47 کے فسادات کی چشم دید گواہ، پٹنہ سے اپنی وابستگی ، پاکستان کی ہجرت، پاکستان میں مختلف سرگرمیوں میں شرکت، ہالینڈ کا سفر،ان کی سادگی ، بے باکی، وسیع ذہنیت،خوداعتمادی، ہمدردی، انسان دوستی وغیرہ کا تجزیہ مضمون نگار نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔غرض کہ اس مضمون سے زہراداؤدی کی خودنوشت قاری کے سامنے بالکل آئینہ ہوجاتی ہے۔اس حصے کا اگلا مضمون''دوآپ بیتیاں'' (سلسلۂ روز وشب ، یاد کی رہ گزر) کے عنوان سے درج ہے۔''سلسلۂ روز وشب'' ڈاکٹر صالحہ عابد کی اور''یاد کی رہ گزر'' شوکت کیفی کی دوالگ الگ خودنوشت سوانح حیات ہیں۔جس کوعذرانقوی نے موضوعِ بحث بنایا ہے۔اول الذکر خودنوشت سے اردو کا کون قاری آشنا نہ ہو۔یہ خودنوشت 1984 میں شائع ہوئی تھی۔اردو کو پچاس سے زائد کتابوں سے نوازنے والی ڈاکٹر صالحہ عابد حسین نے اس خودنوشت کو پچیس ابواب میں منقسم کیا ہے اورعذرانقوی نے اس کے ہر باب پر خامہ فرسائی کی ہے۔جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موصوفہ نے اس

آپ بیتی کا چیدہ چیدہ مطالعہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین اس مضمون سے ضرور حظ اُٹھائیں گے۔ ''یاد کی رہ گزر'' مشہور شاعر اور گیت کار کیفی اعظمی کی بیوی اور مقبول فلم اداکارہ شبانہ اعظمی کی ماں شوکت کیفی کی خودنوشت سوانح ہے، ان کی اپنی خود کی پہچان ہے۔ شوکت کیفی نے اپٹا اور مشہور پرتھوی تھیٹر کے ڈراموں میں ایک عرصے تک اداکاری کے جوہر دکھائے اور کئی فلموں میں اپنی فن کاری کا مظاہرہ کیا۔ جتنی ان کی خودنوشت دلچسپ ہے۔ اسی قدر ان پر تحریر کیا گیا مضمون بھی دلچسپی کا موجب ہے۔

''انداز بیاں'' کے تیسرے باب میں جن خودنوشتوں یا آپ بیتیوں کے حوالے سے مضامین لکھے گئے ہیں ان میں ''بدن کی ممنوعہ کتاب'' (انا ٹومی آف مائی اسٹوری) خودنوشت از کملا داس، ''شورش دوراں'' (نسائی جمال کا نفسی انفجار وانقصام) از حمیدہ سالم، ''میرا بچپن'' (میرا بچپن بطور فکشن) از عذرا عباس، ''کاغذی ہے پیرہن'' (کاغذی ہے پیرہن اور مرد اساس معاشرے کا ردِ عمل) از روبی نکہت، ''جو کہا نہیں گیا'' از کسم اَنسل، ''میری بات'' از پروفیسر شملہ مفتی، ''رسیدی ٹکٹ'' (امرتا پریتم کی ''رسیدی ٹکٹ'') از امرتا پریتم، ''جو رہی سو بے خبری رہی'' از ادا جعفری قابلِ ذکر خودنوشتیں اور ان کے تخلیق کار ہیں۔ ان خودنوشتوں پر جن قلم کاروں نے مضامین تحریر فرمائے ہیں ان کے نام بالترتیب فیاض احمد وجیہہ، اکرم پرویز، عبدالسمیع، روبی نکہت، شاہد الرحمٰن، مسرت جان، قمر تبریز اور حقانی القاسمی ہیں۔ فیاض احمد وجیہہ نے بدنام زمانہ ادیبہ کملا داس کی خودنوشت ''مائی اسٹوری'' پر تحیر خیز اور تجسس انگیز مضمون رقم کیا ہے۔ جس میں انھوں کملا داس کی اس کتاب کو ''بدن کی ممنوعہ کتاب'' سے تعبیر کیا ہے۔ قارئین کو کملا داس سے متعارف کروائیں کہ کملا داس ملیالم اور انگریزی کی ممتاز شاعرہ اور فکشن نگار تھیں۔ انھیں 1984 میں نوبل پرائز کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ ان کی خودنوشت سب سے پہلے ملیالم زبان میں 1973 میں شائع ہوئی۔ جب کہ انگریزی زبان میں یہ بایوگرافی 1988 میں چھپی۔ ان کی تحاریر کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ مضمون نگار ''مائی اسٹوری'' کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''کملا کی یہ بایوگرافی Polyphonic متن کی روشن تعبیر ہے۔ دراصل اس

میں کئی آوازوں کا اجتماع ہی نہیں، ان کا اپنا انفراد ہے، امتیاز ہے، جن کو ہم
اس ممنوعہ کتاب میں شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ہاں یہ تمام آوزیں جنسی
کی ہی ہیں۔۔۔اور ان آوازوں کی آمیختا نے ہی کملا کے تخلیقی رنگ
وروپ کو منور کیا ہے۔"

متذکرہ بالا اقتباس سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مضمون نگار نے عرق ریزی اور دیدہ وری سے خودنوشت کا مطالعہ کرکے اس کی حق شناسی کا حق ادا کیا۔انھوں نے مزید لکھا ہے کہ کملا داس نے یاد کے صیغہ میں بچپن اور زندگی کے تجربہ کو لکھا اور کالے گورے کے بھید کو اجاگر کرتے ہوئے والدین کی سوچ کو بھی نمایاں کیا۔اکیس صفحات پر مشتمل ان کا مضمون نہایت قابل مطالعہ ہے۔اکرم پرویز''شورش دوراں'' میں نسائی جمال کا نفسی انفجار و انقصام جیسے پہلو کو اس کے متن، قرأت اور درون میں ڈوب کر روشن کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں لیکن اچھا رہتا اگر خودنوشت نگار کا مختصر تعارف بھی پیش کرتے۔اس خصوصی شمارے میں ادا جعفری کی خودنوشت سوانح حیات کو حقانی القاسمی نے موضوع بنایا ہے۔ابتدا میں اپنا اعمال نامہ پیش کیا جو ہمیں بہت پسند آیا۔کیونکہ کچھ پہلے جانا تھا اور اعمال نامہ سے اور شناسا ہو گئے۔مضمون کی شروعات میں انھوں نے چند مغربی خواتین ادبا کے فیمنزم سے متعلق تحرک خیز اور اثر انگیز تصورات کا خلاصہ پیش کیا ہے۔مغرب کی ان خواتین قلم کاروں سے اخذ شدہ وقعت آمیز خیالات یقیناً موصوف کے مضمون سے صاف طور پر میل کھاتے ہیں۔ان کے مطابق ادا جعفری کی خودنوشت ان کی ذات اور تخلیق کا آئینہ ہے۔مختلف ادبا سے ملاقاتیں، مختلف مشرقی و مغربی ممالک کے اسفار، موجودہ معاشرے میں عورت کا مقام، مرد ذات کا عورت ذات پر ظلم و جبر اور استحصال، عورتوں کو پابند سلاسل بنانا، ادا جعفری کی خودنوشت میں عورتوں کی ترجمانی، اس میں شاعرانہ آہنگ اور موسیقیت پیدا ہونا، مختلف واقعات اور حادثات کا بے ساختہ اور برملا اظہار وغیرہ ادا جعفری کی خودنوشت کی خصوصیات ہیں۔مصنفہ کی خودنوشت سے ان کی زندگی، ماحول اور معاشرے کی بہت ساری باتیں منکشف ہوجاتی ہیں۔حقانی القاسمی ان سب باتوں کا ذکر کرنے کے علاوہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مصنفہ خاندانی

وضع داری کی وجہ سے بہت سی باتیں جو لکھنی چاہیے تھیں، وہ لکھنے سے حذر کرتی ہیں۔ پھر بھی یہ خودنوشت خواتین کی خودنوشتوں میں اہمیت کی حامل ہے۔اس باب کے دیگر مضامین بھی قابل تحسین ہیں۔

''اندازِ بیاں'' کے چوتھے باب میں پہلا مضمون ثریا حسین کی خودنوشت ''آب و رودِ گنگا'' پر محمد فرقان سنبھلی کا لکھا ہوا ہے۔اس مضمون سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ مصنفہ ثریا حسین نے اس کتاب کی خودنوشت ہونے کا نہ تو دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی کتاب میں کہیں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے۔لیکن مصنفہ اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ اس کو احساس ذات کہا جاسکتا ہے جو کہ زندگی کے مختلف ادوار پر مبنی ہے اور جس کو انھوں نے تاریخی اعتبار سے اختصار اور معروضی انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔مگر مضمون نگار نے مختلف مثالوں کے ذریعے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسے خودنوشت کے خانے میں بغیر کسی تذبذب کے رکھا جاسکتا ہے۔ پروفیسر ثریا حسین علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی سابق صدر شعبۂ اردو کے فرائض بھی انجام دے چکی ہیں۔''آب ورودِ گنگا'' میں مصنفہ خود ''راوی'' کے کردار میں نظر آتی ہیں۔ مصنفہ نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار کو جن عنوانات کے تحت درج کیا ہے، مضمون نگار نے انہی عنوانات جیسے ''وادیٔ گنگ وجمن''، ''مدرستہ العلوم 1857''، ''تعطیلات کے شب وروز'' وغیرہ کی روشنی میں ثریا حسین کی زندگی کے مختلف النوع واقعات، حالات، مشاہدات، کارہائے نمایاں اور خدمات پر عمدگی سے تبصرہ کیا ہے۔درخشاں صاحبہ نے صغرا مہدی کی ''حکایت ہستی'' پر قلم آزمائی کی ہے۔جو اپنے آپ میں مفصل بھی ہے اور مکمل بھی۔انھوں نے صغرا مہدی کی داستانِ حیات کو عمدہ سلیقے، مہارت اور اپنے علمی تجربے کی بنیاد پر ''حکایت ہستی'' کی رو سے تجزیہ کرنے کی جاندار کوشش کی ہے۔

یک موضوعی مجلّہ ''اندازِ بیاں'' کے پانچویں حصے میں دو مضامین شاملِ باب ہیں۔ پہلا مضمون اردو کے مقبول اور ممتاز ناول نگار پیغام آفاقی کا ''ثروت اپنے آئینوں کے آئینے میں'' پر مشتمل ہے۔اس میں ثروت النساخان عرف ثروت خان کی کتاب ''شورشِ فکر'' کے آخری باب ''ثروت کی کہانی، میری زبانی'' کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ ثروت

خان کی کوئی خودنوشت سوانح حیات نہیں ہے۔اس لیے اس مضمون میں مذکورہ باب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ثروت خان کی سوانح کے چند اہم گوشوں کو آشکار کیا گیا ہے۔ پیغام آفاقی نے اس مضمون میں ان کی شخصیت کے نمایاں اور امتیازی اوصاف بیان کیے ہیں اور ان کی تخلیقی ہنرمندی اور تنقیدی اعتبار کے ساتھ ساتھ ان کی بے باکی، اخلاص مندی، وضع داری، نڈرپن، تیز فہمی، خوش گفتاری اور خوش تقریری وغیرہ جیسی کئی صفات سے آشنا کیا ہے۔ ''تہمینہ درّانی کی مینڈا سائیں'' سیمیں کرن کا رقم کیا ہوا ایک مؤثر مضمون ہے۔سیمیں کرن کا شمار پاکستان کی عصر حاضر کی ایک اہم افسانہ نگار، ناول نگار اور ناقد کے طور پر کیا جاتا ہے۔انھوں نے تہمینہ درّانی کی خودنوشت ''مینڈا سائیں'' کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔اس خودنوشت کی مصنفہ کی داستانِ زیست کچھ یوں ہے کہ تہمینہ درّانی نے جس مرد کے ساتھ شادی کی، وہ اس کی ساتویں شادی تھی اور خود تہمینہ درّانی کی بھی دوسری شادی تھی۔ یہ مرد بہت بڑا سرمایہ دار، جاگیردارانہ نظام کا پروردہ اور ایک اچھے عہدے پر متمکن تھا۔شادی کے بعد اس نے نہ صرف غیر عورتوں کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کیے بلکہ تہمینہ درانی کو اپنے بہیمانہ تشدد، ظلم و ستم، بربریت، تذلیل و تحقیر اور اذّیتوں کا شکار بنایا۔جس سے مصنفہ غم واندوہ اور بے تعلقی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی۔اس خودنوشت میں مصنفہ نے بڑی جرأت مندی، بے باکی اور بے تکلفی سے زندگی کی نم ناک کر دینے والی کہانی بیان کی ہے اور بقول سیمیں کرن ''تہمینہ درّانی نے انتہائی بے باکی سے اپنی نجی حیات کے گوشوں کو بڑی بڑی مہارت سے بے نقاب کیا ہے اور بغیر کسی رشتے کے چاہے وہ بہن ہو یا ان کی والدہ، کسی کو رعایت دیے بغیر اس طرح تحریر کیا ہے کہ معاشرتی برائیوں اور مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا۔'' سمیں کرن کا یہ پورا مضمون مبسوط، وقیع اور جامع ہے۔جس سے تہمینہ درّانی کی تحریر کردہ خودنوشت میں بیان کی گئی کرب آمیز زندگی سے آشنائی ہوتی ہے۔

''اندازِ بیان'' کے آخری باب میں تین مضامین کو جگہ دی گئی ہے جن میں خودنوشت سوانح حیات کے طرز نگارش، بیانیہ، تکنیک اور فن کے حوالے سے تحریروں کا اندراج ہے۔ ان میں ''خواتین کی خودنوشت کی طرز نگارش'' از شبانہ سلیم، ''اردو کی باغی خواتین کی آپ بیتی''

از محمد نوشاد عالم اور ''صوفیہ انجم تاج اور یادوں کی دستک'' از متفرق جیسے مضامین قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر مضمون میں مجموعی طور پر مختلف خواتین کی خودنوشتوں کے طرز نگارش، ذہنی وفنی بالیدگی، معنوی وسعت، حقیقت پسندی اور فکری فعلیت کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسی سطح پر ان کی خوبیوں اور خامیوں کو ابھارا گیا ہے۔ دوسرے مضمون میں ایسی خودنوشت نگاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے جنھوں نے روایت سے بغاوت کی اور خودنوشتیں تحریر فرمائیں۔ انھوں نے دنیاوی خوف، معاشرے کی پست ذہنیت، مردوں کی جارحیت و جبریت، سماجی نابرابری، خواتین پر عائد کی گئیں غیر آئینی مذہبی پابندیوں وغیرہ کا دلیرانہ اور مردانہ وار سامنا کیا اور اپنی شعوری قوت، جرأت مندی اور ہنرمندی کو بروئے کار لا کر زندگی کی داستان رقم کی۔ صوفیہ انجم تاج کی خودنوشت ''یادوں کی دستک'' پر شمس الرحمٰن فاروقی، رفعت سروش، سیفی سرونجی اور محمد متین ندوی کے تاثراتی اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ رسالے کے اخیر میں ''خوشبو محبتوں کی'' کے عنوان کے تحت قارئین کے خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔ غرض 294 صفحات پر مشتمل کتابی سلسلے کی یہ پہلی کڑی خودنوشت نگاری کے فن میں ایک اہم باب کا اضافہ ہے۔

# سوانحی کوائف

| | | |
|---|---|---|
| نام | : | غلام نبی کمار |
| والد کا نام | : | غلام احمد کمار |
| تاریخ پیدائش | : | 14 مارچ 1987 |
| جائے پیدائش | : | چرارشریف |
| مستقل سکونت | : | کمار محلہ، چرارشریف، ضلع بڈگام۔191112 (جموں وکشمیر) |
| انٹرمیڈیٹ | : | بائز ہائرسیکنڈری اسکول، چرارشریف (2004) |
| بی۔اے | : | گورنمنٹ امر سنگھ کالج، سرینگر (2007) |
| ایم۔اے (اردو) | : | یونی ورسٹی آف کشمیر (2010) |
| بی۔ایڈ | : | مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، سرینگر کیمپس، حیدرآباد (2011) |
| ایم۔ایڈ | : | مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، سرینگر کیمپس، حیدرآباد (2014) |
| ایم۔فل (اردو) | : | یونی ورسٹی آف دہلی، نئی دہلی (2016) |
| پی۔ایچ۔ڈی | : | یونی ورسٹی آف دہلی، نئی دہلی (جاری) |
| یو.جی.سی نیٹ | : | دسمبر 2014 |

یو.جی.سی نیٹ، جے۔آر۔ایف: جون/2015

جے کے سیٹ: 2016

## متوقع تصانیف

پورے قد کا آئینہ (کلیات زبیر رضوی)

اشاریہ سازی: فن اور روایت

اُردو غزل کی تنقید (عصری تناظر میں)

## مصروفیات

| | | |
|---|---|---|
| مدیر | : | سہ ماہی ''پنج آب'' مالیر کوٹلہ (پنجاب) |
| معاون مدیر | : | سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' دربھنگہ (بہار) |
| معاون مدیر | : | سہ ماہی ''تحقیق'' دربھنگہ (بہار) |
| ممبر ایڈوائزری بورڈ | : | ماہ نامہ ''سبق اردو'' الہ آباد |
| معاون مدیر | : | ادب نامہ روزنامہ لازوال (جموں) |
| چیف ایڈیٹر | : | اردو ورلڈ سرینگر (غیر سرکاری چینل) |

## وابستگی

صدر شیخ العالم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، جموں و کشمیر

جنرل سکریٹری مرکز عالمی اردو مجلس، دہلی

## اعزازات

مولانا الطاف حسین حالی ایوارڈ، المائٹی انٹرنیشنل سوسائٹی، مالیر کوٹلہ (پنجاب)

مظہر امام ایوارڈ، ساہتیہ کار ادبی سنگم، زیر اہتمام المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، دربھنگہ (بہار)

حماد احمد ادبی ایوارڈ، مدرسہ بنیادی تعلیم القرآن، سنبھل (یوپی)

تعمیل ارشاد ادبی ایوارڈ، روزنامہ تعمیل ارشاد، سرینگر (جموں و کشمیر)

---

پتہ:— 676، کمار محلہ چرار شریف، بڈگام۔191112 جموں و کشمیر

## رابطہ

Emial: kumarnabi.gnk@gmail.com, ghulamn93@gmail.com

Mobile: 7053562468 - 7006738304

☆☆☆

QADEEM-O-JADEED ADABIYAAT
(Tehqeeqi-wa-Tanqeedi Mazameen)
by
Gh. Nabi Kumar
غلام نبی کمار — وہ نوجوان ادیب ہیں جو اپنے نام کے ساتھ ہی ”چونکا“ دیتے ہیں — یعنی غلام نبی کمار — اسی طرح وہ اپنی تحریروں کے تعلق سے بھی پڑھنے والوں کو متوجہ کرتے ہیں۔
زیرِ مطالعہ کتاب جس میں اکیس مضامین شامل ہیں۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتاب کے نام کی تصدیق کرتے ہیں یعنی ”قدیم و جدید ادبیات“ — اس کتاب میں ایک طرف مومن شناسی، امیر خسرو اور داغ جیسے کلاسیکل شعرا پر مضامین ہیں تو دوسری جانب زبیر رضوی اور خواتین کی خودنوشتوں پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔
غلام نبی کمار کو غلام ادب بننا ہے — اور غلام کو اپنے آقا یا مالک کی بڑی خدمت کرنی پڑتی ہے تا کہ اس کا مالک یا آقا اس سے خوش ہو سکے —
مجھے یقین ہے کہ غلام نبی کمار جس انداز سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ دن دور نہیں جب ان کا مالک یا آقا یعنی ”اردو ادب“ انھیں اس کا بہتر صلہ دے گا اور وہ ادب میں اپنی معتبر جگہ بنا لیں گے۔
پروفیسر ارتضیٰ کریم
(صدر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، نئی دہلی)
ISBN 978-93-88736-56-5
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi, INDIA
دربھنگہ ٹائمز پبلیکیشنز
www.darbhangatimes.in
978-93-88736-56-5
www.ephbooks.com
Scanned by CamScanner